UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224000
UNIVERSAL
LIBRARY

جلد ۱۰ بابت آذر، دی، بہمن، اسفندار ۱۳۴۷ ف نمبر ۱ و ۲

نورس

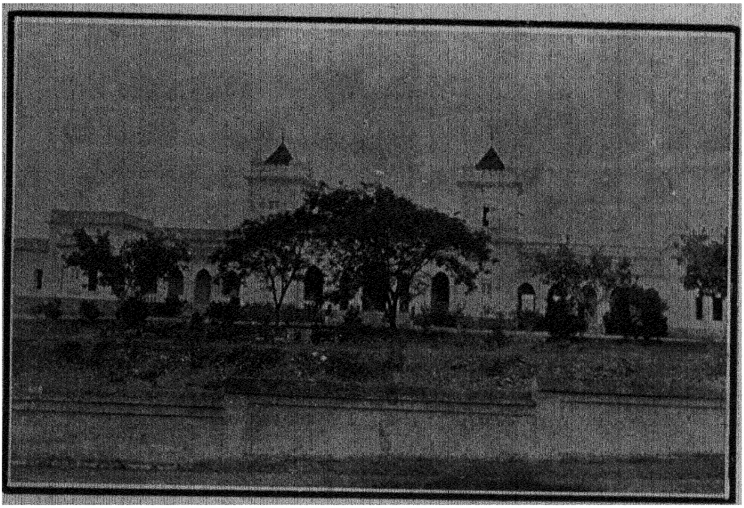

مجلس نورس

صدر:— جناب مولوی الحاج سید محی الدین صاحب، بی۔اے، بار ایٹ۔لا، پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد۔

نائب صدر و مدیر مسئول:— جناب مولوی غلام طیب صاحب، بی۔اے، ایل۔ٹی، لکچرار اردو عثمانیہ کالج اورنگ آباد۔

نمائندہ کالج و نائب مدیر:— عاقل علی خان صاحب، متعلم سال اول انٹرمیڈیٹ۔۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام مضمون	نام صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	شذرات	نائب مدیر نورس	۱
۲	سپاسنامہ کالج	جناب پرنسپل و معلمین و طلبار کالج	۲۳
۳	جواب سپاسنامہ	عالیجناب رائٹ آنریبل سر صدر اعظم بہادر دولت آصفیہ	۲۸
۴	ترانۂ استقبال	جناب مولوی غلام طیب صاحب مدیر نورس	۳۱
۵	نظم مدحیہ	جناب پنڈت ونشی دھر ودیا النکار صاحب پروفیسر ہندی جامعہ عثمانیہ	۳۳
۶	قصیدہ	جناب مولوی اقرار النبی صاحب مددگار معلم عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۳۴
۷	"	سید عبداللہ صاحب متعلم جماعت ہفتم عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۳۵
۸	اعتراف حق	جناب مولوی غلام طیب صاحب لکچرار اردو و مدیر نورس	۳۶
۹	نواب سعد جنگ بہادر مرحوم و مغفور	" " " " " " " "	۳۷
۱۰	حیدرآبادی نوجوانوں سے خطاب	جناب سید سکندر علی صاحب وجد ایچ۔ سی۔ ایس۔	۴۲
۱۱	تعاون باہمی	مرزا امین احمد بیگ صاحب سرخوش متعلم سال اول عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۴۴
۱۲	غزل	سید عزیز الحسن صاحب ضیا متعلم جماعت دہم عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۴۶
۱۳	تریا چرتر (بزمیہ)	جناب مولوی غلام طیب صاحب مدیر نورس و لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۷۴
۱۴	صبوحی الست (نظم)	مرزا امین احمد بیگ صاحب سرخوش متعلم سال اول عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۸۲
۱۵	غزل	محبوب احمد صاحب ہجر سابق متعلم عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۸۵
۱۶	اورنگ آباد کالج کے قدیم طلبا (ذیل)	جناب خان بہادر سید احمد صاحب مہتمم غارہائے اجنٹہ	۸۶
۱۷	غزل	جناب مدیر نورس	۹۱
۱۸	اورنگ آباد کالج آل انڈیا ٹورنامنٹ	" " "	۹۴
۱۹	تیراکی	جناب مسٹر رامچندر راؤ صاحب بی اے، ال ال۔ بی مددگار عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۹۴
۲۰	آلات تنفس	جناب مولوی عبدالصمد صاحب اہلکار دفتر عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۹۸
۲۱	فہرست انعامات و حاصل کنندگان الخ		۱۰۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

شذرات واخبار کلیّہ

از

(نائب مُدیر)

(۱)

بفضلِ خُدا ہمارا کلیہ اسٹاف اور طلبہ کے اشتراکِ عمل اور باہمی تعاون کے باعث ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے۔ سالِ حال کے نتائجِ امتحانات کا تذکرہ گذشتہ نمبر میں کر دیا گیا ہے۔ان امتیازی نتائج کی تفصیلات معلوم کر کے طلباء کی بڑی تعداد بغرضِ شرکت دور و دراز مقامات سے یہاں پہنچنے لگی۔ عمارت کی تنگی اور اسٹاف کی کمی کے باعث ہم داخلہ محدود کر دینے پر مجبور ہوئے اور بعض طلباء کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ اس قید و بند اور تجدید داخلہ کے باوجود مجموعی تعداد (۱۲۸۹) ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

طبقۂ یونیورسٹی (۱۴۵)، طبقۂ فوقانیہ (۵۵۰)، طبقۂ وسطانیہ (۵۸۰)

جب ہمارے سرکاری اقامت خانے پُر ہو گئے تو نو وارد طلبہ کی اقامت کا سوال درپیش ہوا مجبوراً دو نئے اقامت خانے یکے بعد دیگرے قائم کرنے پڑے:۔

ایک اقامت خانہ جامع مسجد میں قائم کیا گیا جسکے نگران اس کلیّہ کے ایک مددگار

جناب مولوی محمد یعقوب صاحب ہیں۔ ہمارے شفیق صدر کلیہ کی توجہ سے وہاں ضروری فرنیچر اور برقی روشنی کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ اسی طرح دوسرا اقامت خانہ ہندو طلبہ کیلئے صرافہ میں کھولا گیا ہے جہاں صرف ہندو طلبہ کی اقامت کا انتظام ہے اس کی نگرانی ہمارے کلیہ کے ایک مددگار مسٹر رنگناتھ راؤ کے ذمہ ہے۔ ان دونوں اقامت خانوں کی وجہ سے نو وارد طلبا کی پریشانی رفع ہوگئی اور انہیں امن وسکون کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول میں کوشش کرنے کا موقع ملا۔

(۲)

ناظرین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ ہمارے کلیہ کے طلبہ کو بعد فراغتِ تعلیم تلاشِ روزگار میں عموماً حیران و سرگرداں ہونا نہیں پڑتا۔ ادارہ کی طرف سے ان کی ممکنہ اعانت کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر محکمہ سرکارِ عالی کے جدید ملازمین کی فہرست میں ہمارے کلیہ کے طلبا کے نام نظر آتے ہیں۔ سال حال سب انسپکٹری پولیس کے مقابلہ میں ہمارے کلیہ کے حسب ذیل پانچ طلبا منتخب ہوئے:۔

سید محمد اصغر حسین صاحب رضوی (انٹرمیڈیٹ کامیاب) محمد عبدالرشید صاحب (ایچ ایس ایل سی۔ کامیاب) منظور احمد (میٹرک کامیاب) مسٹر حقیمبر داس (ایچ ایس ایل سی کامیاب) محمد حبیب الدین صاحب (میٹرک کامیاب)۔

ان کے علاوہ ایک اور طالب علم محمد عبدالرشید صاحب (انٹرمیڈیٹ کامیاب) جنگلات کی نائب امینی کے لئے منتخب ہوئے اور محکمہ کی فنی تعلیم حاصل کر رہے ہیں دفتر صوبہ داری اورنگ آباد میں بھی دو تین طلبہ لئے گئے ہیں۔ اور بعض دفتر کروڑ گیری میں کارگزار ہیں۔ دفتر صدر مہتمم تعمیرات میں دو طلبہ منصرنامہ اور ہنگامی سلسلوں پر

مامور کئے گئے ہیں۔

میں اسی سلسلہ میں مسٹر رامچندر راؤ گرجے کا جنہوں نے اس سال ہمارے کلیہ سے شریک ہو کر امتحان انٹرمیڈیٹ میں کامیابی حاصل کی ہے تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہہ ہمارے کلیہ کے محنتی اور شوقین طلبہ میں سے تھے۔ انٹرمیڈیٹ کامیاب ہونے کے بعد یہہ بی۔ اے کے امتحان داخلہ میں شریک ہوئے اور اس مقابلہ میں اول آئے۔ چنانچہ ۳۰ تیس روپیہ ماہانہ وظیفہ اُن کے نام جاری کردیا گیا ہے۔

میں متذکرہ بالا احباب کی خدمات میں اُن کی اِن کامیابیوں پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

(۴)

گیمس ہمارے ادارہ میں علمی اور ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ گیمس اور اسپورٹس کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے۔ شام کے وقت کھیلوں کے میدانوں میں خاصی چہل پہل نظر آتی ہے۔ سال گذشتہ کی طرح سالِ حال بھی بین الطبقاتی ٹورنمنٹ لیگ سسٹم پر کھلایا گیا۔ ان مقابلوں کے دوران میں میدانوں پر تماشائیوں اور کھلاڑیوں کا کافی ہجوم رہتا تھا شور و غل اور ہمت افزا نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ بالآخر فٹ بال شیلڈ طبقہ فوقانیہ (عثمانیہ) نے اور ہاکی شیلڈ اور والی بال کپ طبقہ فوقانیہ (مدراس) نے حاصل کیا۔ کرکٹ شیلڈ کا ابھی تصفیہ نہیں ہوا ہے۔ توقع ہے کہ یہ شیلڈ سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی طبقہ یونیورسٹی ہی کے حصہ میں آئیگی۔ اس ٹورنمنٹ کے انعامات ہمارے پرو وائس چانسلر

قاضی محمد حسین صاحب نے تقسیم فرماکر کھلاڑیوں کی ہمت افزائی فرمائی ۔

مکتوب انیس

یہ معلوم کرکے ناظرین خوش ہوں گے کہ ہمارے کرم فرما اور مخلص مولوی سید انیس الحق صاحب ایم ۔ اے ، ایل ۔ ایل ۔ بی جو بغرض تعلیم انگلستان گئے ہوئے ہیں، لیڈز (Leads) یونیورسٹی کے ڈپلوما اگزامینشن میں کامیاب ہو چکے ہیں اور اب ڈگری حاصل کرنے کے لئے "سرپھروں کی تعلیم" پر مقالہ لکھ رہے ہیں ۔

صاحب موصوف کو اس کلیہ سے خاص اُنس ہے ۔ یہ ایک عرصہ تک ہمارے اسٹاف کے ایک سرگرم رُکن رہے ۔ اور امید یکہ بعد فراغت تعلیم ہمیں پھر ان کی صحبتوں سے محظوظ ہونے کا موقع ملے گا ۔

ذیل میں صاحب معز کے ایک کرم نامہ کا اقتباس شائع کیا جاتا ہے جو اُنہوں نے جرمنی سے ہمارے صدر کلیہ کے نام ارسال کیا ہے :-

" میں تقریباً ایک مہینہ سفر میں رہا ۔ پیرس کی بین الاقوامی نمائش دیکھی ۔ دریائے سین کے کنارے روشنی کا منظر خوش نما تھا ۔ مشہور عمارتوں میں (Arch of Triumph) اور (Champse Elyse) مجھے بہت پسند آئیں ۔ پیرس کی مسجد بھی دیکھی اندر کا حصہ بہت بہتر ہے ۔ سوئیزرلینڈ کی جھیل اور اس کے اطراف کا منظر بہت اچھا ہے جرمنی میں دو ہفتے ٹھیرا ۔ ڈسلڈورف میں جرمنی کی نمائش بھی دیکھی ۔ یہ پیرس کی نمائش سے بہتر ہے ۔ جرمنی کی خواہش ہے کہ کسی دوسرے ملک کا محتاج نہ رہے ۔ چنانچہ پتھر کے کوئلہ سے پٹرول (Pine-wood) اور کا نچ سے روئی نکال کر کپڑے تیار کئے جاتے ہیں ۔ جرمن روئی کا نمونہ جو کانچ سے بنائی گئی ہے مرسل ہے ۔ ہر بالغ

جرمن کے لئے لیبر کیمپ میں چند مہینے کام کرنا ضروری ہے۔ یہاں امیر و غریب کو کھیتی کا کام کرنا ضروری ہے۔ یہاں آزادی کی ہوا نہیں لگی۔ خوراک کی کمی ہے سیاسی پابندیاں تکلیف دہ ہیں۔ لیکن اہالیان ملک ان سختیوں کو ملک کی بھلائی کی خاطر برداشت کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بہت خلیق اور ملنسار ہوتے ہیں۔ میں جرمن کا اس قدر مداح ہوگیا ہوں کہ لیڈز واپس آکر ایک جرمن خاندان میں مقیم ہوں اور جرمنی زبان سیکھ رہا ہوں۔"

۵

انجمن خواتین اورنگ آباد

یوں تو اورنگ آباد میں کئی انجمنیں اور ادارے قائم ہیں لیکن طبقۂ اناث میں کوئی ایسا منظم ادارہ موجود نہیں تھا جس کا مقصد اس طبقہ کی اصلاح ہو۔ اس کمی کو مسز برکت رائے کی کوششوں نے پورا کر دیا۔ مس نورالنسا بیگم پرنسپل گرلز ہائی اسکول اورنگ آباد نے بھی رانی صاحبہ برکت رائے کی تحریک کو روبہ عمل لانے میں اپنی کوششیں صرف کر دیں۔ ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں اس ادارہ کی تشکیل اور پھر تنظیم عمل میں آئی۔ اس انجمن کا مقصد عظیم طبقۂ اُناث کی اصلاح اور اسکی ترقی کے مختلف مفید ذرائع کا بہم پہنچانا ہے۔ انجمن کی سالانہ رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رانی برکت رائے کی قیادت میں اس ادارہ نے ایک سال کی قلیل مدت میں کس قدر قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔

مسز برکت رائے جو اس انجمن کی صدر ہیں مختلف خوبیوں کی حامل ہیں۔ گذشتہ نمبر میں ہفتہ حفظانِ صحت کی رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کے ملاحظہ سے

ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رانی صاحبہ موصوفہ جو اس تحریک اور نمائش کی بانی ہیں رفاہی کاموں میں کس قدر دلچسپی رکھتی ہیں۔

اس روشن خیال اور موقع شناس خاتون نے لیڈی ٹاسکر کی تشریف آوری سے فائدہ اٹھایا اور انجمن خواتین کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے معزز مہمان سے درخواست کی جو بنظر استحسان دیکھی گئی۔ بتاریخ ۲۳ مہر ۱۳۴۶ف مطابق ۲۹ اگست ۱۹۳۷ء بوقت ساڑھے دس ساعت یہ جلسہ ایوانِ بلدیہ میں منعقد ہوا۔ مسز برکت رائے نے اپنا استقبالیہ خطبہ سُنایا جسمیں انجمن کی اہمیت اور کارگزاری کی تفصیل بیان کی گئی۔ لیڈی ٹاسکر نے اپنے خطبۂ صدارت میں اورنگ آباد کے اس اصلاحی اقدام اور طبقۂ اناث و ذکور کے اس متبرک تحریک میں اشتراک عمل پر اظہار مسرت فرماتے ہوئے خواتین اورنگ آباد کو آل انڈیا خواتین کانفرنس ناگپور میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

اس موقع پر ہمارے کلیہ کے لکچرر صاحبان، مسٹر جان بھگتل اور مسٹر محمد ابراہیم نے جو اس انجمن کے مشاورتی مجلس کے ممبر ہیں، تقریریں بزبان انگریزی اور اُردو کیں جو بڑے شوق سے سنی گئیں۔ اُسی روز شام میں منجانب انجمن ایوانِ بلدیہ میں تفریحی پروگرام تھا جسمیں ہمارے کالج کے لڑکوں نے بھی دو ڈرامے بزبانِ انگریزی اور اُردو اسٹیج کئے اور ایوب احمد متعلم سال اول، سید عبداللہ و مہیت رائے متعلمین ہفتم نے اپنی عمدہ اداکاری کی داد حاصل کی چنانچہ منجانب انجمن ان کو تمغہ جات بھی عطا ہوئے۔

سالانہ کانفرس کے سلسلہ میں مسز برکت رائے نے نمائش کا بھی انتظام

کیا تھا جو مولوی سید معزالدین صاحب پرنسپل مدرسہ صنعت و حرفت کی خوش اسلوبی سے مقبرہ رابعۂ دورانی میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ترتیب دیگئی تھی۔ اس کی رسم افتتاح ۲۳ ر مہر ۱۳۴۶ف کی شام میں مسز برکت رائے ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

اس انجمن کا جلسہ تقسیم انعامات بتاریخ ۲۶ ر مہر ۱۳۴۶ف بوقت چھ بجے شام ایوانِ بلدیہ میں منعقد ہوا۔ اس موقعہ پر ہمارے لائق صدر کلیہ نے تعلیم نسوان پر دلپذیر تقریر فرمائی۔ المختصر یہ اجلاس اورنگ آباد میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور اگر کارکنانِ انجمن کی دلچسپیاں اسی طرح وابستہ رہیں تو توقع ہے کہ یہ انجمن بہت مفید ثابت ہوگی۔

(۶)

جلسہ تقسیم انعامات ۱۳۴۵ف

فصلے جلسہ تقسیم انعاماتِ تعلیمی کی صدارت کیلئے کسی ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے جو علم دوست اور ادب نواز ہو۔ ہر سال ہمارے ہاں اس جلسہ کی صدارت بفضلِ خدا کسی نہ کسی ایسی ہی شخصیت نے قبول کی۔ سالِ حال کے جلسہ کی صدارت کے لئے ہمارے صدر کلیہ کی نظرِ انتخاب اِدھر اُدھر بھٹک کر ہمارے کرم فرما عالیجناب مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار پر جم گئی۔ صاحبِ موصوف کی ہستی علمی اور ادبی حلقوں میں غیر معروف نہیں۔ ہر اس ادارہ سے جو علمی، ادبی یا فنی خدمت کرتا ہو والاجناب کی بیحد ہمدردی پائی گئی ہے جو آپ کی علم دوستی، ادب نوازی اور فن پروری کا ثبوت ہے۔ ہمارے کلیہ سے جناب والا کی کافی ہمدردی کا منظاہرہ مختلف مواقع پر ہوتا رہا ہے۔ ہم صاحبِ ممدوح

کے شکر گزار ہیں کہ والا جناب نے اس جلسہ کی صدارت کو قبول فرما کر طلبار کی ہمت افزائی فرمائی۔

جلسہ تقسیم انعامات بابتہ ۱۳۴۵ف بتاریخ ۱۰ مہر ۱۳۴۶ف بوقت ۵ ساعت شام منعقد ہوا جسمیں تقریباً تمام عہدہ داران مقامی اور معززین شہر مدعو تھے۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد ہمارے ہر دلعزیز صدر کلیہ نے کلیہ کی تدریجی ترقی اور نتائج کی تفصیل اپنی دلپذیر تقریر میں پیش ناظرین فرمایا۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے انعامات تقسیم کیئے۔ اور صدارتی تقریر میں جامعہ عثمانیہ کی کارگذاری اور علمی و تحقیقی سرگرمی پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ہمارے کلیہ کے اقامت خانوں کے طرز عمل کے متعلق اظہار اطمینان فرماتے ہوئے ہمارے فرشتہ خصلت صدر کی شخصیت اور ستودہ صفات کو روشن کیا اور طالب علموں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وہ صدر کلیہ کی زندگی کی تقلید کریں کیونکہ ان میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک کامیاب انسان میں ہونی چاہئیں۔ صدارتی تقریر کے بعد قومی ترانہ پڑھا گیا اور دعائے سلامتی عمر و اقبال بندگان عالی و متعالی مدظلہ العالی و شہزادگان و شہزادیان فرخندہ فال پر یہ جلسہ بوقت مغرب تقریباً ۷ ساعت شام نہایت کامیابی کیساتھ ختم ہوا۔

(۷)

سالگرہ مبارک

رعیت شاد، ملک آباد اور آزاد ہر ملّت
اداحق کر دیا شاہِ دکن نے حکمرانی کا

یکم رجب کا مبارک دن نکلا ۔ وفا کیشانِ سلطنت کی خوشیوں کا پیمانہ لبریز ہوگیا مسرت خیز نعرے بلند ہونے لگے ۔ جوق در جوق فدائیانِ دولتِ آصفی میدانِ قلعہ ارک میں جمع ہونے لگے ۔ عہدہ دارانِ مقامی اور معززینِ شہر بھی آٹھ بجے تک یکے بعد دیگرے میدان میں جمع ہوگئے ۔ پولیس نے پرچم آصفی کو سلامی دی توپیں سر کی گئیں ۔ ہمارے کلیہ کے لکچرار مولنا محمد صابر صاحب نے سلامتی عمر و اقبالِ بندگانِ عالی و شہزادگانِ بلند اقبال و شہزادیانِ فرخندہ فال کے لئے دستِ دعا اٹھایا ۔ تمام حاضرین نے بہ خلوصِ دل بارگاہِ رب العزت میں دعا فرمائی اور یہ مجمع برخاست ہوا ۔

شام میں میدانِ کالج میں اجتماعِ اسکاؤٹس ہوا ۔ پرچم آصفی کو سلامی دی گئی ۔ اسکاؤٹس خوش الحانی کے ساتھ قومی ترانے گاتے رہے ۔ الغرض وفا کیشانِ دولتِ آصفی نے مختلف طریقوں سے اظہارِ عقیدت کیا ۔ اس مجلس میں نہ صرف اسٹافِ کلیہ شریک تھا بلکہ مولوی محمد عثمان صاحب صدر مہتمم تعلیمات، مسٹر ہوبگلے سپرنٹنڈنٹ مدرسہ تعلیم المعلمین اور دیگر متعلقہ حضرات نے بھی حصہ لیا تھا ۔ یہ پُرشور لیکن دلخوش کن پروگرام تقریباً چھ بجے ختم ہوا ۔ اور اسکاؤٹ ٹروپس صف بستہ قومی ترانے گاتے ہوئے اپنے مرکز کی طرف روانہ ہوئے ۔ شام ہوئی شہر میں چراغاں ہوا ۔

خاصی چہل پہل نظر آنے لگی۔ ہمارے اقامت خانوں میں جشن سالگرہ منایا گیا۔ اقامت خانہ یونیورسٹی میں اس موقعہ پر ایک عشائیہ ترتیب دیا گیا بعد مغرب طلباء نے ایک اجلاس، زیر صدارت جناب صدر صاحب کلیہ منعقد کیا۔ برکاتِ دورِ عثمانی پر تقریریں اور نظمیں پڑھی گئیں۔ محمد علی خاں صاحب بھوپالی متعلم سال دوم نے سوانح بندگانِ عالی نہایت دلپذیر انداز میں بیان کئے۔ آخر میں صدر جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر میں شاہِ ذیجاہ کی سادگی، انصاف پسندی، مذہبی رواداری اور مختلف قابلِ قدر خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کارہائے نمایان دورِ عثمانی کا ذکر کیا۔

بہ تقریب سالگرہ مبارک اقامت خانہ جامع مسجد میں برقی روشنی کی رسم افتتاح ڈاکٹر محمد اللہ خاں صاحب ناظم عدالت صوبہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ بعد نماز مغرب یہاں نئی روشنی میں ایک جلسہ ترتیب دیا گیا۔ تقریریں ہوئیں، جن میں برکاتِ دورِ عثمانی اور ذاتِ شاہانہ کے محاسن پر روشنی ڈالی گئی۔ جنابِ صدر کلیہ بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔

اقامت خانہ فوقانیہ کے طلبا نے بھی اپنے ہر دلعزیز اور علم پرور بادشاہ کی سالگرہ کے موقعہ پر جشن منایا۔ دن میں اسپورٹس اور کھیلوں کے مظاہرے ہوئے۔ تمام مقیمانِ اقامت خانہ نے اس دلچسپی میں حصہ لیا۔ شب میں موسیقی تقاریر اور عشائیہ کا انتظام تھا۔ چنانچہ بعد نماز مغرب پروگرام سوئے عمل لایا گیا۔ دورِ عثمانی کی اصلاحات اور برکات پر تقریریں ہوئیں۔ وقتاً فوقتاً موسیقی سے شرکائے جلسہ کو محظوظ کیا جاتا رہا۔ بعد ازیں عشائیہ تناول کیا گیا۔ اسی دوران میں ہمارے لایق صدر کلیہ نے جلسہ میں شرکت کرکے طلباء کی خوشیوں میں حصہ لیا۔ اور آخر میں انعاماتِ اسپورٹس تقسیم کرنے کے بعد ایک بلیغ تقریر میں صفاتِ شاہانہ بیان فرمائے اور دعائے سلامتی سلطان العلوم پر

اپنی تقریر ختم کی۔ اس کے بعد جلسہ کا منظم پروگرام ختم ہوگیا۔

اسی سلسلہ میں ہندو اقامت خانہ صرافہ کے طلبار نے بھی اپنے بادشاہ ذیجاہ کی سالگرہ کی خوشی منائی۔ یہاں بھی عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا۔ بعد تناول عشائیہ دلچسپ پروگرام موسیقی شروع ہوا جسکا سلسلہ تقریباً نصف شب تک رہا۔ دعائے سلامتی بندگانعالی پر جلسہ کی طویل کاروائی ختم ہوئی۔ جناب صدر صاحب کلیہ یہاں آخر میں شریک ہوئے۔

المختصر یوم سالگرہ مبارک رعایان سلطنتِ آصفی اور فرزندانِ مادرِ جامعہ عثمانیہ کے لئے یوم عید سے کسی طرح کم نہیں۔

ہے یہی شاہِ دکن کی گلہ بانی کی دلیل ∴ گلہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا

(۸)

عالی جناب نائبِ معین امیر جامعہ کا معائنہ

ہمارے لائق نائب معین امیر جامعہ جناب قاضی محمد حسین صاحب

بغرض معائنہ بتاریخ ۸ر آبان ۱۳۴۶ف تشریف لائے۔ صاحب معزز اپنی مصروفیات اور مشاغل کے باعث یہاں زیادہ قیام نہ کر سکے اور نہ ہمارے کلیہ کی علمی ادبی اور تفریحی مشاغل کی تفصیلات میں سے گزر سکے تاہم اُن کی نکتہ بیں نظروں نے سرسری معائنہ میں ہی ان تمام چیزوں کا مشاہدہ کر لیا۔

۸ر آبان کو ایک بجے تک صاحب ممدوح نے کلیہ کی درس و تدریس کو ملاحظہ فرمایا۔ اور دوپہر میں تین بجے لکچرر صاحبان کو مخاطب فرما کر ایک تقریر کی۔ اس کے بعد ہال میں طلبائے طبقۂ جامعہ کو کچھ ہدایات دیں۔ دورانِ تقریر میں فاضل مقرر نے فرمایا کہ "اخلاق و عادات کو بہتر بناؤ کیونکہ زندگی عادات اور اخلاق ہی کا نام ہے"۔ طلبار کو چاہیئے کہ وہ لکچرار کی تقریر کے مختصر نوٹس بطور

یاد داشت لکھ لیا کریں۔ کتب خانہ کو اپنی حقیقی درس گاہ متصور کر کے اپنے معلومات عامہ میں اضافہ کریں اور حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ صحتِ جسمانی کا خیال بھی پیش نظر رکھیں۔"

اس تقریر کے بعد ہمارے صدر کلیہ نے فاضل مقرر کا شکریہ ادا فرماتے ہوئے فرمایا کہ باوجود کمیٔ موازنہ اس کلیہ میں کھیلوں کا خاص اہتمام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کلیّہ کی ٹیمیں مقامی مقابلوں کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی نمایاں کامیابی حاصل کرتی رہی ہیں۔

شام میں جمخانہ گراؤنڈ میں بین الطبقاتی ٹورنمنٹ کا فٹ بال فائنل میچ مقرر تھا لیکن بارش کی وجہ سے یہ کھیل نہ ہو سکا۔ ہمارے صدر کلیہ کی جانب سے قاضی صاحب کے اعزاز میں سٹی کلب میں ایک عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں ممبران سٹی کلب اور اسٹاف کلب کلیہ ہٰذہ مدعو تھے۔ جناب قاضی صاحب نے عصرانہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مولوی محمد ابراہیم صاحب معتمد عمومی گیمس کی درخواست پر بین الطبقاتی ٹورنمنٹ کے انعامات تقسیم فرمائے۔ بعد تقسیم انعامات معتمدِ عمومی گیمس نے ایک تقریر کی۔ لائق مقرر نے اپنی دلچسپ تقریر میں فرمایا کہ ایسے اداروں سے پیشہ ور کھلاڑی پیدا کئے جائیں اور ایسی پود کی تربیت کے لئے مساعد حالات اور اسباب مہیا کئے جائیں کیونکہ یہ ایک معزز پیشہ ہے۔ بعد ازیں صدرِ جلسہ نے اپنی تقریر میں طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں علمی اور ادبی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں بھی حصّہ لینا چاہیئے۔ تاکہ جس مقصد کے لئے مدارس اور علمی اداروں میں کھیلوں کو اہمیت دی گئی ہے، وہ پورا ہو سکے اور اس طرح اُن کی صحت جسمانی و دماغی نشو ونما میں ممد و معاون ہو۔

اس جلسہ کے بعد ہمارے معزز مہمان نے اقامت خانہ یونیورسٹی اور جامع مسجد اور اقامت خانہ صرافہ کا معائنہ فرمایا۔ اور ۸ بجے شب عشائیہ پر جو منجانب اسٹاف کلب کالج میں ترتیب دیا گیا تھا، تشریف لائے۔ اس عشائیہ میں چند عہدہ داران مقامی بھی مدعو تھے۔ بعد تناولِ طعام اعلیٰ حضرت بندگان عالی ومتعالی مدظلہ العالی کا جامِ صحت نوش کیا گیا۔

اس موقعہ پر میں مولوی وہاج الدین صاحب تسیم کا جو پہلے ہمارے کلیہ کے ہر دلعزیز لکچرر تھے۔ اور آج کل نائب معین امیر جامعہ کے پرسنل اسسٹنٹ ہیں تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ صاحب موصوف کی ذات محتاج تعارف نہیں آپ ایک شفیق اُستاد اور پُرخلوص دوست کی جملہ خصوصیات کے حامل ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے بھی آپ قدر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اورنگ آباد کی بزم شعراء میں آپ کی وجہ سے ایک خاص شگفتگی پائی جاتی تھی اور اب بھی جب کبھی آپ کی تشریف آوری کی خبر شعراء میں پھیل جاتی ہے تو دیکھا گیا ہے کہ محبانِ سخن اور شائقین شعر چشم براہ رہتے ہیں۔ المختصر بزم شعرائے اورنگ آباد تسیم صاحب کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

(۹)

عالی جناب ناظم صاحب تعلیمات کا دورہ

بتاریخ ۲۵ آبان ۱۳۴۶ف

جناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات ملک سرکارِ عالی نے سرسری طور پر اس کلیہ کا معائنہ فرمایا۔ تیراکی کا حوض اور کھیلوں کے میدان بھی ملاحظہ فرمائے۔

جناب ناظم صاحب تعلیمات پہلے ہائی اسکول اورنگ آباد کے پرنسپل

تھے۔ زمانہ صدارتِ ہائی اسکول کے چند مددگار اور شاگرد جنہیں ہمارے اسٹاف
کلب کے بعض اراکین بھی شامل ہیں بتاریخ ۳۰ رآبان ۱۳۴۶ف سنہ بوقت ۱۱ ساعت
صبح اپنے قدیم صدر اور استاد سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لئے جمع
ہوئے۔ جناب ناظم صاحب نے از راہِ شاگرد نوازی و ماتحت پروری اِن
حضرات کو ملاقات کا وقت دیا۔ اس موقع پر جناب ناظم صاحب کو پھول
پہنائے گئے۔ اور اِن سب حضرات کے ساتھ فوٹو لیا گیا۔ اُسی دن
۵۔۴۔ کی ٹرین سے جناب ناظم صاحب کی روانگی عمل میں آئی۔

(۱۰)

جلسۂ میلاد النبی صلعم و جشن معراج مبارک صلعم

مُنعقدہ بتاریخ ۲۶ رجب ۱۳۵۶ھ م ۲۷ آبان ۱۳۴۶ف سنہ

شنبہ کا دن تھا۔ نہایت سُہانی اور دلکش فضا تھی۔ بالخصوص کالج میں
ایک خاص چہل پہل تھی۔ ہال پھولوں سے نہایت لطیف انداز میں آراستہ
کیا گیا تھا۔ آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی صلعم آویزاں کی گئی تھیں۔ باب مداخلہ
کے قریب ہی مقررین کے لئے اسٹیج بنایا گیا تھا۔ پھولوں کی عطر بیزی اور خوشبودار
گوند کے دود سے فضا مہک رہی تھی۔ بعد نمازِ عصر قرآن خوانی اور درود خوانی
شروع ہوئی۔ اور مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعد نمازِ مغرب جلسہ کی کاروائی
شروع ہوئی۔ قرارت اور حمد و نعت کے بعد ہمارے لائق صدر نے ایک پُر مغز
تقریر فرمائی۔ نہایت دلچسپ پیرایہ میں سیرت نبوی صلعم کے محاسن بیان فرمائے

اور زمانۂ حاضرہ میں مذہبی لاپروائی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ احکام مذہب وشرع سے کنارہ کش ہوکر کوئی بھی دنیا میں جائز کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ مذہب اسلام کی امن پسندی، رواداری اور صداقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ:"مسلمان کبھی نہیں مرتا بلکہ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے؛ ہم لوگ اپنی اقتصادی پستی سے خائف ہیں۔ حالانکہ رب العزت نے وعدہ کیا ہے کہ وہ رازق المخلوق ہے اُس کے بندوں کو اس کا کوئی فکر نہ ہو اور وہ عملِ صالح سے اپنی عاقبت سُدھاریں۔ لیکن ہم اقتصادیات کی گتھیوں میں اُلجھ کر عاقبت کی فکر کو نذرِ طاقِ نسیاں کر دیتے ہیں۔"

دوسرے مقرر محمد علی خانصاحب متعلم سالِ دوم تھے۔ انہوں نے حالاتِ زندگی رسالت مآب صلعم بیان کرتے ہوئے محاسن سیرت پر روشنی ڈالی۔ بعدہٗ حافظ مولوی محمد نعمان صاحب ہاشمی مددگار کلیہ ہٰذا نے ایک بلیغ تقریر فرمائی۔ اور واضح کیا کہ انسانوں کو درجۂ نبوت دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی، نبی کے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں۔ اور تعلیمات نبوی صلعم سے مراد کیا ہے۔ ان توضیحات کی روشنی میں ذاتِ محمدی صلعم کو سید الانبیاء۔ اور خاتم النبیین ثابت کیا۔ امانت و دیانتِ محمدی کے مختلف واقعات بیان کر کے اس حقیقت کو روشن کیا۔ کہ نبی آخر الزماں صلعم نہایت امین اور دیانتدار تھے۔ دوست ہی نہیں بلکہ دشمن بھی آپ کی امانداری کے معترف تھے۔ جسکی نہایت نادر مثال یہ ہے کہ دشمنوں نے مکان کا محاصرہ کرلیا ہے اور یہ تہیہ کر کے آئے ہیں کہ ہمیشہ کے لئے اس جھگڑے ہی کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن اسوقت سید الانبیاء انہی محاصرین کی امانتیں حضرت علیؓ کے حوالے کر رہے تھے۔

چوتھی تقریر مولانا محمد صابر صاحب لکچرر کلیہ ہذا کی ہوئی۔ مولانا موصوف نے واقعۂ معراج کو نہایت فصاحت سے عام فہم انداز میں بیان فرمایا۔ شق صدر، براق اور سدرۃ المنتہیٰ کے استعارات کی توضیح فرماتے ہوئے فلسفۂ معراج کو سمجھایا۔ اس کے بعد مولوی نذر علی صاحب دَرْدؔ کاکوروی اور مولوی عزیز الرحمٰن صاحب لکچرر کلیّہ ہذہ نے صلوٰۃ وسلام پڑھا۔ اور آخر میں مولانا محمد صابر صاحب نے ترقی عمر اقبالِ حضرتِ بندگان عالی وشہزادگانِ بلند اقبال وشہزادیانِ فرخندہ فال کے لئے دعا کی۔

تقاریر کے علاوہ نعت خوانی بھی وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔ مولوی عبدالخالق صاحب اور مولوی مرزا ولایت علی بیگ صاحب مددگارانِ کلیّہ ہذہ نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں پسندیدہ نعتیہ نظمیں سنائیں۔ اِن کے علاوہ بدرالدین اور ملک احمد متعلمین کلیّہ نے نعتیں سناکر حاضرین کو محظوظ کیا۔

شرکائے جلسہ کی تعداد تقریباً (۵۰۰) پانسو تھی جنمیں غیر مسلم حضرات بھی تھے۔ حاضرین کی تواضع شیرینی سے کی گئی۔ المختصر یہ جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ نو بجنے کے بعد ختم ہوا۔

اس جلسہ میں ہمارے غیر مسلم بھائیوں کی شرکت سے ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ وہ زمانہ انشاء اللہ تعالیٰ قریب ہے کہ ہمارے اخبارات کو ہندو مسلم فساد یا تصادم کی کوئی سرخی قائم کرنیکا موقع ہی نہ ملے ؎

(۱۱)

تشریف آوری ہز اکسیلنسی صدر اعظم بہادر مدظلہ بالقابہٗ

ایک عرصہ سے سر صدر اعظم بہادر کی تشریف آوری کی خبریں گرم تھیں۔ نہایت شد و مد سے انتظامات ہو رہے تھے۔ بہ عالم صد انتظار، دو تین دفعہ کے التوا کے بعد آخری مکتوب حیدری معہ نظام اوقات پہنچا کہ تاریخ تشریف آوری ۹ر آذر ۱۳۴۷ف مقرر ہے۔ عقیدت مندوں اور نیاز کیشوں کے چہرے خوشی سے تمتما اُٹھے۔

۹ر آذر، پنجشنبہ کی صبح ہوئی۔ نیر اعظم نے اپنی سنہری کرنوں کی تحریر میں شائقین حیدری کو دلخوش کن پیغام دکھایا۔ خوشی خوشی یہ حضرات ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ ۸½ بجے تک تمام عہدہ داران مقامی کا اجتماع ہوگیا حسب الحکم صدر کلیہ ایک وفد منجانب کلیہ ہذہ چکل تھانہ تک بغرض استقبال گیا ہوا تھا۔ وہاں اس وفد نے سر اکبر کو پھول پہنائے۔

۹ بج کر ۲۰ منٹ پر گاڑی اورنگ آباد کے پلیٹ فارم پر پہنچی۔ سر صدر اعظم بہادر رونق افروز ہوئے۔ اورنگ آباد اسکاؤٹس الیوسی ایشن کے جملہ ٹروپس نے سلامی دی، کالج ٹروپ نے بینڈ سے خیر مقدم کیا۔ جناب مولوی غلام احمد خانصاحب صوبہ دار اورنگ آباد نے عہدہ داران اورنگ آباد کا تعارف کرایا۔ بعد ازیں اسٹیشن کے باہر تشریف لانے پر جمعیت پولیس نے سلامی دی۔ بعدہٗ چند عہدہ داران مقامی کی معیت میں رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری راہئی ہٹن ہوئے۔ ہٹن میں

آثارِ قدیمہ کی تحقیر، درگاہوں، مندر اور پگڑی کے کارخانوں کا معائنہ فرمایا! اور تقریباً ۱۲ ½ بجے وہاں سے روانگی عمل میں آئی — اورنگ آباد پہنچکر صدر اعظم بہادر نے فرحت منزل میں صوبیدار صاحب کے ساتھ لنچ تناول فرمایا۔ اور تقریباً ۲ بجے راہیٔ اجنٹہ ہوئے۔

بتاریخ ۱۱ر آذر بروز دوشنبہ بوقت ۱۲ ½ ساعت دن اجنٹہ سے مراجعت عمل میں آئی۔ ۴ ½ بجے بعزمِ ٹاؤن ہال اقامت گاہ سے روانگی عمل میں آئی۔ چوک میں سوداگروں اور دیگر تجار نے بہ نظرِ عقیدت مندی پھول پہنائے۔ بازار سے ہوتے ہوئے تقریباً پانچ بجے موٹر ٹاؤن ہال پہنچی۔ یہاں لوگ چشم براہ تھے۔ موٹر سے اُترتے ہی عکس لیا گیا۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد پھول پہنائے گئے۔ بعدہٗ مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار نے ایک مختصر تقریر فرمائی جسمیں معزز صدرِ جلسہ کے کارناموں اور خدمات کا ذکر کیا گیا اور صاحب موصوف کی اعلیٰ شخصیت سے بحث کی گئی۔ اس کے بعد منجانب وکلاء، مجلسِ بلدیہ اور مارکٹ کمیٹی سپاسنامے پڑھے گئے جن کا جواب سر صدرِ اعظم بہادر نے آخر میں دیا۔ مجلسِ بلدیہ نے سپاسنامے میں کلیہ اورنگ آباد کے متعلق حسب ذیل تحریک پیش کی۔

"جامعہ عثمانیہ کے قیام نے تحصیل علم کا جو تموج ملک میں بالخصوص اورنگ آباد میں پیدا کیا ہے۔ اور جس کا بین ثبوت کلیۂ اورنگ آباد کی روزافزوں تعداد میں ملتا ہے، اس امر کا متقاضی ہے کہ کلیۂ اورنگ آباد کو درجہ اوّل کا کالج بنادیا جائے۔ تاکہ وہ کثیر التعداد طلبا جو عدم استطاعت کے باعث حیدرآباد

کے مصارف برداشت نہیں کرسکتے، اورنگ آباد کالج کی غریب پرور فضامیں تشنگیٔ علم بجھا سکیں۔"

سرصدرِ اعظم بہادر نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ "جیسا کہ آپ حضرات واقف ہیں۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی کی باگ آج کل میرے فاضل رفیق کار نواب مہدی یار جنگ جیسے پختہ کار ماہر تعلیم کے ہاتھ میں ہے جنکی ترقی پسند تجاویز سے مجھے یقین ہے کہ آپ کا صوبہ بھی مستفید ہوگا۔ مولوی سید محی الدین جیسے پرخلوص، قابل اور نیک نیت عہدہ دار کا آپ کے کالج کا صدر ہونا اس کا ضامن ہے کہ آپ کی تعلیمی ضروریات کماحقہٗ پوری ہونگی۔"

اُدھر ایوانِ بلدیہ میں سپاسنامے پڑھے جارہے تھے۔ اور اِدھر کالج میں انتظامات مکمل تھے۔ بلحاظ نظام الاوقات پانچ بجے یہاں کا جلسہ شروع ہونا چاہیئے تھا لیکن ایوانِ بلدیہ کی کارروائی میں تعویق ہوئی۔ نونہالانِ مادرِ کلیہ انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہے تھے۔ لیکن اشتیاقِ دیدارِ حیدری نے یہ انتظار اُن کے لئے قابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ یہ مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔

المختصر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ٹاؤن ہال کا اجلاس برخاست ہوا۔ مہمانوں کی موٹروں کا تانتا بندھا۔ طلبائے کلیہ جو بغرضِ استقبال حیدری سڑک سے لے کر باب الداخلہ تک صف بستہ کھڑے کئے گئے تھے، تیار ہوگئے۔ سرصدرِ اعظم کی موٹر پہنچی۔ نونہالوں نے نعرے بلند کئے۔ اسکاؤٹس نے

سلامی دی ۔ اقامت خانہ کے طلبا نے جناب مولوی غلام طیب صاحب کا منظوم ترانہ خوش الحانی سے گاتے ہوئے معزز مہمان کو باب الداخلہ تک پہنچایا۔

تقریباً پونے چھ بجے ہزاکسلینسی ہال میں داخل ہوئے۔ تالیوں کی گونج میں ہمارے صدرِ کلیہ نے صدرِ اعظم بہادر کو زریں ہار پہنایا۔ طلبائے کلیہ نے خوش آمدید گایا۔ اس کے بعد جناب قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں صدر حلبہ کے زریں کارناموں اور اعلیٰ شخصیت پر روشنی ڈالی۔ اور جناب صدر صاحب کلیہ ہذہ کی کارگزاری کی تعریف کی۔ اسکے بعد لائق صدرِ کلیہ نے سپاسنامہ منجانب اسٹاف وطلبہ پڑھ کر سنایا (جو اسی نمبر میں علیحدہ شائع کیا جا رہا ہے)۔ اور نقرئی کیاسکٹ میں پیش کیا۔ ہزاکسلینسی نے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے اُن مطالبات کا، جن کا ذکر سپاسنامے میں کیا گیا ہے، بعجلتِ ممکنہ انتظام کر دینے کا وعدہ فرمایا۔ بعد ازیں ہمارے صدر کلیہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جناب ناظم صاحب تعلیمات اور مولوی ہارون خاں صاحب شروانی کے تار اور پیغام پڑھے۔ اور سید سکندر علی صاحب وجد کے خط کے اقتباسات پیش کئے۔

تقریباً ساڑھے چھ بجے چانسلر جامعہ عثمانیہ سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر بالائی عمارت کی رسم افتتاح ادا فرمانے کے لئے اوپر تشریف لے گئے اور رسم افتتاح اپنے مبارک ہاتھوں سے انجام دیکر اسٹاف اور طلبا کی عزت افزائی فرمائی۔ اور اُس پُر تکلف عصرانہ میں جو اُس نئی عمارت میں ترتیب دیا گیا تھا شرکت فرما کر ممنون کیا۔ بہ دورانِ عصرانہ پنڈت ونشی دھر، مولوی غلام طیب صاحب

اور سید عبداللہ طالب علم نے قصائد سُنائے۔ تقریباً آٹھ بجے یہ دلچسپ صحبت برخاست ہوئی اور معزز مہمانِ کلیہ نعرہ ہائے "سر اکبر حیدری زندہ باد" میں روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل اعلیحضرت کے چیرز کی تجویز ہوئی اور سب نے اسمیں حصّہ لیا۔ اس موقعہ پر جملہ عہدہ دارانِ مقامی، معززینِ شہر و نیز عہدہ دارانِ حیدرآباد بھی مدعو تھے، جنمیں قابلِ ذکر ہمارے نائب معین امیر جامعہ قاضی مولوی محمد حسین صاحب، مولوی حمید احمد صاحب انصاری مسجل جامعہ عثمانیہ، مولوی عارف الدین صاحب ناظم تعمیرات، خطیب محمود حسین صاحب ناظم برقیات اضلاع، مولوی وہاج الدین صاحب شمیم اور پنڈت ونشی دھر صاحب وغیرہ ہیں

سر صدرِ اعظم بہادر کالج سے روانہ ہوکر قوت خانہ برقی اور نوکھنڈہ مبارک سے ہوتے ہوئے خلدآباد چلے گئے۔ جہاں اُن کی جانب سے ایک عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا۔ جہاں عہدہ داروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ جن میں ہمارے صدرِ کلیہ بھی تھے۔

بتاریخ ۱۲ر آذر صبح سر صدرِ اعظم بہادر نے ایلورہ کا معائنہ فرمایا۔ بعدہٗ خلدآباد اور دولت آباد کی درگاہوں پر حاضری دیتے ہوئے تقریباً دو بجے ہز اکسیلنسی کالج تشریف لائے۔ جہاں منجانب صدرِ کالج لنچ ترتیب دیا گیا تھا بعد تناولِ لنچ سر اکبر نوکھنڈہ مبارک پہنچے۔ مسندِ آصفجہی کو سلامی اور نذر دی اور اظہارِ عقیدت کے طور پر دو رکعت شکرانہ ادا کر کے عازم اسٹیشن ہوئے۔ جہاں تقریباً تمام عہدہ دارانِ مقامی اور معززینِ شہر آپ کو خدا حافظ کہنے کے لئے جمع تھے موٹر سے اُترتے ہی ہندو سبھا کے لڑکوں نے بینڈ سے خیر مقدم کیا۔ اسٹیشن میں داخل

ہونے کے بعد لوگوں نے پھول پہنائے ۔ کالج اسکاؤٹ ٹروپ نے سلامی دی ۔ اس دوران میں ٹرین بھی پلیٹ فارم پر پہنچ گئی جمعیت پولیس نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ تقریباً پانچ بجے روانگی عمل میں آئی چند عہدہ داران مقامی جالنہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے ساتھ گئے۔ اُسی ٹرین سے ہمارے معزز مہمانانِ حیدرآباد بھی روانہ ہوئے ۔

ہزاکسیلینسی نے اپنے جواب ایڈریس میں کالج کے انتظامات اور تعلیم وغیرہ کے متعلق اظہارِ خوشنودی فرمایا ۔ اور حیدرآباد ہی سے ایک پیغام روانہ فرمایا جسمیں اساتذہ اور طلبار کی تعریف کی گئی ۔ اور اس کے ساتھ (۵۰۰) پانچسو روپیہ کا عطیہ طلبہ کے لئے مرحمت فرمایا جس کے لئے ہم ہزاکسیلینسی کی خدمت میں مؤدبانہ طور پر اظہارِ تشکر کرتے ہیں ۔ فقط

عاقل اورنگ آبادی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بگرامیخدمت عالی مرتبت والاجناب ہزایکسلنسی رائٹ آنربیل ڈاکٹر سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر پی سی۔ ڈی سی۔ ایل (آکسفورڈ) ایل ایل ڈی (عثمانیہ و مدراس) صدر اعظم باب حکومت دولت آصفیہ و امیر جامعہ عثمانیہ

یور ایکسلنسی۔

ہم خادمان وطلبہ کلیۂ عثمانیہ اورنگ آباد کے لئے انتہائی فخر ومسرت کا مقام ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ ہمیں جناب والا کی خدمت میں حاضر ہو کر مادرِ علمی کی جانب سے صدارتِ عظمیٰ کی مبارکباد پیش کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ ہمارے آقا و ولی نعمت اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کا ہر فعل بالغ نظری، رعایا پروری اور فلاحِ ملک پر مبنی ہوتا ہے۔ حضور پُرنور حکیم السیاست نے جناب والا کے ہاتھ میں عنانِ حکومت دے کر عقیدت مند رعایا کے قلوب کو مسرت اور اطمینان سے لبریز کر دیا ہے۔

عالیجاہا۔

مشرقی شاعر دنیائے محبت میں فرہاد کی جفاکشی اور کوہ کنی کو مثالاً پیش کرتے

لیکن ذاتِ والا نے حیدر آباد میں بیسیوں پہاڑ کاٹے اور صدہا نہریں جاری کیں۔ یہاں تک کہ ریاست کا چپہ چپہ سیراب و شاداب ہو گیا۔ آقائے ولی نعمت کے سچے عشق، ملک کے درد اور احساس فرض سے متاثر ہو کر جناب نے وہ کار ہائے نمایاں انجام دیئے جو تاریخ حیدر آباد میں زریں حروف سے لکھے جائیں گے۔

تیس سال قبل کے حیدر آباد کا تصور کیا جائے اور اس کے مقابلے میں ترقیوں کی موجودہ وسعت کا اندازہ لگایا جائے تو طلسم کا سماں نظر آتا ہے! اول اوّل جب جناب والا کا تقرر صدر محاسبی پر ہوا تو اس وقت سکہ اور خوردے کے متعلق بڑی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کی اصلاح آپ ہی نے فرمائی طغیانی اور انفلوئنزا کے زمانے میں جناب والا اور جناب لیڈی حیدری صاحبہ کی نمایاں اور قابلِ قدر خدمات اب تک ہماری یاد کو تازہ کر رہی ہیں۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی تنظیم، جامعہ عثمانیہ کا قیام، فنونِ لطیفہ کی قدر دانی، قدیم علوم کا احیار، آثارِ قدیمہ کا تحفظ، موازنہ کا توازن، خزانہ کی معموری، ریلوں اور بسوں کا اجرا، وسیع سڑکوں اور بڑے بڑے تالابوں کی تعمیر، عالیشان رفاہی عمارتوں کا وجود، مسئلہ برار کی عقدہ کشائی اور ریاست حیدر آباد کی مدبرانہ قیادت، بہرحال حیدر آباد کی موجودہ ترقی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر جناب والا کی مہر ثبت نہ ہو۔

عالی مرتبت۔

ہماری انتہائی خوش نصیبی ہے کہ ہم کو ایسے بلند خیال بادشاہ کے ساتھ ایسا وزیر با تدبیر نصیب ہوا۔ ایسی ہی ہستیوں سے ملک کی آبرو اور قوم کی ساکھ

قائم ہوتی ہے۔ جناب والا کی ہر دلعزیزی، قبولِ عام اور عزت، بے لوث خدمات کا نتیجہ ہے۔ جناب والا نے انمٹ مہا کاجوں سے اہالیانِ ملک کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور اپنی دانشمندانہ قیادت سے سلطنتِ برطانیہ میں حیدرآباد کے وقار کو دوبالا کردیا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ جناب والا کے کارنامے بیان کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ لیکن ہم اس کمی کو مخلصانہ خدمات، عقیدت اور محبت سے پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

علم نوازا۔

یہ کلیۃ جس کو جناب والا کی دیرینہ سرپرستی کا فخر حاصل ہے اپنے لائق صدر اوّل جناب مولوی عبدالحق صاحب کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور کے گذشتہ سنین میں بلحاظ تعداد طلبا و عمدہ نتائج، یہ ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرچکا ہے۔ اس وقت کلیۃ کے طلبا کی تعداد تقریباً ۱۳۰۰ ہے اور پچھلے سال جامعہ عثمانیہ کے جملہ کالجوں میں بلحاظ نتائج "باستثنا، کلیۃ اناث" امتحان انٹرمیڈیٹ میں اس کالج کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کالج کے تعلیم یافتہ حکومت کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں۔ اس کلیۃ کی شہرت اب اضلاع مرہٹواڑی تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ ممالک محروسہ کے صوبوں کے علاوہ خاص حیدرآباد اور برار کے طلبا کا بھی مرجع ہے۔ سمت مرہٹواڑی میں تعلیم کا یہ سب سے بڑا مرکز ہے جسمیں علاوہ تعلیم کے اخلاقی تربیت کی غرض سے چار اقامت خانے قایم اور طلبا سے معمور ہیں۔ اس کالج کے فخر کیلئے سنہ ۱۹۲۸ء کے یوم کلیہ کا یہ ارشاد گرامی کافی ہے کہ "یہ وہ کالج ہے جہاں میں نے بہت سے

سبق سیکھے ہیں۔ جن سے مجھے اُس جامعۂ عثمانیہ کے قیام کی تجویز میں مدد ملی ہے جسکے ساتھ عثمان کا نام ایک درخشاں روشنی کی طرح آئندہ نسلوں کی رہنمائی کرتا رہیگا۔ اورنگ آباد کے تاریخی پس منظر اور قدیم روایات علم وفضل کے پیشِ نظر یہ استدعا بے جا نہ ہوگی کہ جدید اسکیم تنظیم میں جس کو حکومت عنقریب نافذ کرنے والی ہے اِس کالج کی موجودہ علمی حیثیت اور مرکزیت کو برقرار رکھا جائے۔ کیونکہ مستقر دارالسلطنت حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے اورنگ آباد خجستہ بنیاد جس کو پایۂ تخت سلطنتِ آصفیہ ہونے کا اولین فخر حاصل ہے۔ سوا تین سو میل دور ہے اور ایلورہ، اجنٹا کے فنونِ لطیفہ کے خزانے، تاریخی نادرات زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اورنگ آباد میں مصوّری اور فنونِ لطیفہ کی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیئے۔ تاکہ یہ علم کا سرچشمہ جو صدہا سال سے اورنگ آباد میں جاری ہے، تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتا رہے۔

صدر ذی مرتبت۔

کلیہ کی عمارت کا بالائی حصہ جس کی رسمِ افتتاح مبارک ہاتھوں سے انجام پائیگی جناب کی ادنیٰ توجہ کا نتیجہ ہے۔ یہ کلیہ جناب والا کا ممنون اور شکرگزار ہے کہ جناب والا نے بلحاظ ضرورت، مختلف ضرورتوں کے لئے ہزارہا روپیوں کے منظور کرنے میں دریغ نہیں فرمایا۔ اس کلیہ کی علمی مرکزیت کے لحاظ سے ایک بڑے لکچر ہال کی ضرورت ہے۔ جہاں کم از کم ایک ہزار طالب علم علمی تقاریب اور تقاریر کے لئے جمع ہوسکیں۔ اس کمی کو ایسے مواقع پر بار بار محسوس کیا گیا ہے۔ جناب والا کی نظرِ عنایت اور ادنیٰ توجہ اس کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔

محسنِ اعظم صدرِ اعظم۔

عالی جناب کی تشریف آوری سے کلیہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ خدامانِ کالج اس مسرت پر اظہارِ تشکر کرتے ہوئے، عہدۂ جلیلہ کی سرفرازی پر ہدیۂ تہنیت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

آخر میں ہم خادمانِ کالج بارگاہ رب العزت میں دست بہ دعا ہیں کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم شہر یارِ دکن و برار کا سایہ عرصۂ دراز تک ہم سب پر قائم رہے۔ اور حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ و شاہزادگان بلند اقبال و شاہزادیانِ فرخندہ فال کی سلامتی میں یور اکسلینسی کا عہد صدارت ہمیشہ اس ملک کے وقار، خوش اقبالی اور اہلِ ملک کی فلاح و مرفہ الحالی کا ضامن بنا رہے۔ آمین۔

ہم ہیں یور اکسلینسی کے تابعدار

پرنسپل معلمین و متعلمین کلیۂ عثمانیہ اورنگ آباد

جوابِ سپاسنامہ

مسٹر پرو وائس چانسلر۔

مولوی سید محی الدین صاحب اساتذہ و طلبائے اورنگ آباد کالج۔

مجھے آج سے نہیں ابتدا سے آپ کے کالج سے خاص دلچسپی ہے۔ اور سب سے زیادہ مجھے خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ جب کبھی میں یہاں آتا ہوں تو پہلے سے زیادہ اسے ترقی اور فروغ پر دیکھتا ہوں۔ اور ہر سال اس کا قدم آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ صاحبوں کی کوششوں اور محنت کا نتیجہ ہے جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ میں جب اوّل اوّل اورنگ آباد آیا تو یہاں نواب بشیر نواز جنگ مرحوم صوبہ دار تھے اور ڈاکٹر سراج الحسن نواب سراج یار جنگ بہادر صدر مہتمم تعلیمات تھے۔ اس کے بعد جب مجھے آنے کا اتفاق ہوا تو نواب رفعت یار جنگ بہادر تعلقدار تھے اور نواب برزور جنگ بہادر صوبہ دار۔ کچھ عرصہ بعد جب میں پھر آیا تو نواب رفعت یار جنگ بہادر صوبہ دار تھے اور نواب رضا نواز جنگ تعلقدار۔ آخر الذکر کی ایسی مقدس ہستی تھی کہ اُن کی یاد ہمیشہ میرے دِل میں تازہ رہے گی اور میں جب کبھی اورنگ آباد آتا ہوں تو خاص طور پر ان کی یاد سے تکلیف ہوتی ہے۔ بعد ازاں میں نے مرحوم کو صوبہ داری پر سرفراز دیکھا اور مولوی غلام احمد خاں صاحب کو تعلقداری پر۔ اب اس وقت مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار ہیں اور راے برکت رائے صاحب تعلقدار۔ ان سب صاحبوں نے اپنے اپنے وقت میں اورنگ آباد کے تعلیمی امور میں اور خصوصاً اورنگ آباد کے فوقانیہ مدرسہ اور

کالج کی ترقی میں مدد دی جو قابل شکر گذاری ہے۔

اورنگ آباد اس ریاست کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کا کالج بھی اس کی شان کے شایاں ہونا چاہیئے۔ سب سے بڑھ کر میں جس چیز کی قدر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ سب صاحب یعنی کالج کے صدر اساتذہ اور طلبا، اپنے فرائض کے انجام دینے میں متحد اور ایک دل و جان ہیں اور آپس کے برتاؤ اور تعلیمی اغراض کی انجام دہی میں مذہب و ملت وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ اس ریاست کے طالب علم خواہ کسی مذہب و ملت کے ہوں باہم بھائیوں کی طرح مل کر رہیں اور اپنے بادشاہ کی وفاداری اور ملک کی فلاح و بہبودی میں یکساں کوشش کریں خدا کا شکر ہے کہ آپ کا کالج اس میں کامیاب نظر آتا ہے میں اس موقع پر اس امر کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے کالج نے علمی و ادبی خدمات اور باہمی اتحاد و اتفاق کی جو شاندار روایات قائم کی ہیں وہ زیادہ تر مولوی عبدالحق صاحب کے سے پرخلوص اور نامور ادیب کی انتھک مساعی کا نتیجہ ہیں جن کے دور صدارت میں آپ کے مدرسہ نے کالج کا مرتبہ حاصل کیا۔ آپ کا مدرسہ خوش قسمت ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کے بعد اس کو مولوی سید محی الدین صاحب کا جیسا صدر نصیب ہوا۔ جنہوں نے نہ صرف روایات کو قائم رکھنے میں مدد دی بلکہ اپنی نیک دلی اور قابلیت سے آپ کے کالج کو ترقی کے اس زینہ پر پہنچا دیا جہاں اسے ہم آج دیکھتے ہیں۔ اُن کی فرض شناسی انہماک اور شوق کو میں خاص طور پر بہ نظر استحسان دیکھتا ہوں۔ میں آپ کے عمدہ نتائج پر

آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اورنگ آباد کالج کے طالب علموں نے عموماً عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی جاکر اپنے امتیاز کو قائم رکھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا کالج دوسرے تعلیمی اداروں کے لئے عمدہ نظیر قائم کریگا۔ آخر میں اُن نیک خیالات کے لئے جو آپنے میرے بارے میں ظاہر فرمائے ہیں آپ سب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اپنے بادشاہ اعلیٰ حضرت واقدس خلد اللہ ملکہٗ اور اُن کے شہزادوں اور شہزادیوں کی صحت و عافیت اور دولت و اقبال کی ترقی کے لئے دعا کرتا ہوں جنکی بدولت ہمیں یہ برکات اور فیوض حاصل ہوئے ہیں۔ آپنے کالج کی جن ضروریات کی نسبت توجہ دلائی ہے ان کی نسبت یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ کالج کے لئے ایک ہال تعمیر کرنے کی نسبت جب گنجائش مہیا ہو سکیگی تو اسپر ہمدردانہ غور کیا جائیگا۔ اور اسی طرح فنونِ لطیفہ کی تعلیم کے لئے جب اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا جائیگا۔ تو اورنگ آباد میں اُن فنون کی تعلیم کے ذرائع مہیا کرنے کا مسئلہ حکومت کے پیش نظر رہے گا۔ فقط۔

ترانۂ استقبال

جناب مولوی غلام طیب صاحب انجم دیر نورس

یہ ترانہ عالیجناب نواب سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم

باب حکومت دولت آصفیہ

کی تشریف آوری کے موقع پر لکھا گیا تھا جبکو اقامت خانہ فوقانیہ کے طلبائے کورس نے

نہایت پُر اثر انداز میں گایا۔

طالبِ علموں کے گھر آئے   کالج میں سر اکبر آئے
عیش کے مژدے گھر گھر آئے
راج کے ماہِ منور آئے
اہلِ دکن کے دلبر آئے
فضل و ہنر کے مظہر آئے
طالب علموں کے گھر آئے   کالج میں سر اکبر آئے
سبزہ بانکی چھب دکھلائے
گل کے روپ پہ من لہرائے
مست نشیلے بادل چھائے
کویل کوکے۔ بلبل گائے
طالب علموں کے گھر آئے   کالج میں سر اکبر آئے
جذبِ دِل نے اثر دکھلایا

بھاگ نگر سے کھینچ بلایا
ننھی جانوں نے سکھ پایا
بچّوں نے مِل مِل کر گایا
طالب علموں کے گھر آئے کالج میں سر اکبر آئے

شاہِ دکن کا بول ہو بالا
جُگ جُگ جیوے راج دُلارا
شاد رہے یہ آنے والا
جس سے ہے بھارت میں اُجالا
طالب علموں کے گھر آئے کالج میں سر اکبر آئے

سج دھج والے بالم آئے
کھولے علم کا پرچم آئے
طیّب صدرِ اعظم آئے
نِت نِت آئے جم جم آئے
طالب علموں کے گھر آئے کالج میں سر اکبر آئے

یہ نظم اُس موقع پر پڑھی گئی جب لہ ہز اکسیلنسی عالیجناب
سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر
پی سی، ڈی سی ایل۔ (آکسفورڈ) ایل ایل۔ ڈی (مدراس و عثمانیہ)
نے عثمانیہ انٹر کالج اورنگ آباد کے جدید بالائی حصے کا افتتاح فرمایا۔

از

جناب پنڈت ونشی دھر ودیا النکار صاحب اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

صدیوں سوئے اس نگری کے جاگ اُٹھے ہیں بھاگ

آج ہوا اٹھلاتی پھرتی، لیکر مست پراگ
پھول بسنتی رنگوں میں بھر کھل رہے ہیں بھاگ

پنچھی اپنے اپنے سُر میں، مدھر رسوں میں پاگ
پریم جگت کے شبھ آنگن میں چھیڑ رہے ہیں راگ

ٹیہ پر بھاتی سُر میں، بدلا کروناپورن وہاگ
نئی خوشی کی، نو آشا کی، جوت رہی ہے جاگ

یہ نگری سونی تھی مانوں بیٹھی لئے براگ
سر اکبر نے اس کو اپنا پھر سے دیا سہاگ

اس کالج سے سب لوگوں کا سدا بڑھے انوراگ
یہ نگری ہو علم و ہنر کا تیرتھ بڑا پریاگ

پراگ (Pollen of flower) مدھر۔ میٹھا، پاگ۔ ملاکر، شبھ۔ خوبصورت، پنیہ۔ ثواب بخش پربھاتی۔ صبح کا راگ، کروناپورن۔ دردبھرا، وہاگ۔ رات کا راگ، آشا۔ اُمید، جوت، روشنی، مانوں۔ گویا، براگ۔ ترک دنیا کرنا، انوراگ۔ محبت، پریاگ، گنگا وجمنا کا سنگم۔

قصیدہ

از جناب مولوی اقرار النبی صاحب مددگار معلم

آج کیا طرفہ تماشہ ہے لبِ شہپا نظر — دوش دیدہ پہ کمندیں لئے آتے ہیں نظر
تاک میں بیٹھے ہیں تولے ہوئے سب اپنے پر — حوصلے یہ ہیں کہ ڈالیں گے دلِ عنقا پر
ایک نقطہ پہ جمائے ہوئے سب اپنی نظر — وہ گرے جوڑھکے پر سارے کے سارے ملکر
لے لیا گھیرے میں یوں کھولکے اپنے شہپر — سائے سے گھیر لیں جوں صحن کو اوراقِ شجر
گھیر کے خوب سا یوں رشتۂ رجا سے جکڑا — شرمگیں حسن پہ جوں تانے تنیں تارِ نظر
بیٹھکر پھر قفسِ دل میں وہ کالج آیا — طالب العلموں کی دنیا میں تماشہ بنکر
جذبۂ شوق میں بے خود تھے زیارت والے — کہ یہ دیں ہاتفِ غیبی نے صدائیں در پر
اہلِ کالج ہو مبارک تمہیں عنقائے مراد — آرزو جسکی ازل سے تھی مسلط دل پر
کوئی محرومی کی حد بھی ہے جو ابتک اسکو — تم سمجھتے رہے اور کہتے رہے سر اکبر
یہ وہ عنقا ہے کہ پایا جو اسے چرخِ کہن — سر سے جاتا رہے کمبخت کے سارا چکر
یہ وہ عنقا ہے کہ جو دن کردے شبِ یلدا کو — یہ وہ عنقا ہی جسے چھو کے ہو پارس پتھر
اس کا دم بھرتے ہیں یورپ کے مدبر سارے — اسکی تسبیح میں ہیں خشک زباں اہلِ ہنر
برقِ جاں سوزِ زمانہ کیلئے اسکا غضب — ہو اگر کوہ گراں بھی تو کرے زیر و زبر
ہو خزاں دیدہ جہاں اسکی نظر سے جنت — جی اٹھیں سوختہ جاں ہی یہ تبسم میں اثر

روک لے خامے کو اقرار نظر او پر کر
ضو فگن بزم پہ ہیں ساقیِ حوضِ کوثر

قصیدہ

در مدح عالیجناب ہزایکسیلنسی نواب سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر

از

سید عبد اللہ صاحب متعلم جماعت ہفتم عثمانیہ کالج اورنگ آباد

آج کالج میں نظر آتی ہے جانِ اور شانِ علم
ہر طرف حسبِ مراتب جمع ہیں خواہانِ علم
موجزن ہے بیچ میں اک چشمۂ حیوانِ علم
جسکی حرکت اور سکوں دونوں سے ہے فیضانِ علم

ضو فشاں اسکی صداقت سے ہے لعلِ کانِ علم
دُر فشاں اسکی بلاغت پر ہیں غواصانِ علم
بے زباں اسکی فصاحت سے ہوئے سحبانِ علم
تر زباں اسکی طلاقت پر ہیں خوش گویانِ علم

یوں تو اک مدت سے یہہ کالج رہا آماجِ علم
دوسری منزل پر آکر بن گیا سرتاجِ علم
اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا معراجِ علم
صدرِ اعظم بیٹھ کر لیتا ہے اس میں باجِ علم

صدرِ اعظم، صدرِ دولت، صدرِ عز و شانِ علم
شمعِ بزم و بابِ علم و مشعلِ عرفانِ علم
حیدری صیقل کُن آئینۂ ایمانِ علم
حیدری کے دم سے رائج سکۂ عثمانِ علم

علم میں اپنی زباں کا بھی اُجالا کر دیا
اے دکن تیرا جہاں میں بول بالا کر دیا

اعترافِ حق

(سر اکبر حیدری)

آنے والے کو اگر ملک کا افسر کہیے / دل یہ کہتا ہے کوئی بات ہے دلبر کہیے
علم کی ضد ہے انہیں علم کا ساگر کہیے / فیض کہتا ہے نہیں فیض کا محور کہیے
صدرِ اعظم انہیں کہیے کہ سر اکبر کہیے / بات بنتی نہیں جبتک نہ سنبھل کر کہیے
نام جو سب کی زباں پر ہے وہی اچھا ہے / حیدری کہیے نظر کردہ حیدر کہیے
عشق کالج کو ہے اس نام سے ہاں عشق ہے عشق / چاہیئے سارے زمانے کو سنا کر کہیے
جب بلائیں انہیں بچے تو چلے آتے ہیں / یہ محبت کی کشش ہے اسے کیونکر کہیے
زندگی شورشِ میخانہ بے تابی ہے / سوزِ پروانہ کو اخلاق کا جوہر کہیے
خدمتِ خلق میں جو دل کہ لگا رہتا ہو / وہی دل ہے جسے مسجد جسے مندر کہیے
علم میں فضل میں تدبیر میں بیداری میں / کوئی ایسا ہو تو اسکو بھی سر اکبر کہیے
جس نے پیدا کیے سعد اللہ و محمود گوان / حیدری کو بھی اسی کان کا گوہر کہیے
ایک ہستی نے ریاست کی پلٹ دی کایا / جھوٹ کہتا ہوں تو مجھکو نہ سخنور کہیے
کس نے اس درد سے کی ملک کی خدمت / کس نے چمکا دیئے اس ملک کے جوہر کہیے
حیدرآباد کا اعزاز بڑھایا کس نے / لے گیا کون اسے سات سمندر کہیے
خوبیاں کتنی اک انساں میں ہو سکتی ہیں / کوئی پوچھے تو سر اکبر کے برابر کہیے
دلِ ہر اہلِ نظر آپ کا شیدائی ہے / کس کو آتے ہیں یہ تسخیر کے منتر کہیے
کیوں نہ ہو آپ ہیں اس خسروِ عالی کے وزیر / بادشاہوں میں جسے انجمِ خاور کہیے
اک زمانے سے ہے مداح سر اکبر طیب / فکر کیسی ہے یہ کیسا ہے مقدر کہیے

نواب مسعود جنگ بہادر سر راس مسعود مرحوم و مغفور

از

مولوی غلام طیب صاحب مدیر نورس

سر سید راس مسعود جن کی اچانک موت نے ابھی کچھ دن ہوئے، مسلمانوں میں صف ماتم بچھادی تھی، ہندوستان کے شہرۂ آفاق علمی خاندان کے ایک مشہور فرد تھے۔ ان کا بچپن اپنے دادا سر سید جیسے عالم اجل اور رفارمر کی زیر نگرانی گزرا۔ سرعت فہم اور ذکاوت ان کو اپنے والد جسٹس محمود سے ملی جن کی قانون دانی اور پُر اثر گویائی کے قصے ابتک مشہور ہیں۔ ان کی والدہ محترمہ نے بچپن ہی میں ان کے دل کو مشرقی روایات، اداب و تہذیب سے معمور کردیا تھا۔ اور مشرقیت ان کے رگ و پے میں سرایت کرگئی تھی جو مغرب کی فضا میں بھی بدستور قائم رہی۔ سر سید کے انتقال کے بعد تھیوڈر ماریسن اور ان کی بیوی نے والدین کی طرح ان کی تعلیم کی نگرانی کی۔ علی گڑھ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ انگلستان گئے اور آکسفورڈ کی سوسائٹی میں یہ مشرقی ہیرا پوری آب و تاب سے چمکا، اور ہر جگہ مقبول ہوا۔ کمسنی میں راس مسعود کی شخصیت کی یہ کامیابی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ انگلستان کے قیام نے ان کے دماغ کو یوروپین بنادیا۔ یہ جب ہندوستان واپس آئے تو مشرقی اور مغربی رجحانات کے بہترین آمیز تھے۔ مغربی تعلیم اور مشرقی روایات نے جنکو اہل یورپ ابتک نہیں سمجھ سکے مرحوم کے جذبات اور عقل میں عجیب و غریب توازن قائم کردیا تھا ان میں قوم

کا درد تھا، لیکن اس میں تعصب اور تنگ خیالی نہ تھی۔ وہ مغرب کے ذوق تحقیق اور علوم وفنون کے دلدادہ تھے، لیکن یورپ سے مرعوب ہو کر انھوں نے مشرقی روایات اور اسلاف کی عظمت کو بھلایا نہ تھا۔ مفتوح قوم کے افراد کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کو قدم قدم پر اپنے تمدن کو بچانے کے لئے نئے نئے تاثرات اور فاتحین کے رجحانات سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ اس لڑائی میں اکثر ہارنا پڑتا ہے، لیکن جو جیتتے ہیں وہ اپنی قوم کے سورما کہلاتے ہیں۔

ہندوستان آنے کے بعد مرحوم نے پٹنے میں وکالت شروع کی۔ لیکن ہندوستانی وکالت کی مبتذل گھاتوں اور عدالتی زندگی کی پیچیدہ اور بے کیف معاملات نے بہت جلد ان کو بیزار کر دیا۔ اسی وقت مرحوم کو بہار کے سررشتہ تعلیمات میں ایک اسامی مل گئی اور وہ اس کے بعد ہمیشہ تعلیمات ہی میں رہے عام خیال یہ ہے کہ تعلیم کا کام انسان کو بہت جلد بوڑھا کر دیتا ہے، لیکن اس مسعود نے اپنی شگفتگی اور شادابی کو ہمیشہ قائم رکھا۔ اچھا معلّم وہی ہے جو طالب علموں کی کیفیات کا ہم آہنگ ہو۔ ان کی رجحانات کا مشاہدہ کرے اور اپنی زندگی کو ان کے رنگ میں رنگ لے۔ ان کے ساتھ کھیلے اور کھلائے۔ ان کو پڑھائے اور پڑھے۔ ان کو آگے بڑھائے اور خود بھی بڑھتا رہے۔ مرحوم ایسے ہی معلّم تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کو اپنے جوہر دکھانے کا پورا موقع نہیں ملا۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ بحیثیت ناظم تعلیمات بہت کامیاب رہے۔ اور مسلم یونیورسٹی کو انھوں نے نازک وقت میں سنبھالا۔ لیکن ان کی قابلیت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ وہ تعلیمات میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن حالات نے ان کو ہر جگہ جکڑ رکھا تھا اور وہ

اپنے خیال کو عملی جامہ کبھی نہ پہنا سکے۔

راس مسعود کی ذہانت اور قوت گویائی کے سب قائل ہیں۔ جب یہ کسی سے باتیں کرتے تو مسحور کر دیتے تھے۔ کوئی مجلس ہو کیسی ہی صحبت ہو کیا مجال کہ ان کا رنگ نہ جمے۔ معلومات وسیع اور بیان پُر اثر۔ ہر شخص ان کا گرویدہ تھا۔ دوسروں پر اثر ڈالنے کے لئے مرحوم پورا زور لگاتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی وجاہت۔ آنکھوں کی چمک۔ چہرہ کا وقار۔ اور بانکپن سب ان کی مدد کرتے تھے بڑے مردم شناس تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہر شخص پر چھا جاتے تھے۔ انکار کا انداز بھی ایسا پر اثر ہوتا تھا کہ اہل غرض بُرا نہ مانتے تھے۔ انگریزی تربیت اور تعلیم نے ان کو حکومت کرنا سکھایا تھا وہ ہر جگہ۔ ہر مجمع میں حاکم بنکر رہنا چاہتے تھے۔ یہ کبر وغرور کی رَو نہ تھی بلکہ سیرت کا ارتفاع اور برتری کا احساس۔ میں اس کو ایک مثال سے سمجھانا چاہتا ہوں۔ انگریزی فوج کا ایک معمولی سولجر جب شام میں سیٹی بجاتے سیر کو نکلتا ہے تو اس کی چال ڈھال۔ آن۔ بان سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ مرحوم کا وقار بالکل اسی رنگ کا تھا۔ اہلِ ذوق اس نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں۔

راس مسعود نئی روشنی کے حضرات کیطرح قدیم اداروں (Institutions) کی تحقیر نہ کرتے تھے وہ ان کی ابتدا اور ارتقا پر ہمیشہ غور کرتے تھے اور ان کو قومی تمدن کا اساس سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں قدیم شعائر کی عزت تھی اور وہ ان کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے، مغرب کی تیز رفتاری کو دیکھکر اہل مشرق نے بھی اپنے گھر میں آگ لگانی شروع کر دی ہے۔ جو بہت خطرناک ہے۔

جاپان کی سیاحت نے مرحوم پر یہ حقیقت بے نقاب کردی تھی کہ مشرقی قومیں بھی ہر چیز میں مغرب کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ اس اذعان نے ان کے دل میں امید کا دیا جلادیا تھا۔ وہ مولانا حالی کی طرح ترقی اور ایج سے مایوس نہ تھے۔ مرحوم نے اپنی تقریر اور تحریر میں بار بار یہ نصیحت کی ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کو جاپانیوں کی طرح اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنی چاہیئے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تجاویز میں مرحوم کا بھی ہاتھ تھا۔ جو خواب وہ بچپن سے دیکھا کرتے تھے حیدر آباد میں پورا ہوا۔ علی گڈھ کی کسر جامعہ عثمانیہ میں مٹائی گئی۔ یہ جامعہ ان کے دل کی آواز تھی وہ بڑے فخر سے کہتے تھے "علمی ترقی کی فضا اب پیدا ہوئی ہے ہر تعلیم یافتہ نوجوان کا فرض ہے کہ وہ کم از کم ایک کتاب کا ترجمہ دوسری زبانوں سے اردو میں کرے"۔ مرحوم کو نظر آرہا تھا کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کا آصفی فرمان اسلامی اور ہندی علوم وفنون کے احیار کی دستاویز ہے۔

راس مسعود کا دل ہند لحانی تھا۔ وہ ہندی اور اردو شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کا ادبی ذوق بہت عمدہ تھا۔ میر کی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ غالب کو بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں سوز و گداز تھا۔ کسی کو مصیبت میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ ہر واقعہ کا اثر فوراً ان کی طبیعت پر پڑتا اور چہرے سے نمایاں ہو جاتا تھا۔ غالباً ۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ مرحوم اورنگ آباد میں دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ مقبرہ کی بارہ دری میں مقیم تھے۔ شام کا وقت تھا مقبرہ کے گنبد پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ فرمایا "کوئی نئی نظم سناؤ"۔ میں اس زمانہ میں رنج وغم کا شکار تھا۔ میں نے اپنی حزیہ نظم "یاد نشاط"

شروع کی۔ میں نے دیکھا کہ اشعار کا حزن ان کو بیتاب کر رہا ہے۔ آگے پڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ نظم مرحوم کو دی اور باہر چلا گیا۔ مرحوم نے پوری نظم بہ آواز بلند پڑھی۔ سات سال کے بعد جب مرحوم حیدرآباد آئے تو میں بھی ان سے ملنے کے لئے گیا مرحوم نے فرمایا "طیب۔ تمھاری وہ نظم ابتک میرے پاس ہے" اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسطرح سب کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اوران کے مغربی لباس اور بھاری بھرکم جسم کے اندر کیسا پر درد اور محسس دل چھپا ہوا تھا۔

مرحوم نے حیدرآباد کے تعلیمی نظام کو سدھارا۔ جدید مدارس قائم کئے قدیم اساتذہ اردو کی تصانیف کی طباعت اور اشاعت کا انتظام کیا۔ علی گڈھ یونیورسٹی کے روگوں کا علاج کیا۔ اس کی مالی حالت درست کی۔ لیکن وہ قوم کے بڑے ہمدرد لیڈر تھے۔ بعض وقت ان کے شریک کار ان کے خیال کو نہیں سمجھ سکتے تھے اس سے ان کو رنج ہوتا تھا۔ وہ موجودہ جامعائی تعلیم کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں میں جاپانیوں کی طرح صنعت وحرفت اور گھریلو دستکاریوں کا عام رواج ہو تاکہ قومی افلاس دور ہو۔ مرحوم کا یہ خیال تھا کہ ایک ایسی یونیورسٹی ہونی چاہئے جس میں صرف صنعت وحرفت کی تعلیم دی جائے۔ وہ بھوپال میں ایسا ہی ایک ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اسی خیال سے مرحوم نے چند جاپانی صناعوں کو بھوپال بلایا اور بھوپالی طلبا کو میسور اور دوسرے مقامات پر صنعتی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا لیکن موت نے یہ خیال پورا نہ ہونے دیا۔ خدا مرحوم کو اپنے

جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کا قومی درد اور بلند سیرت نوجوانوں کو اُکسائے میں اپنے تاثرات کو اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتا ہے (میرؔ)

حیدرآبادی نوجوانوں سے خطاب

از

جناب مولوی سکندر علی وجدؔ بی۔اے (عثمانیہ) ایچ۔سی۔ایس

دیر سے لہرا رہی ہیں بجلیاں سوئے وطن
ہوشیار! اے خالقِ مستقبلِ ملک دکن

اب اگر سویا تو اُڑ جائیں گی غافل! دھجیاں
گھات میں طوفان ہیں اور تاک میں ہیں آندھیاں

کارنامے لوحِ ہستی سے مٹائے جائینگے
دیکھ! اُن چن کر تیرے آثار ڈھائے جائینگے

لہلہاتے کھیت پامالِ خزاں ہو جائینگے
تیرے کوہستان سب آتش فشاں ہو جائینگے

جاگ! ماضی کو نہ رو یہ وہ گھڑی ٹل جائیگی
سامنے آنکھوں کے کشتِ آرزو جل جائیگی

قافلے منزل پہ ہیں مصروفِ عیشِ جاوداں
تا بہ کے گم گشتگی اے یوسفِ بے کارواں!

حیف ہے ابتک ترا سازِ عمل خاموش ہے!
اہلِ محفل ہیں پریشاں کچھ تجھے بھی ہوش ہے؟

برق کے مانند سیرت زندگی بردوش ہو
زورِ طوفان کا ہو اور زلزلوں کا جوش ہو

اپنے ہی ہاتھوں سے یوں تذلیلِ ہستی تابکے
اے بلندی کے مکیں! یہ وہمِ پستی تا بہ کے

خودشناسی تیری سیرت میں جھلکتی کیوں نہیں — تیرے ساغر سے مئے عرفاں چھلکتی کیوں نہیں
کیا بگاڑے گا جو دشمن درپئے آزار ہے — اسکا رونا ہے کہ تو اپنی نظر میں خوار ہے
یہ تری محرومیوں کا راز ہے اے بے خبر! — ہے ترے ہر اک عمل سے بے یقینی جلوہ گر
وار تیرے اسلئے دشمن کو تڑپاتے نہیں — تجھکو اپنی تیغ کے جوہر نظر آتے نہیں
رہبروں کی جستجو میں کس لئے حیراں ہے تو! — اے خودی ناآشنا خود رہبرِ دوراں ہے تو!
اس تڑپ سے ہو شریک زمرۂ اہل کمال — سب کی آنکھیں خیرہ کردے شوقِ خدمت کا جلال
درفشاں ہو جا! کہ ابرِ رحمتِ یزداں ہے تو — ساحلوں کو توڑ موجِ بحرِ بے پایاں ہے تو
ابر آسا جھومتا جا تیغ کی جھنکار میں — برق بنکر کوندتا جا! آتشِ پیکار میں
زلزلہ ہو تیری ضربت سے دلِ کہسار میں — تھرتھری پڑ جائے قلبِ قلزمِ ذخّار میں
جھونک دے شعلوں میں فرسودہ نظامِ زندگی — اے مسیحا! عام کر تازہ پیامِ زندگی
جاں نثاروں میں سرِ فہرست تیرا نام ہو — سر کٹا دینا درِ آصف پہ تیرا کام ہو

فکر کر لے ابتدائے کار سے انجام کی
اے وطن پرور! قسم تجھکو وطن کے نام کی

تعاون باہمی

از مرزا امتین احمد بیگ صاحب سرؔوش متعلم سال اول

فلسفۂ خلقت انسانی اور وجود عالم امکانی پر ایک گہری نظر ڈالئے اور اجزائے عالم کا تجزیہ کیجئے اور ہر شے کی خلقت کا بنظر عمیق مطالعہ کیجئے۔ تو آپ ہر شے حتیٰ کہ ذرات عالم میں بھی اجتماعی زندگی اور باہمی توافق نمایاں طور پر پائیں گے نہیں۔ بلکہ اشیاء عالم سے اگر ہمدردی اور توافق کو اٹھا دیجئے تو یہ نظم عالم یہ تمدن و معاشرت یکبارگی درہم برہم نظر آئے گا۔ آپ اپنے کو تھوڑی دیر کے لئے محض انفرادی زندگی کے لئے تصور کر لیجئے۔ اور یہ سمجھ لیجئے کہ آپ اپنی دولت مندی تبحر علمی اور جاہ و ثروت میں۔ عزت و تمکنت میں کسی غیر کے محتاج اور ضرورت مند نہیں۔ لیکن یہ بتلا دیجئے کہ کیا آپ اپنی اس دولت مندی اور خزائن علمی سے معاشرت انسانی کی ابتدا سے انتہا تک ہزاروں ضروریات زندگی کو ایسا ہی حاصل کر سکیں گے۔ جس کی صدہا قسم کے انسان وحیوان اور نباتات وجمادات کے تعاون باہمی اور سوالات متحدہ کے بعد تکمیل ہوتی ہے۔

ان تمام باتوں کو جانے دیجئے۔ صرف ایک شعبہ کو پیش نظر رکھکر بحث کیجئے کہ آپ کی قوت لایموت جو کچھ بھی تصور کیجئے۔ کسی ایک جنس کی ضرور ہوگی۔ اگر آپ صرف غلہ ہی کو قرار دے لیں تو ذرا غور فرمایئے کہ اس غلے نے کس قدر عالم فنا و بقا کے مدارج کتنی ہستیوں کے ہاتھوں سے نکلکر طے کئے ہیں۔ اور کس قدر منزلیں طے کر کے آپ کے دسترخوان کی زینت بنے ہیں۔ اور آپ کے لقمۂ حیات بننے کی

قابلیت پیدا کی ہے۔ یہ تو اختصار کے طور پر عرض کیا جا رہا ہے۔ ورنہ تعاون باہمی اور ہمدردیٔ انسانی کے تمام اجزا پر قلم فرسائی کی جائے تو یقین کر لیجئے کہ اس کے ایک ایک شعبہ کے بیان کے لئے گھنٹے نہیں بلکہ ہفتے کافی نہ ہو سکیں گے۔ اور ہوشربا کی ۲۳ جلدیں اس کے ہم پلہ نہ آسکیں گی۔

غرض یہ ہے کہ عالم امکانی کا ذرّہ ذرّہ اپنی حقیقت اور اپنی زندگی سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر اپنی ہستی کو نمایاں و سربلند رکھنا مقصود ہے اور آسائش و راحت کی زندگی بسر کرنا پیش نظر ہے۔ تو بلا تعاون و ہمدردیٔ باہمی اس کا حصول غیر ممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ کائنات عالم ہر چیز انسانی ضروریات کے لئے وجود میں آئی ہے۔ ایک ہستی انسانی اشرف المخلوقات ہونے کی بنا پر اس کی دعوے دار ہو سکتی ہے۔ کہ ایک میری شخصیت نے اس خاکدان کرۂ ارضی کو گلزار ارم بنایا۔ میرے وجود نے انواع واقسام کے فواکہات واجناس وغیرہ وغیرہ سے شیرینی بخشی۔ لیکن اس دعوے دار شرافت انسانی کو انس سے مشتق کیا تاکہ یہ اپنے نام ہی سے فلسفہ ہمدردی کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔ کہ وہ کائنات میں مختلف انعامات سے اسی وقت کامیاب و فائز المرام ہو سکتا ہے، جبکہ وہ متحدہ معاشرت اور مضبوط انس و یگانگت کے سلسلوں کو جنباں رکھ سکتا ہو۔

یقیناً حیات انسانی کی وہی مشین مقصود ایجاد کو پورا کر سکے گی جس کے تمام پرزوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہو کہ ہر پرزہ ایک دوسرے کی امداد اور ہمدردی کرنے کی کافی قابلیت رکھتا ہو۔ اگر ان پرزوں کو انس و یگانگت کی برکات سے محروم

کردیا جائے گا۔ تو یقین کرلیجئے کہ ہر پُرزہ۔ اپنی حکیمانہ آفرینش میں بے سود معلوم ہوگا حالانکہ موجد کی غرض یہ نہ تھی۔ بس کائنات عالم کی مشین بھی اس انسانی شکل و صورت کے افتراق و انشقاق اور ترک تعاون و ہمدردی سے ایسی ہی بیکار ہو جائے گی جس کے مواقع اکثر نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔

غزل

از سید عزیز الحسن صاحب ضیاؔ متعلم جماعت دہم کلیہ اورنگ آباد

رہا مہمان ساون کا مہینہ میرے گھر برسوں
رہی آباد اُن کی یاد میں یہ چشم تر برسوں

ہزاروں گردشِ گردوں بدل سکتی نہیں قسمت
بگڑتی ہے تو پھر آتی نہیں یہ راہ پر برسوں

رگوں میں خون ہی باقی نہیں، ورنہ وہ دن بھی تھا
کہ امڈا کی ہے بنکر بحرِ احمر چشم تر برسوں

مہینوں دل جو شوقِ وصل میں تڑپا کرے کم ہے
کہ ترسا کی ہیں آنکھیں دیکھنے کو اک نظر برسوں

وہ عرضِ مدعا جینا کیا جس نے عذاب اپنا
قیامت ہے نہ سننا روٹھ کر اک بات پر برسوں

ضیاؔ اس بیخودی نے مئے کی راز عافیت کھولا
خودی نے ہم کو رکھا تھا جہاں سے بیخبر برسوں

تریا چرتر

از

جناب مولوی غلام طیب صاحب لکچرار اردو عثمانیہ کالج اورنگ آباد و مدیر نورس

ادا کار

(۱) ذوالفقار علی خاں ۔ اشتیاق علی مرحوم کے بڑے فرزند ۔ پرانی وضع اور خیال کے آدمی ۔

(۲) آزاد علی خاں ۔ " " " چھوٹے فرزند ۔ نئی روشنی کے انسان ۔

(۳) شکیلہ بانو ۔ شتاق علی خاں مرحوم کی بڑی صاحبزادی] اشتیاق علیخاں مرحوم کی

(۴) جمیلہ بانو ۔ " " " " چھوٹی صاحبزادی] بھتیجیاں جو تعلیمافتہ ہیں ۔

(۵) مبارک ۔ شکیلہ اور جمیلہ کی خادمہ

(۶) عاشق علی خاں ۔ شکیلہ بانو کے عاشق

(۷) نور خاں ۔ ذوالفقار علی خاں کا ملازم

(۸) کریم خاں ۔ عاشق علی خاں کا ملازم

(۹) امداد علی خاں ۔ عاشق علی خاں کا دوست

(۱۰) مولوی شریعت الاسلام ۔ قاضی

پہلا ایکٹ

پہلا منظر ۔ ذوالفقار علی خاں کا مکان

ذوالفقار علی خاں ۔ تم لاکھ سمجھاؤ میں ٹس سے مس نہیں ہوتا ۔ تمکو نئی تہذیب مبارک ۔

میں اپنی وضع بدلنے سے رہا۔

آزاد علیخاں۔ مگر ہر شخص آپ پر ہنستا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ وہ کون رستم کا جنا ہے۔ ذرا میرے سامنے تو آئے۔ بتیسی نکال کے رکھدوں۔

آزاد علیخاں۔ آپ کس کس کا منہ بند کرتے رہیں گے۔

ذوالفقار علیخاں۔ اچھا تو ذرا کہہ چلیئے۔ وہ آپ کے ملنے والے آخر کہتے کیا ہیں۔ میں بھی تو سنوں۔

آزاد علی خاں۔ بھائی صاحب۔ آپ کا لباس۔ معاشرت۔ صحبتیں۔ بیٹھکیں۔ ایک بات ہو تو کہوں۔ کوئی بد وضع کہتا ہے۔ کوئی تماش بین۔ کوئی واجد علی شاہ کا مصاحب بتاتا ہے۔ کوئی آپ کے بانکپن کا مذاق اڑاتا ہے۔ بُرا نہ مانیئے۔ آپ کو بھائی کہتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ اخاہ۔ اب آپ کو بھی میرے لئے زبان ہوئی۔ اے شانِ خدا۔ ہوں۔ یہ لیجیئے۔ ہم اپنی وضع چھوڑ دیں۔ پٹے نہ رکھائیں۔ مونچھیں مونڈائیں۔ پگڑی نہ باندھیں۔ دگلا۔ انگرکھا نہ پہنیں۔ کالج کے لونڈوں کی طرح چندیا پر چھچھورے بال رکھیں۔ تیل اور عطر چھوڑیں۔ لونڈر لگائیں۔ کشتی۔ کسرت چھوڑ دیں۔ وہ ہاکی فٹ بال کھیلیں۔ مجرے نہ سنیں۔ کلب جائیں۔ زردوزی کی جوتی نہ پہنیں۔ بوٹ ڈٹائیں۔ وہ ڈیڑھ بالشت کا کوٹ پہنیں۔ گلے میں کتے کا پٹہ ڈالیں۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھنا۔ گانا بجانا چھوڑیں۔ ماشاء اللہ کیا اچھا مشورہ ہے۔ والد مرحوم نے اسی دن کے لئے تمکو انگریزی پڑھنے بھیجا تھا۔ یہ کالج کے لونڈے

خاندان کی ناک کٹوادیں تو سہی۔

آزاد علی خاں۔ بھائی صاحب۔ یہ آپ کالج کو کیوں لئے مرتے ہیں۔ بھلا اتنے بڑے شہر میں کوئی ہے جو اس وضع قطع سے رہتا ہو۔ معاف فرمائیے یہ وضعداری نہیں۔ بدوضعی ہے۔ یہ شاہی کے ٹھاٹھ اب بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ انگریزوں کی تقلید کیجئے۔ مگر یہ سوفیانہ لباس۔ یہ بانکپن۔ یہ رات دن کی گپ بازی۔ یہ ناچ گانے بھلا کوئی شریف آدمی اس کو اچھا کہتا ہے۔

ذوالفقارعلیخاں۔ میاں کالج کی پڑھائی نے تم کو ملیا میٹ کر دیا۔ اب کیا کہوں۔ دیکھئے والد مرحوم کا یہ گناہ بخشا بھی جاتا ہے یا نہیں۔ اللہ رحم کرے۔

آزاد علی خاں۔ خیر یہ تو عمر بھر کا رونا ہے۔ میں اس وقت شکیلہ بانو کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا۔

ذوالفقارعلیخاں۔ دیکھو میاں آزاد علی خاں۔ چچا مرحوم نے اپنے وصیت نامے میں ہم کو تم کو اِن لڑکیوں کا ولی مقرر کیا ہے۔ اب چاہے ہم خود شادی کریں۔ چاہے کسی اور جگہ اُن کاٹھکانا کر دیں۔ تو بندے نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ شکیلہ بانو اِیں جانب کے نکاح میں آئیں گی۔ چھوٹی جانیں اور تم جانو۔

آزاد علی خاں۔ مگر بھائی صاحب۔ آپ کی۔۔۔۔عمر۔۔۔۔تو۔۔۔۔بہت۔۔۔۔۔۔۔ زیادہ۔۔۔۔۔۔ ہے۔

ذوالفقارعلیخاں۔ کیا کہا۔ کیا کہا۔ میں تم سے یہی کوئی بیس پچیس برس بڑا ہوں گا۔ تو

اس سے کیا ہوتا ہے۔ کالج کی پڑھائی میں میں نے دماغ خراب کیا نہیں۔ صبح شام کی کسرت آج تک ناغہ نہیں ہوئی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تمہارے ایسے چار سے تو میرا لنگر بھی نہ اُٹھے گا۔ مردی بآزما و زن کن۔

آزاد علی خاں۔ ماشاء اللہ کیوں نہیں۔ مگر لڑکیاں تعلیم یافتہ ہیں۔ آخر وہ بھی تو مانیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ مانیں وانیں میں کچھ نہیں جانتا۔ لڑکیوں سے پوچھتے ہیں آپ کے جیسے کالج کے لونڈے۔ ہمارا یہ طریقہ ہی نہیں۔

آزاد علی خاں۔ یہ تو ظلم ہے۔ شادی بیاہ میں لڑکیوں کی رائے نہ لینا کیا معنے۔ آخر ان کو بھی تو خدا نے عقل دی ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ جی ہاں عقل کیوں نہیں دی ہے۔ یہ نئی بات سُنی۔ مرد اور عورتوں کی رائے لیں۔ ماشاء اللہ۔

آزاد علی خاں۔ اور آپ نے جبر کیا اور ان کی مرضی کے ہوا خلاف۔ تو۔ اسی مغالطہ میں تو سیکڑوں نے دھوکا کھایا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ تو آپ جمیلہ بانو کو آزادی دیجئے۔ بندہ تو پہرے میں رکھے گا۔ پہرے میں۔ جی اور نہیں تو کیا۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ ایسے فقروں میں کوئی اور آتے ہوں گے۔ دو شادیاں تو ایں جانب کی والد قبلہ کے سامنے ہوئیں میں نے ہوا تو لگنے نہ دی۔ اب یہ تیسری ہے۔

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق ست و ہزار بدگمانی

آزاد علی خاں۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ شکیلہ بانو بے موت مریں۔ آپ نہ اُن کو کسی سے

ملنے دیں گے نہ سیر و تفریح کی اجازت۔ چلو قصہ پاک۔

ذوالفقار علیخاں۔ جی ملنا ملانا کیسا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ ایسی باتیں سنیں اور دماغ میں آزادی کی ہوا سما جائے۔

آزاد علی خاں۔ اللہ ری بد گمانی۔ یہ تو اندھیر ہے۔ ابھی ان کا سن ہی کیا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ اے میاں۔ یک من علم را دہ من عقل باید۔ یہی زمانہ تو نگرانی کا ہے نہیں تو کیا بوڑھی ہو کر پیر نکالیں گی۔

آزاد علی خاں۔ اللہ خیر کرے۔ بھائی صاحب آپ سے زبان کون لڑائے۔ مگر میں برملا کہتا ہوں کہ جمیلہ بانو پر ہرگز جبر نہ کروں گا۔ وہ خود ماشاء اللہ سمجھدار ہیں۔ جہاں جی چاہے آئیں جائیں۔ جس کے ساتھ جی چاہے شادی کریں۔ شادی اور جبر۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ذوالفقار علیخاں۔ تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے آپ کہ جمیلہ بانو دن کو مدرسے جائینگی شام کو کلب گھر۔ راتوں کو سینما کی سیریں ہوں گی۔ اور اُن کے گرد پروانوں کا مجمع ہوگا۔ اے سبحان اللہ کیا تعلیم ہے کیا آزادی ہے۔

آزاد علی خاں۔ یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ مرد تو کھُلے بندوں پھریں اور عورتیں گھر کی چار دیواری کے باہر نہ نکلنے پائیں۔ گویا دنیا میں وہ صرف مصیبت بھرنے کے لئے آئی ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ تو اپنے شوہروں کی خدمت کرنا اور گھر سنبھالنا آپ کے حساب وں ایک مصیبت ہے۔

آزاد علی خاں۔ مصیبت تو ہے ہی۔ وہ ہزار عیش و آرام سہی۔ جب آزادی نہیں۔

اختیار نہیں تو سب ہیچ۔

ذوالفقار علیخاں۔ تو مطلب یہ نکلا کہ لڑکیاں کوچہ و بازار میں حسنِ نوخیز کی نمائش کرتی پھریں۔ نامحرموں سے ملیں۔ شرم کو بھون کھائیں۔

آزاد علی خاں۔ اجی آپ نے عورت کو کیا سمجھا ہے۔ ان کو پڑھائیے لکھائیے ان پر اعتماد کیجئے تو یہ محبّت کی پتلیاں اپنی جان نثار کر دیں۔ مگر آپ نے کی بدگمانی تو پھر وہ چھل فریب کسی چیز سے دریغ نہیں کرتیں۔ اور پھر یہ "عصمت بی بی از بے چادری" کیا کام کی۔ وہ عورت کیا کہ قید میں تو بھیگی بلّی بنی رہے اور باہر نکلتے ہی اودھم مچا دے۔

ذوالفقار علیخاں۔ عورتوں کے ہزاروں قصّے ہیں۔ آزادی ان کے لئے زہر ہے۔

آزاد علی خاں۔ یہ سب پُرانی لغویات ہیں۔ ہر شریف عورت کو اپنی عصمت و آبرو کا خیال ہوتا ہے۔ یہ مردوں کی تنگ نظری ہے کہ وہ عورتوں پر جان تو دیتے ہیں مگر اعتماد ذرا نہیں کرتے۔

نور جہاں۔ واہ چھوٹے میاں واہ۔ لے آج آپ کی لیاقت معلوم ہوئی۔ کیا قائل کیا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ تو آپ جمیلہ بانو کو ویسے ہی کھلا چھوڑ دیں گے؟

آزاد علی خاں۔ بلاشک۔

ذوالفقار علیخاں۔ اور اس کا نتیجہ۔

آزاد علی خاں۔ ان میں غیرت اور خودداری پیدا ہوگی۔

ذوالفقار علیخاں۔ اور عاشق بھی تو پیدا ہوں گے۔

آزاد علی خاں۔ ہونے دیجئے۔ جو عورت کھوٹی ہے وہ سات پردوں میں بگڑ جائے گی اور شریف سمندر میں بھی رہے تو دامن تر نہ ہو۔

ذوالفقار علیخاں۔ جناب کل ہی سے سیکڑوں نوجوان درس محبت کے لئے آپ کے درِ دولت پر جمع رہیں گے۔ کہیں اس آزادی کے بھرے میں نہ آئیے گا۔ اور سو باتوں کی ایک بات کہے دیتا ہوں کہ بی بنو نکل جائیں گی۔

نورجہاں۔ ہاں میاں چنوتی دیتا ہوں۔ نکل جائیں گی ضرور کرکے نکل جائینگی

آزاد علی خاں۔ خیر چور گئے کہ اندھیری۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ میں دھوکا کھاتا ہوں یا آپ۔ مگر خدا کے لئے اس بیچاری کا خیال رکھئے کہیں اس کے دشمنوں کو کچھ ہو ہوا نہ جائے۔

ذوالفقار علیخاں۔ پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ ارے میاں۔ ان کو کیا ہوگا۔ مزے سے گھر میں دندنائیں گی۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ مانا اصیلیں خدمت کے لئے حاضر، کام نہ کاج۔ اور آنے جانے کا کیا ہے۔ کہیں برادری میں تقریب ہوئی تو میانے پر جائیں گی۔ سپاہی۔ روّنا ساتھ مہری چھپکے کا کونا دبائے ٹھسّے سے چلی جارہی ہے۔ دیکھنے والے کہیں کہ یہ ذوالفقار علی خاں کے گھر کی سواری ہے تو یہ قاعدہ شریفوں کا ہے۔ یہ نہیں کہ شام ہوئی اور بی بنو میاں کے ساتھ چلیں وضع ایسی کہ پہچاننا مشکل کہ میاں کون ہیں اور بیوی کون پھر پولی حیران۔ نہ مسی نہ پان۔ نہ گھنگرو نہ پازیب۔ نہ مہندی نہ عطر نہ ناز و غمزہ۔ نہ عشوہ و ادا۔ نہ لگاوٹ نہ شرم وحیا۔ آگ لگے

اس آزادی کو اور بھاڑ میں جائے یہ نئی روشنی جس نے معشوقوں میں دل لینے کی ایک ادا نہ چھوڑی۔

گیا حُسن خوبانِ دلخواہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

اور میاں تم سے کون کہے کسی معشوق سے پوچھو تو وہ بتائے کہ بانکپن کس کو کہتے ہیں۔ اور بانکے کیسے ہوتے ہیں۔ جب ذرا سینہ تان کے نظر اُٹھا دی۔ سیکڑوں معشوق گھائل ہو گئے۔ شکیلہ بانو بڑی تقدیر والی ہیں۔

ایک تجھ پر نہیں موقوف کہ سارے ظالم
پانی آگے مرے اے عربدہ جو بھرتے ہیں

نورحسن۔ واہ میاں کیا کہنے ہیں۔ بند کر دیا چھوٹے میاں کو۔ لے بھلا کوئی جواب دے سکتا ہے۔ ارا ٹون کا باپ ہو تو بول جائے۔ ہاں اور نہیں تو کیا۔

منظر بدل پر داگرتا ہے

پہلا ایکٹ

دوسرا منظر۔ زنان خانہ کا ایک کمرہ۔ شکیلہ بانو۔ جمیلہ بانو اور اُنکی خادمہ مبارک شکیلہ بانو رو رہی ہے۔ جمیلہ بانو اس کے کمرے میں آتی ہے۔

جمیلہ۔ آپا۔ آپا۔ ہائے اللہ میری آپا کو کیا ہو گیا۔

مبارک۔ (دوڑتی ہوئی آتی ہے) بی بی۔ بی بی۔ باہر شادی کی بات چیت

ہو رہی ہے۔

جمیلہ۔ خاموش۔ دیکھتی نہیں ہے۔ جلدی سے پانی لا۔ مبارک پانی لانے جاتی ہے۔

جمیلہ۔ آپا۔ خدا کے لئے بولو۔ آخر آپ رو کیوں رہی ہیں؟

شکیلہ۔ رونا میری قسمت میں ہے۔ پہلے ماں باپ کی موت نے رُلایا۔ اب تقدیر عمر بھر رونے کا سامان کر رہی ہے۔

جمیلہ۔ آخر واقعہ کیا ہے؟ کچھ صاف صاف فرمائیے۔

شکیلہ۔ اسلام نے عورتوں کو آزادی دی۔ ان کے حقوق قائم کئے لیکن ہم کو مرد اپنی ملک سمجھتے ہیں۔

جمیلہ۔ عورتیں قانوناً بالکل آزاد ہیں۔ ہم پر کون ظلم کر سکتا ہے۔

شکیلہ۔ لیکن رواج۔ ہماری مجال نہیں کہ اپنے معاملہ میں ایک لفظ زبان سے نکالیں۔

جمیلہ۔ تو یہ ہماری کمزوری ہے ورنہ مذہب اور قانون دونوں ہمارے پلّے پر ہیں۔

شکیلہ۔ بات تو وہی ہوئی کہ ہم بے بس ہیں۔ ابّا جان نے بڑے بھائی صاحب کو ہمارا ولی بنایا ہے۔ وہ اپنے منصوبے باندھ رہے ہیں۔

جمیلہ۔ کیا وہ ہماری جائداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

شکیلہ۔ اتنا ہی ہوتا تو کچھ نہیں تھا وہ مجھ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری تعلیم وا لیم سب ختم ہو گئی۔

جمیلہ۔ اچھا۔ اب میں سمجھی میں بھی کیسی بیوقوف ہوں۔ یہ بڑھاپے میں ان کو کیا سوجھا ہے۔ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ایسا نہیں ہو سکتا۔

شکیلہ۔ ہمارا کون ہے جو اڑی پر آڑے آئے گا۔

جمیلہ۔ آپا۔ خدا نے ہم کو عقل دی ہے۔ اگر ہم اپنی حفاظت نہ کریں تو کون کرے گا۔ پھر آج کل کچہری عدالت ہر جگہ ہم فریاد کر سکتے ہیں۔

شکیلہ۔ مگر اس سے خاندان کا نام جھنڈے پر چڑھے گا۔ ہماری مصیبت کوئی نہیں دیکھتا سب یہی کہیں گے کہ یہ لڑکیاں بڑی شوخ دیدہ ہیں۔

ناجمیلہ۔ میں مرجاؤں مگر مجھ سے یہ نہ ہوگا۔

جمیلہ۔ یا خدا ہم غریبوں کے لئے مصیبت ہی مصیبت ہے۔

شکیلہ۔ جمیلہ تم بڑی خوش نصیب ہو۔ چھوٹے بھائی ماشاء اللہ بڑے سمجھدار اور شریف ہیں۔ ابھی ابھی باہر باتیں ہو رہی تھیں انھوں نے کہا کہ شادی بیاہ کے معاملہ میں لڑکیوں کو آزادی ملنی چاہیئے مگر بڑے بھائی نے ڈانٹ دیا۔

جمیلہ۔ وہ بڑے خود غرض اور جاہل ہیں۔

شکیلہ۔ مگر ہمارے ولی ہیں۔

جمیلہ۔ ایسے ولی کی کون مانتا ہے۔

شکیلہ۔ ہم کس سے لڑیں۔ خدا ہی رحم کرے تو کرے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔

جمیلہ۔ بڑے بھائی ہیں بیوقوف۔ ہم ان کو آسانی سے دھوکا دے سکتے ہیں۔ آپا آپ روئیے دھوئیے نا۔ میں کوئی نہ کوئی تدبیر نکالوں گی۔

چھوٹے بھائی بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

پہلا ایکٹ

تیسرا منظر۔ شاہ راہ۔ (نور خاں اور کریم خاں)

نور خاں۔ دل ایکے سے لاگا۔ ہجاروں کھڑے۔ دل ایکے سے لاگا۔

کریم خاں۔ سلام بھائی نور خاں سلام کہو اچھے تو رہے میں تمہاری طرف جا رہا تھا۔

نور خاں۔ موری باری عمریا نڈان۔ نا چھیڑو رے بالما۔

کریم خاں۔ اوہو۔ آج تو بڑے مزے میں ہیں۔ کہیں بوٹی پی گئے۔

نور خاں۔ کڑکن لاگے بانس۔ سیّاں کڑکن لاگے بانس۔

کریم خاں۔ یا اللہ۔ اب اس بانس کی خبر بھی کچھ نکلے گی۔

نور خاں۔ ارے یار۔ جہاں شادی بیاہ کی بات چیت ہوئی۔ بس ہم کو اپنی نیک بخت یاد آجاتی ہیں۔ ہائے ہائے کیا مزوں کے دن تھے۔ جو شام سے سوئے تو صبح۔

کریم خاں۔ ہاں بھائی اب تو ایسا زمانہ ہے کہ روٹی مل جائے تو بہت ہی جورو دو رو کہاں۔ ارے بھائی تم سے ایک کام ہے۔

نور خاں۔ تو کہہ چلو۔

کریم خاں۔ اُستاد ایک خط پہنچانا ہے۔

نور خاں۔ اب تم تو پہیلی بجھاتے ہو۔ ارے بھائی کس کا خط ہی کہاں پہنچانا ہے۔

کریم خاں۔ ہمارے میاں کا خط ہے تمہاری بی بی کے نام۔

نور خاں۔ کیا شکیلہ بی بی کے نام کا ہے۔

کریم خاں۔ اب نام وام تو ہم کو معلوم نہیں مگر ہے وہی۔

نور خاں۔ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔

کریم خاں۔ ارے بھائی، ہمارے میاں رات رات بھر ہائے وائے کرتے ہیں۔

نور خاں۔ اور جو بی بی خفا ہو جائیں تو سر مونڈ لیں۔ اور میاں کو معلوم ہو تو نوکری جائے الگ اور مار پڑے جدا۔

کریم خاں۔ اب اتنی دور کاہے کو جاتے ہو۔ یہ خط اندر دے دو چلو چھٹی ہوئی۔

نور خاں۔ اور اگر کھل کھلا جائے۔

کریم خاں۔ تو وہ جانیں وہ جانیں۔

نور خاں۔ اور مجھ پر آنچ آئی تو۔

کریم خاں۔ تو جو چور کی سزا وہ میری۔

نور خاں۔ اچھا بھائی لاؤ موقع لگے گا تو پہنچا دوں گا۔

کریم خاں۔ بس بس بس ہمارا ملاحظہ کرو۔

پہلا ایکٹ

چوتھا منظر۔ ذوالفقار علیخاں کا گھر

شکیلہ بانو۔ (اندر سے) نور خاں بھلا یہ تمہارے میاں کو کیا سوجھی ہے مجھ نصیبوں جلی کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ ماں باپ قبر میں پیر پھیلا کے سو گئے اور

ہم کو عذاب میں ڈال گئے۔

نورجناں۔ کیا بتاؤں۔ بی بی۔ ان کا دل آگیا ہے۔ اب ذری مشکل ہے۔

شکیلہ بانو۔ ماشاء اللہ بھائی ہو کر ایسی زبردستی۔ میں لاکھ بے بس ہوں مگر اپنے اوپر تو اختیار ہے میں جان دے دوں گی مگر یہ بات نہ ہوگی۔

نورجناں۔ ارے بی بی۔ ایسی بات زبان سے نہ نکالو۔ مریں تمہارے دشمن۔ تم اپنی جان کاہے کو ہلکان کرتی ہو۔ میاں ہیں بھیا کے ناؤ۔ ذری رنگ تو دیکھو۔ اور ہاں بی بی۔ منہ میٹھا کرو تو ایک مزے کی خبر سناؤں۔

شکیلہ بانو۔ مجھ کمبخت کو بھلا کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ رونا ہے اور کڑھنا۔ خوش ہوں تو بی جمیلہ جنہیں کسی بات کی بندی نہیں ہے۔

نورجناں۔ بی بی۔ عاشق علی خاں وہ جو معشوق علی خاں تحصیلدار کے بیٹے ہیں۔ گورے چٹے۔ ابھی کوئی برس بیس بائیس کا سن ہوگا پڑھے لکھے اور بڑے نستعلیق ہیں۔ اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ مگر چال ڈھال میں کوئی بات بری نہیں ہے۔ ان کے نوکر نے یہ خط دیا اور کہا بی بی کے ہاتھ میں دینا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ تو بی بی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے لے لیا۔ اب تم دیکھو اس میں کیا کیا لکھا ہے۔ اور جو کوئی ایسی ویسی بات ہو تو میں ابھی جا کے جھاڑ دوں۔

شکیلہ بانو۔ (خط لے کر) نہیں نہیں کہیں ایسا نہ کرنا۔

ذوالفقار علی خاں آتے ہیں

ذوالفقار علیخاں۔ نورخاں۔ نورخاں۔ کہاں مر گیا۔

نورخاں۔ "یا وحشت" میاں۔

ذوالفقار علیخاں۔ بھائی اب تو "آتش عشق تیز تر گردد" والا معاملہ ہے۔ ہائے ہائے۔

مستم ز غمِ عشق تو مستم مستم　　دل در طلبِ وصل تو بستم بستم
گویند مرا عاشقِ بدنام توئی　　منکر نتواں بود کہ ہستم ہستم

مبارک۔ یہ منہ کھائے چولائی۔ موا چل نکلا۔ ہماری بی بی کو کتنا رلایا ہے۔

نورخاں۔ "دانتوں تلے انگلی دبا کر" ارے میاں کوئی شریف بہو بیٹیوں کے سامنے شعریں پڑھتا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ اونہہ۔ زندگانی کا مزا عشق میں کھو بیٹھے ہیں
اپنی کشتی اسی دریا میں ڈبو بیٹھے ہیں

ہائے نورخاں ایک نظر دکھا دو۔ جان جاتی ہے۔ اب ہم سے پردہ کیسا۔ وہ معشوق گلعذار میں عاشقِ زار۔ وہ بیوی میں میاں۔ نکاح اب ہوا داخل ہے۔

مبارک۔ گھر کی پھٹکی باسی ساگ۔

نورخاں۔ واہ میاں آپ بھی ہیں بس وہی۔ ارے جب بات چیت لگ رہی ہے۔ تو پھر سامنے آنا کیسا!

ذوالفقار علیخاں۔ ہاں یہ تم نے پتے کی کہی۔ یہاں پر تو ہم بھی قائل ہو گئے۔ اور بھلا تم ..... سے ...... تو ...... پردہ۔

نورخاں۔ اب ہماری چھوڑو میاں۔ میرے سامنے پیدا ہوئیں۔ گود کھلایا اب بھلا ہم سے کیا چھپیں گی۔ مگر یہ ہے کہ اب جوان جہان ہیں تو

ذرا حجاب آتا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ ارے یار تو تم ہی مزے میں رہے مگر کچھ ناک نقشہ تو بتاؤ ہم نے تو
تب دیکھا تھا جب چار برس کی تھیں اب تو بات ہی اور ہو گی۔

نورجہاں۔ اب یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میاں۔ ماشاء اللہ چندے آفتاب
چندے ماہتاب۔ چاند میں میل ہے اُن میں نہیں بس نک سُک
سے درست جوانی پھٹی پڑ رہی ہے۔

کہوں کیا جلد کی اسکی صفائی
ہو جیسے دودھ پہ ہلکی ملائی

ذوالفقار علیخاں۔ اوہو۔ اب تم بھی شعر پڑھنے لگے یہ ہمارا فیضِ صحبت ہے۔ مگر ہوں
میں بھی بڑا خوش قسمت۔ گھر بیٹھے پری ہاتھ آئی۔ اب ذرا اس کو شیشے
میں اُتارنا چاہئے۔ معشوقوں پر تو ہم چٹکی بجاتے رنگ جما دیتے ہیں۔
سنبھل کر۔

نورجہاں۔ میاں آپ کا چہرہ کچھ اُترا اُترا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ بس یہ ہتھے پہ ہی لگتا ہے۔ پاجی کہیں کا۔

نورجہاں۔ میاں آپ نے یہ خضاب کیا لگا یا۔ ادھر بال تو سفید چمک رہے ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ کمبخت مردود۔ خدا کرے تجھے بہشت نہ نصیب ہو۔ معشوق کے سامنے
رنگ پھیکا کرتا ہے۔

مبارک۔ یہ تو موا رنگا سیار ہے۔

نورجہاں۔ ارے توبہ بڑی چوک ہوئی۔

ذوالفقار علیخاں۔ سنا نور خاں۔ پرسوں منے آغا کے گھر مشاعرہ تھا۔ یاروں نے بھی دو غزلہ لکھا۔ پہنچا اور صفِ اساتذہ میں ڈٹ گیا۔ شمع سامنے آئی تو لکڑی ٹیک کے وہ وہ پڑھا کہ چھتیں اُڑ گئیں۔ ایک شعر ہوا ہے سنو گے تو پھڑک جاؤ گے۔ تاک۔ ناک۔ قافیہ تھا۔

مرغِ دل کو توڑے گی بلّی ترے دروازے کی

رخنتِ تن کو کترے گا چوہا تمہاری ناک کا

نورخاں۔ سبحان اللہ میاں۔ کیا تلازمہ ہے اور اتّے سے شعر میں دو ضلع باندھ دیئے۔

اندر سے۔ واہ کیا شائستہ مذاق ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ تو مشاعرہ ہوگا نا ہو یار لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ دیکھئے واللہ ضرور آیئے گا تو وجہ کیا کہ ہم نہ ہوں تو محفل سونی۔

اندر سے۔ آپ تو نقل محفل ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ اب اُسی دن چھوٹے نواب کے یہاں گانے کی بیٹھک تھی۔ بڑے بڑے اُستاد جمع تھے۔ وہ حیدری خاں کے شاگرد بشیر خاں اور محمد خاں طبلے باز۔ اور کون اور کون۔ اور وہ چھوٹی بڑی جدن بس ایک سے ایک گلے باز۔ اب یار والنے کی ضد۔ کہ مرزا صاحب یہ تو خیر گاتے ہی ہیں آپ ایک چیز سنایئے۔ میں نے کہا بھائی اب وہ مشقیں نہیں رہیں کیا گاؤں۔ مگر چھوڑتا کون ہے ٹوکا ہے سے کہ سب جانتے ہیں کہ ہم جو کام گلے سے کر جاتے ہیں آج کوئی کر کے تو دکھا دے۔

بس میں نے اُستاد سے کہا۔ ہاں بھائی ذرا سنبھل کے بجانا۔ شروع
کیا میں نے اُڑانا۔ اب جو اُلٹ پلٹ کے تان لیتا ہوں تو اُستاد
یہاں ہیں وہاں۔ سب نے دوڑ کے پیر پکڑ لئے اور کہنے لگے بس ہم
اتنی دور نہیں جا سکتے۔ تو نور خاں ہمارے یہ گلے ہیں

اندر سے۔ کیا بے سُرا پن ہے۔

نور خاں۔ مگر میاں سُر کا پتہ آج تک نہ چلا۔

ذوالفقار علیخاں۔ ہوں مجال ہے چل جائے۔ اور ایک گانا کیا۔ ہر فن میں ہم طاق
ہیں۔ ابھی کل میں چوک سے چلا جا رہا تھا راستے میں ملے میاں تیغ باز خاں
وہ جو بانکے بنے پھرتے ہیں۔ آنکھیں ہوئیں چار۔ میں نے کہا سنو میں بھی
بڑے تن کا آدمی ہوں۔ نکلے کے ایسے بل نکال کے رکھ دوں گا۔
اُس نے کہا۔ کیا کہا بس میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ رجز خوانی شروع کر دی

منیرہ منم اخت افراسیاب
برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب

نور خاں۔ واہ میاں تم کو زبان کا بھی لہنا نہیں۔ میں اپنا سر پیٹ لوں بھلا
اس کے معنے کیا ہوئے۔

ذوالفقار علیخاں۔ ارے توبہ۔ خدا غارت کرے اس زبان کو ہاں تو میں نے کہا

رد کے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو
بے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو

پڑھ پڑھا کے لی لکڑی اور سر۔ طمانچہ۔ باہرہ۔ چاکی۔ کرمک۔ جنیو۔

ساتوں ہاتھ گنا دیئے۔ تو وجہ کیا کہ بچپن سے یہی مشقیں ہیں۔ مگر آدمی ہے جیالا۔ پل پڑا۔ کھینچی اس نے دستی۔ بس میں ہاتھ ملاتے پکڑ لایا۔ اور قلاجنگ کے داؤں پر جو مارتا ہوں تو اڑا اڑا اڑا دوں۔ اندر سے۔ ڈینگیا۔

نورخاں۔ واہ میاں۔ واہ۔ یہ پیچ ہم کو بھی سکھا دینا۔

ذوالفقار علیخاں۔ ابھی داؤں پیچ تو یہاں ناخنوں پر ہیں۔

(عاشق علی خاں اور امداد علی خاں اسٹیج کی دوسری جانب)

عاشق علی خاں۔ بھائی خط تو داغ دیا۔ اب دیکھو کیسی ہوتی ہے۔ مگر یار جبتک سانپ نہ مرے خزانہ ہاتھ نہ آئے گا۔

امداد علی خاں۔ جناب میں ناک ناک بدتا ہوں۔ بی شکیلہ اور آپ پر نہ رکھیں۔ مگر کیا کرے بیچاری ہے بے بس۔ اس موذی کے پنجے میں پھنسی ہے۔

عاشق علی خاں۔ غضب خدا کا۔ آج بھی معصوم لڑکیوں پر یہ سختیاں ہوتی ہیں۔

امداد علی خاں۔ جناب عورت یوں تو بودی ہے۔ مگر ضد آئی تو بس شیرنی ہے۔ اور ایسی ہی جگہ تو عاشقوں کے پو بارہ ہوتے ہیں۔ جہاں کسی نے جوان لڑکی پر دباؤ ڈالا۔ بس سمجھ لو کہ عاشقوں کی بن آئی۔ شکیلہ بانو پر جو جبر ہو رہا ہے یہ تمہارے لئے فالِ نیک ہے۔ اگر یہاں معاملہ پٹ پڑے تو ٹانگ کے رستے نکل جاؤں۔

عاشق علی خاں۔ ناز و نعم میں پالے ہوئے معشوق پر یہ ستم۔ اس غریب کی بے بسی اب دیکھی نہیں جاتی۔

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں تا بہ فشاں اور

ہر چہ بادا باد آج میں ذوالفقار علی خاں سے کہہ کے رہوں گا۔

(آگے بڑھ کر)

عاشق علی خاں۔ آداب عرض کرتا ہوں۔

ذوالفقار علیخاں۔ یا اللہ یہ صاحبزادے یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔

عاشق علی خاں۔ جناب والا تسلیمات عرض ہے۔

ذوالفقار علی خاں۔ پھول کھلا اور بو پھوٹی۔

عاشق علی خاں۔ جناب خاں صاحب۔

ذوالفقار علیخاں۔ اور نظر بازوں نے تاک جھانک شروع کی۔

عاشق علیخاں۔ میں بہت دیر سے آداب بجا لا رہا ہوں۔

ذوالفقار علیخاں۔ اللہ خیر کرے۔ میری دائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔

عاشق علی خاں۔ میں مخل اوقات گرامی تو نہیں ہو رہا ہوں۔

ذوالفقار علیخاں۔ دریں چہ شک۔

عاشق علی خاں۔ مگر اشتیاق ملاقات نے مجھے اس جسارت پر مجبور کیا۔ جناب کسی خاص دھن میں ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ سب کو اپنی اپنی فکر ہے۔

عاشق علی خاں۔ مگر زیادہ غور و فکر سے دماغ پر بار پڑتا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ آپ کی بلا سے۔

عاشق علی خاں۔ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ذوالفقار علیخاں۔ تو جو کچھ کہنا ہے تڑ سے کہہ دیجئے میں اس وقت آپ کی خاطر نہیں کرسکتا۔

عاشق علی خاں۔ (تامل کرتے ہیں)

ذوالفقار علی خاں۔ (جِز بِز ہو کر) حضرت تکلف برطرف اب جو کچھ کہنا ہے کہئے اور چلتے پھرتے نظر آئیے۔

عاشق علی خاں۔ خاں صاحب۔ کیا آپ ہی مس شکیلہ کے ولی ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ (آنکھیں نکالکر) جی ہاں پھر اس سے مطلب۔

عاشق علی خاں۔ میں جناب کی خدمت میں مس شکیلہ کے لئے پیغام دینے حاضر ہوا ہوں

ذوالفقار علیخاں۔ مَیں تو پہلے ہی کھٹکا تھا، جناب عاشق علی خاں صاحب۔ آپ کس پھیر میں ہیں۔ میں صرف ولی نہیں ہوں۔ بلکہ اُن کا منگیتر بھی ہوں مس شکیلہ نے ہزاروں میں میرا انتخاب کیا ہے۔ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آپ براہ کرم پیغام دینے کی زحمت نہ فرمائیے۔

مبارک۔ نور خاں یہ خاصدان لے جاؤ۔

عاشق علیخاں۔ میں سمجھا نہیں کیا آپ کے ساتھ مس شکیلہ شادی کر رہی ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ اب کہہ تو رہا ہوں۔

عاشق علی خاں۔ کیا واقعی۔

ذوالفقار علیخاں۔ ہر کہ شک آرد کافر گردد۔

عاشق علیخاں۔ معاف فرمائیے۔ آپ کی ـــ عمر ـــ کی وجہ ـــ سے ـــ مجھے

— یہ خیال۔

ذوالفقار علیخاں۔(جس کو دیکھو مجھکو بوڑھا سمجھتا ہے۔حالانکہ ابھی ہم پر جوانی آرہی ہے)
جناب مس شکیلہ بانو میرے سوا کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی نہیں
چاہتیں۔ بلکہ آپ کا یہاں تشریف لانا ہی ان کو سخت ناگوار ہے۔

عاشق علی خاں۔ایں گل دیگر شگفت۔اچھا تو حضرت خدا حافظ۔

نور حساں۔" میاں پان لیجئے" کہتا ہوا خاصدان پیش کرتا ہے۔ پانوں میں خط
لپٹا ہوا ملتا ہے۔

منظر بدل پردہ گرتا ہے

شاہ راہ پر جاتے ہوئے۔

عاشق علی خاں۔ارے بھائی یہ خط تو پڑھو یہ پان کے ساتھ آیا ہے۔ دیکھو
محسب من۔ آپ کا اشتیاق آمیز خط ملا۔ میں کس قابل ہوں
بہرحال جیسی ہوں اب آپ کی ہوں۔ خدا را مجھے مصیبت
سے نجات دلائیے۔ معاف کیجئے، میری بے بسی نے مجھے
اس بے شرمی پر مجبور کیا کہ یہ خط لکھا۔

ناچیز۔ شکیلہ

امداد علی خاں۔کیوں۔ لانا ہاتھ۔ اب اُستاد مانتے ہو ہم کو۔ ہم نہ کہتے تھے کہ نشانہ
خالی جا نہیں سکتا۔ لو۔ مبارک ہو۔ معشوق کے دل میں بھی تمہاری
جگہ ہے۔

عاشق علی خاں۔مگر اُس کی باتوں سے میں سٹ پٹا گیا تھا بس کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔

امداد علی خاں۔ وہ تو فقرہ بازی کر رہا تھا۔ بھلا کوئی بات ہے مس شکیلہ اور اس بوڑھے پر عاشق ہوں۔ دیکھو نا۔ آخر وہی ہوا جو میں کہتا تھا۔

عاشق علی خاں۔ ہائے اس عشق کا بُرا ہو۔ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔ اب تو میں ہوں اور تصور جاناں۔ دیکھئے کب دیدار نصیب ہوتا ہے۔

عجب کچھ لوٹ پھیر اس عشق کی منزل میں رکھا ہے
اُسی میں دل پڑا رہتا ہے جس کو دل میں رکھا ہے
تڑپتا ہوں مزے لیتا ہوں یا رب شکر ہے تیرا
علاجِ دردِ دل بھی تو نے دردِ دل میں رکھا ہے

امداد علی خاں۔ رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو۔ ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے۔

منظر بند پردا گرتا ہے

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر۔ ذوالفقار علیخاں کا گھر

کریم خاں۔ (آتے ہوئے گاتا ہے) پن گھٹوا پہ مورے نجر لاگی۔ نجر لاگی رے نجر لاگی۔ پن گھٹوا پہ مورے۔ ارے بھائی نور خاں۔ نور خاں۔ واہ وا۔ یہاں تو آج بھیروں ناچ رہا ہے۔

مبارک ۔ کون ہے۔ کون ہے۔

کریم خاں۔ میں ہوں کریم خاں۔

مبارک ۔ کیا کام ہے ۔ کہاں سے آئے ہو ۔

کریم خاں ۔ (سر کھجلا کر اور اِدھر اُدھر دیکھ کر) ایک خط دینا ہے ۔

مبارک ۔ کس کے نام کا ہے ۔

کریم خاں ۔ اب یہ مجھے کیا معلوم ۔ نور خاں کو دینا تھا ۔ مگر لفافے میں خوشبو آ رہی ہے کوئی دس روپے تولہ کا عطر پڑا مہک رہا ہے ۔

اندر سے ۔ اچھا ۔ ہاں ۔ لاؤ ۔ لاؤ ۔

کریم خاں خط دیتا ہے اُسی وقت نور خاں اور ذوالفقار علیخاں دروازے پر پہنچ جاتے ہیں ۔

ذوالفقار علیخاں ۔ ابے تو کون ہے اور یہ دروازے کے پاس کیا کر رہا تھا ۔ یہ دیکھئے ہم ذرا ٹلے اور کوئی نہ کوئی موجود ۔ نا صاحب یوں کام نہ چلے گا ۔

کریم خاں ہکا بکا ہو کر دیکھتا ہے ۔

کریم خاں ۔ میاں میں مرغی لینے آیا تھا ۔

ذوالفقار علیخاں ۔ ابے مرغی کے بچے اب صاف صاف بتا نہیں تو ذبح کر کے رکھدونگا ۔

نور خاں ۔ میاں یہ پاگل خانے سے بھاگ کے آیا ہے ۔

ذوالفقار علیخاں ۔ بھلا پاگل اس کو کون کہے گا یہ تو بھلا چنگا ہے ۔

نور خاں ۔ میں سمجھ گیا ہو نہ ہو یہ بہروپیا ہے ۔ انعام مانگے گا ۔ میاں

ذوالفقار علیخاں ۔ میں ابھی قبلو ائے لیتا ہوں ۔

نور خاں ۔ اہا ہا ۔ ارے اب میں نے پہچانا ۔ یہ شہزادے کا طبلچی ہے حضور کھچڑی لینے آیا ہوگا ۔

کریم خاں۔ واہ۔نور بھائی۔ سیکڑوں سُنادیں۔ پاگل واگل۔ طبلچی اور کیا اور کیا۔
بھلا یہ کیا بات ہے۔

نور خاں۔ شاہی میں باپ دادا جمعدار تھے۔ بھلے مانس ہم کو نور خاں کہتے ہیں
یہ نور بھائی کون جُلاہا۔ چرکٹا ہے۔

کریم خاں۔ لو اور سنو ہم تو بھائی بنائیں اور یہ ہم کو جا بیجا سنائیں۔ خط کے لئے
آئے تھے اندر دے دیا۔ ہم اپنے جا رہے تھے کہ میاں برس پڑے۔

ذوالفقار علیخاں۔ یہ دیکھئے۔ خط دوڑنے لگے۔ تو کہاں سے خط لایا تھا اور کس کے نام کا۔

کریم خاں۔ عاشق علی میاں نے خط بھیجا تھا۔

ذوالفقار علیخاں۔ اچھا اب رنگ لائی گلہری۔ ان صاحبزادے کی شامت آئی ہے۔
میں سیدھا نہ کردوں تو پٹھان نہیں چمار ہوں۔

مبارک۔ نور خاں۔ بی بی بہت خفا ہیں یہ خط کون لایا ہے اُسی کو واپس کردو
بی بی کہتی ہیں کہ خبردار ایسے خط اندر نہ لایا کرو۔

ذوالفقار علیخاں۔ واہ۔وا۔ بیوی ہو تو ایسی ہو۔ ایسی ہی پاکدامنوں سے دنیا قائم ہے
نہیں تو آج قیامت آجائے۔ خدا جانے میں نے کونسی نیکی کی تھی
جو ایسی عفیفہ بیوی ملی۔ میں اگر اس کے پیر دھو دھو کے پیوں تو بھی
اس کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

جینا بھی آگیا مجھے مرنا بھی آگیا
پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

نور خاں مبارک سے خط لے کر کریم خاں کو دیتا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ نہیں۔ یہ خط مجھے دو میں لے جاؤں گا۔

مبارک۔ سرکار۔ بی بی کہتی ہیں کہ بھائی صاحب آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ اب وہ مجھ کو بھائی صاحب نہ کہیں۔ میں اُن کا جاں نثار عاشق ہوں۔
میں صاحبزادے کو خط واپس کر کے ٹھکانے سے سمجھا دوں گا۔

اندرسے ۔ دیکھئے کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ مجھے خلجان ہو رہا ہے۔ یہ خط آپ
بچڑا دیجئے۔ بس وہ اپنا سا منہ لے کے رہ جائیں گے۔

ذوالفقار علیخاں۔ جانِ من۔ تمہارا اشارہ ہو تو میں رستم خاں سے بھڑ جاؤں اور انجر پنجر
ڈھیلے کر دوں مگر یہ کوئی لڑنے کا موقع ہے۔ بس میں نے خط دیا۔ دو چار
باتیں نصیحت کی کہیں اور چلا آیا۔

خوبصورت یوں تو بہتیرے ہیں لیکن پارسا
نازنینِ نازک کمر۔ ایسی نہیں۔ ایسی نہیں

اندرسے ۔ یا اللہ۔ یہ پاک محبت کی سازش ہے اس کو بارور کر۔ تو نے حضرت یوسف
کو حضرت یعقوب سے ملایا۔ بلقیس کو شہر سبا سے حضرت سلیمان کے پاس
کھینچ بلایا۔ تیری بڑی قدرت ہے۔

ذوالفقار علی خاں خط لے کر چلا جاتا ہے۔

نورجہاں۔ بی بی۔

اندرسے۔ تم مدرسے جا کر جمیلہ بانو کو بلا لاؤ۔ دیکھو۔ کہیں راستے میں نہ رہ جانا
اور کہنا بی بی کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ جلدی بلایا ہے

نورجہاں۔ ابھی گیا۔ ابھی۔

یا اللہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کلجگ ہے کلجگ اس میں جو ہو سو کم ہے

دوسرا ایکٹ

دوسرا منظر۔ عاشق علی خاں کا گھر

ذوالفقار علیخاں (راستے میں) اگر شکیلہ کی جگہ جمیلہ ہوتیں تو اس جوان پر پھسل جاتیں خط کو آنکھوں سے لگاتیں۔ کلیجے میں رکھتیں۔ مگر واہ رے میں۔ دو دن میں ایسا نقشہ جمایا کہ میری عاشق ہو گئی۔ اور بھلا اس عصمت کا ٹھکانا ہے کہ یہ خط بغیر دیکھے واپس۔ اوہو۔ اب آزاد علی خاں کی خبر لوں گا کہ دیکھو مردانِ عالم معشوقانِ نوخیز کو یوں راہ پر لاتے ہیں۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلےٰ مرے آگے

عاشق علی خاں کو دیکھ کر۔

ذوالفقار علیخاں۔ ذوالفقار علی خاں اپنے رقیب خام کار و کم عیار کی خدمت میں تسلیم عرض کرتا ہے۔ صاحبزادے۔ زہر کھا لو غیرت والے ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ تو شکیلہ بانو نے تمہارا خط بغیر پڑھے واپس کر دیا۔ کہو شرمائے تو نہ ہو گے۔

عاشق علی خاں خط پڑھ رہے ہیں اور ذوالفقار علی خاں امداد علی خاں سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں۔

جناب معشوقوں پر قابو پانا کارے دارد۔ برسوں ریاضت

کی ہے جب کہیں یہ بات حاصل ہوئی ہے کہ جس کو نظر بھر کے دیکھ لیا
بس ہمارا دم بھرنے لگا۔ اب انہیں شکیلہ بانو کو لیجئے۔ کہ میرا کلمہ پڑھ
رہی ہیں۔ تو کاہے سے کہ ہم نے پہلے ہی رعب ڈال دیا اور حکم دیدیا
کہ خبردار کسی کی طرف نظر نہ اٹھانا۔ گھر سے قدم باہر نہ نکالنا۔ بس اب
کیا مجال کہ کسی کا رنگ جمے اور ایک وہ ہیں ہمارے برادر عزیز
آزاد علی خاں کہ جمیلہ بانو کے اشارے پر ناچتے ہیں۔

عاشق علی خاں۔ (خط پڑھ کر) خاں صاحب۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ اور
صدق دل سے معافی چاہتا ہوں۔ حقیقت میں ایک بڑی غلط فہمی
ہوئی میں مس جمیلہ کو مس شکیلہ سمجھا۔ کمپنی باغ میں ملاقات ہوئی
تھی مجھ سے ان سے وعدہ بھی ہو گیا تھا اسی بھرے پر
میں خط لکھ بیٹھا۔ کوئی اور ہوتا تو میں مقابلہ بھی کرتا۔ مگر آپ کے
سامنے کسی کا عہدہ برا ہونا معلوم ماشاءاللہ وجاہت۔ لیاقت
فصاحت۔ بلاغت۔ بانک۔ بنوٹ۔ شاعری۔ موسیقی۔ ایسے
وحیدالعصر کا حریف کون ہو سکتا ہے۔ آپ جس کے عاشق ہوں وہ
کیوں نہ ناز کرے۔

ذوالفقار علیخاں۔ عمرت دراز باد۔ بس آپ نے سچی سچی کہدی اور ہم خوش ہو گئے۔
حقیقت میں ہمارے آگے کون ٹھہر سکتا ہے۔

عاشق علیخاں۔ کیا کہنا ہے ماشاءاللہ۔ تو مجھے آپ صدق دل سے معاف کر دیجئے۔

ذوالفقار علیخاں۔ اس میں آپ کی کیا خطا ہے۔ آپ شکیلہ کو جمیلہ سمجھ بیٹھے۔

عاشق علی خاں۔ واقعی میں بہت نادم ہوں۔ اور وہ آپ کی عاشق ہیں جبھی تو خط بغیر کھولے واپس کر دیا۔ واہ ری محبت۔ آجکل ایسے عاشق نواز معشوق لاکھوں میں ایک آدھ ہوں تو ہوں۔

ذوالفقار علیخاں۔ بجا ارشاد مگر جناب میرے جیسے عاشق بھی کروڑ دو کروڑ میں ایک ہی آدھ نکلیں گے۔

عاشق علیخاں۔ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مگر جناب میری بھی ایک درخواست ہے جہاں آپ نے اتنی عنایت فرمائی ہے وہاں مس جمیلہ سے میری شادی بھی کرا دیجئے میں تمام عمر آپ کا ممنون رہوں گا۔

ذوالفقار علیخاں۔ یہ تو بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اور جب مس جمیلہ راضی ہیں تو پھر کیا آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لائیے۔

عاشق علیخاں۔ میں تھوڑی دیر میں حاضر ہوتا ہوں اور مکرر آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے مس شکیلہ کو خط لکھا۔

ذوالفقار علیخاں۔ اجی کوئی بات نہیں۔ اور وہ تو میری عاشق زار ہے اگر دارا و جمشید بھی آئیں تو میرے مقابلے میں زک کھائیں۔

فلک نے ہیں کے سُرما بنا دیا ہم کو
مگر حسینوں کی نظروں میں ہیں سمائے ہوئے

(ذوالفقار علی خاں چلے جاتے ہیں)

امداد علی خاں۔ بس دیکھ لی تمہاری عاشقی۔ تھو ہے تمہاری اوقات پہ۔ شرم نہیں آتی ایک بوڑھے کے مقابلے میں چیں بول گئے۔ ارادے کے ایسے

کچے اور دل کے بودے تھے تو تم نے ایک شریف لڑکی کو دھوکا
کیوں دیا۔

عاشق علی خاں۔ سنئے جناب۔ خواہی نہ خواہی آپے سے باہر کیوں ہوئے جاتے ہیں۔

امداد علی خاں۔ بس میں کچھ نہیں سنتا۔ اب باتیں بنائیں گے۔ آج سے ہماری اور آپ کی
دوستی ختم۔ خدا حافظ۔

عاشق علی خاں۔ بس کا تا اور لے دوڑی۔ اجی یہ بھی اک چال ہے۔ ذرا یہ خط تو پڑھو

امداد علی خاں۔ یہ تو وہی تمہارا خط ہے اس کو کیا خاک پڑھوں۔

عاشق علی خاں۔ واللہ اس ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ میرے دل میں شکیلہ کی قدر
و منزلت دس گنی ہو گئی۔ یہ خط میرا نہیں ہے جناب مس شکیلہ نے
اس ترکیب سے میرے خط کا جواب دیا ہے۔ پڑھئے۔

امداد علی خاں خط پڑھتا ہے۔

جنابِ من۔ آپ کی مراسلت کا حال ذوالفقار علی خاں
پر کھل گیا۔ آپ کے ملازم نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ میں نے بات
بنائی اور اُن کو ٹھنڈا کیا۔ آپ بھی ان کی تعریف کر دیجئے
آدمی ہیں بیوقوف بھڑک نکل جائیگی۔ اب آپ جمیلہ بانو کے
عاشق بنکر آیئے۔ شاید اس ترکیب سے دل کی مراد حاصل ہو۔
یہ میری رہائی کی آخری تدبیر ہے کارگر ہوئی تو میں آپ
کی کنیز بنوں گی اور اگر اُلٹی پڑی تو جان دینا تو اپنے ہاتھ
میں ہے۔ آپ صبر کر لیجئے گا۔ آپ کو مجھ جیسی بہت مل رہیں گی۔
بدنصیب۔ شکیلہ

افوہ۔ عورت ہو کے یہ فراست بھائی۔ مس شکیلہ کا بایاں قدم
لے۔ کمال کیا۔ تمہارے رقیب کے ہاتھ سے یہ خط بھجوایا۔ واہ۔ وا
اب جلدی کیجئے۔

عاشق علیخاں۔ فلک نہ دور رکھ اس سے کہ ایک میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

منظر بند پر دا گرتا ہے

دوسرا ایکٹ

آخری منظر۔ ذوالفقار علیخاں کا گھر

ذوالفقار علیخاں۔ (ہانپتے کانپتے) نور خاں۔ نور خاں۔ ابے کہاں مر گیا۔ یہاں لاکھوں
مہمّیں درپیش ہیں اور تو ہے کہ مشٹ مارے پڑا رہتا ہے۔

نور خاں۔ تو میاں بول تو رہا ہوں۔ مگر آپ سنتے کب ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ ہات تیرے کی۔ وہ مارا بڑے آزادی خاں کی دُم بنے پھرتے تھے۔
دیکھا آخر بی بنو نے عاشق پیدا کر لئے۔ ہوں مجھسے زبان لڑاتے تھے۔
میں نے تو کہہ دیا تھا کہ بی بنو نکل جائیں گی۔ اب صاحبزادے کی
آنکھیں کھلیں گی۔

نور خاں۔ میاں میں نے بھی جنوتی دی تھی۔ مگر میاں معاملہ کیا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ اب دخل درمعقولات نہ کر۔ جا۔ جلدی سے چھوٹے میاں کو بُلا لا۔ اور
چھوٹی بی بی کو بھی۔

نور خاں ۔ وہ تو ابھی ابھی آئیں گھر ہی میں ہیں۔

ذوالفقار علیخاں ۔ تو بس ٹھیک ہے ۔ اب تم آزاد علی خاں کو بلا لاؤ ۔ اور جاتے جاتے پہلے قاضی صاحب کو بھیج دو ۔ کہنا ذرا یہاں تک تکلیف کریں۔

نور خاں ۔ کیا کہا میاں قاضی صاحب ۔ قاضی صاحب کا ابھی یہاں کیا کام ہے

ذوالفقار علیخاں ۔ تو ٹکے کا نوکر ان باتوں کو کیا جانے ۔ بس جلدی جا ۔

نور خاں چلا جاتا ہے ۔

ذوالفقار علیخاں ۔ آج اس کی آزادی کے غرور کو خاک میں نہ ملا دوں تو سہی ۔ ہوں کیا تقریریں چھانٹتے تھے کہ لڑکیوں کو آزادی دو سیر و تفریح کے لئے بھیجو ۔ جبر نہ کرو ۔ یہ ظلم ہے ۔ لو میاں ۔ اب تم نئی تہذیب کو بیٹھ کے چاٹو ۔ ابھی ابھی تمہاری تعلیم و آزادی کا نشہ ہرن ہوتا ہے ۔ بچّا ۔ ہم کو نصیحت کرتے تھے ۔ ابھی کھلتا ہے کہ کون جہاندیدہ اور تجربہ کار ہے اور کون سادہ لوح و خام کار ہے ۔

پردے کے پاس جا کر ۔ ذری یہاں تک آنا ۔

اندر سے ۔ فرمائیے ۔

ذوالفقار علیخاں ۔ اجی ۔ میں نے وہ خط پکڑا دیا ۔ بس کٹ گیا ۔ کاٹو تو لہو نہیں ۔ اور اس قدر معافیاں مانگیں ہیں کہ باید و شاید اور کہنے لگے میری کیا مجال جو آپ کا رقیب بنوں ۔ وہ تو اُن کو بڑا دھوکا ہوا ۔ اجی ۔ وہ عاشق ہیں جمیلہ بانو کے اور ان سے قول و قرار بھی ہو گیا ہے ۔ وہ تم کو جمیلہ بانو سمجھے ۔ میں نے اُن کو بلایا ہے ۔ اب آئے کہ آئے ۔ اور قاضی صاحب

بھی آتے ہی ہوں گے۔ بس ابھی دونوں کا نکاح اس طرح ہو جائے
کہ آزاد علی خاں کو خبر بھی نہ ہو۔ میں چھوٹے میاں کو باتوں میں لگاؤنگا
اور قاضی نکاح پڑھا دیں گے۔ اس کے بعد میں آزاد علی خاں کو جھک کے
سات سلام کروں گا۔ اور پھر اس کے بعد ہماری تمہاری شادی
اس دھوم سے ہو کہ چشم فلک نے بھی کبھی نہ دیکھی ہو۔ مہندی۔ ساچق
بری برات۔ تخت گھوڑے۔ ہاتھی۔ آتش بازی۔ ناچ۔ گانا۔ میں
دل کھول کے اپنی حسرتیں نکالوں گا۔

اندر سے۔ بس دیکھئے ہم سے یہ چھیڑ خانی نہ کیجئے۔

عاشق علی خاں - امداد علی خاں اور کریم خاں داخل ہوتے ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ آیئے حضرت۔ تشریف لایئے۔ جو بات کہی کر کے دکھا دی۔ دیکھئے
ابھی آپ کا نکاح ہونا ہے مگر یار جلسہ ضرور رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوی
پا کے مکر جاؤ۔

امداد علیخاں۔ ضرور۔ ضرور۔

عاشق علیخاں۔ یا اللہ رحم کر۔ بڑا نازک معاملہ ہے۔

قاضی صاحب آتے ہیں۔

ذوالفقار علیخاں۔ آیئے قبلہ۔ ذرا نکاح نامے کی خانہ پُری تو کرا لیجئے۔ یہ کام ذرا جھٹ پٹ میں
ہوا اس لئے آپ کو اطلاع وقت ہی پر کی گئی۔

قاضی صاحب عاشق علی خاں سے نکاح نامے کی خانہ پُری کراتے ہیں

آزاد علی خاں آتے ہیں۔

ذوالفقار علیخاں - آؤ میاں آزاد علی خاں - کہو سب خیریت تو ہے۔

آزاد علی خاں - بھائی صاحب خیریت تو مجھے پوچھنی چاہئے کہئے مس شکیلہ کا مزاج کیسا ہے - جمیلہ بانو بھی تو آئی ہیں۔

ذوالفقار علیخاں - اجی اُن کا مزاج تو اچھا ہے - آپ اپنی کہئے - وہ آزادی کی ہوا دماغ سے نکلی یا نہیں۔

آزاد علی خاں - (اِدھر اُدھر دیکھ کر) ہیں یہ کون صاحب ہیں اور یہ قاضی صاحب کیوں آئے۔

ذوالفقار علیخاں - اجی آج یہاں شادی ہے - شادی۔

آزاد علیخاں - یہ کس کی شادی ہے۔

ذوالفقار علیخاں - یہ نوشہ کیا سامنے بیٹھے ہیں یہی - عاشق علی خاں صاحب - ان کا نکاح ہے آج - ہم اور آپ وکیل اور گواہ ہیں لیجئے نکاح نامے پر دستخط کیجئے۔

آزاد علی خاں - ہائیں - نکاح - اور میں دستخط کروں - کیا - مگر معلوم تو ہو کہ کس کا نکاح ہے - دولہن کون ہیں۔

ذوالفقار علیخاں - اجی بس - شکیلہ بانو اور جمیلہ بانو میں سے کسی ایک کا نکاح ہے - آپ تو کہہ رہے تھے کہ ان کو اختیار رہے جس کے ساتھ جی چاہے شادی کریں تو قول مرداں جان دارد - اب آپ نکلے کیوں جا رہے ہیں۔

آزاد علی خاں - میں اب بھی یہی کہتا ہوں لیکن جمیلہ بانو کو مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی - میں نے تو اُن کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے - اور لیجئے

یہ میرے دستخط ہیں۔اُن کو اختیار ہے جس کے ساتھ جی چاہے شادی کریں۔مگر اس بات کا رنج ضرور ہے کہ انھوں نے مجھسے چھپایا۔

ذوالفقارعلیخاں۔(اپنے دستخط کرکے) اجی صاحبزادے تم ان باتوں کو کیا جانو۔سیکڑوں ٹھوکریں کھاؤگے جب کہیں جا کے تجربہ ہوگا۔ یہ بی اے کا امتحان نہیں ہے۔کہ چار کتابیں رٹ لیں اور ڈگری مل گئی۔میاں عشق و محبت کی راہیں اُس وقت سمجھ میں آئیں گی جب ہمارے سامنے زانوے ادب تہ کروگے۔

آزادعلیخاں۔ میرا دماغ پریشان ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

آزاد علی خاں اور ذوالفقار علی خاں اندر جاتے ہیں۔امدادعلیخاں قاضی صاحب کو دولہن کا نام بتاتے ہیں۔

آزاد علی خاں اور ذوالفقار علی خاں واپس آکر قاضی صاحب سے کہتے ہیں کہ ہاں نکاح پڑھائیے۔

ذوالفقار علی خاں آزاد علی خاں کو باتوں میں لگاتے ہیں اور اُدھر قاضی صاحب ایجاب وقبول کراتے ہیں۔

ذوالفقارعلیخاں۔ارے میاں تم کو فرصت ہے۔اب دو چار دن میں ہماری شادی ہے۔پھر دوبارہ تو زندہ ہونا نہیں ہے۔میرا ارادہ ہے کہ یہ شادی دھوم سے کروں انتظام تم کو کرنا پڑے گا۔

امداد علی خاں۔عاشق علی صاحب۔مبارک ہو۔مبارک۔دیکھئے یاروں کا جلسہ ضرور ہو۔

عاشق علیخاں۔ یہ کامیابی آپ کی مخلصانہ امداد کی وجہ سے نصیب ہوئی۔

کریم خاں اور نور خاں گاتے ہیں (بنو کو لاؤں گی میں تاروں کی چھاؤں میں۔ تاروں کی چھاؤں میں)

ذوالفقار علیخاں۔ (آزاد علی خاں سے) آداب بجالاتا ہوں۔ آپ نے آزادی کا نتیجہ دیکھا۔

آزاد علی خاں۔ مگر نکاح تو شکیلہ بانو کا ہوا ہے۔

ذوالفقار علیخاں۔ کہیں ہوا نہ ہو۔ جمیلہ بانو کا۔

آزاد علی خاں۔ نہیں شکیلہ بانو کا۔

ذوالفقار علیخاں۔ قاضی صاحب آپ نے کس کا نکاح پڑھایا۔

قاضی صاحب۔ شکیلہ بانو بنت مشتاق علی مرحوم کا۔

ذوالفقار علیخاں۔ ہائے یہ کیا ہوا۔ ارے نور خاں۔ نور خاں

نور خاں۔ میاں۔ میاں۔

ذوالفقار علیخاں۔ نور خاں۔ میری کمر ٹوٹ گئی۔ میں غچّا کھا گیا۔

نور خاں۔ میاں مبارک، ہم کو بھی نیا جوڑا ملے حضور۔

ذوالفقار علیخاں۔ نور خاں۔ یہ کیا ہے۔

نور خاں۔ میاں یہ تریا چرتر ہے۔

صبوحی الست دے

از

مرزا متین احمد بیگ صاحب ثروش متعلم سال اوّل

فضائے لالہ زار ہے ترنم ہزار ہے
بہار رے نگار ہے شباب نوبہار ہے
نسیم مشکبار ہے گلوں کو افتخار ہے
وفورِ انبساط ہے نشاط ہی نشاط ہے
غروب آفتاب ہے گھرا ہوا سحاب ہے
سرور وکیف ہست دے
صبوحی الست دے

چھٹک رہی ہی چاندنی نظارہ ہے یہ دیدنی
شجر حجر کی سرخوشی چمن میں مست ہر کلی
دریچۂ فلک ہے وا ہے کوئی حورِ جلوہ زا
اُٹھا دیا نقاب کو دکھا دیا شباب کو
رُخِ عروس نور ہے قمر کا یا ظہور ہے
سرور وکیف ہست دے
صبوحی الست دے

ستارے ہیں چمک رہے کہ دُرِ حُسن ہیں جڑے

عروس کہکشاں بھی ہے	ہجوم میکشاں بھی ہے
رواں سرور کو بہ کو	الم چھپا رہا ہے رو
عجیب ہے طلسم زار	فضائے مست و پرخمار

سرور و کیف ہست دے
صبوحی الست دے

وہ شب کی انجمن نہیں	قمر بھی ضو فگن نہیں
سرودِ زندگی نہیں	الم نہیں خوشی نہیں
وہ جوش و ولولہ نہیں	وہ بزم مشغلہ نہیں
کھڑا ہوں ایک میں یہاں	پڑا ہے خواب میں جہاں
کسی کو کچھ خبر نہیں	یہ نیند چارہ گر نہیں

سرور و کیف ہست دے
صبوحی الست دے

چمن میں چومنے لگی	صبا گلاب کی کلی
کلی ہنسی تو گل ملا	کہ جیسے جام مل ملا
گری زمیں پہ ٹوٹ کر	ہنسی نہ راس تھی مگر
ہر ایک شے کو ہے زوال	خوشی کبھی کبھی ملال

سرور و کیف ہست دے
صبوحی الست دے

یہ غور کی ہے جا ذرا	یہ زیر و بم ہے کیا بلا

کدھر یہ کارواں چلا ہے یہ منزلِ مراد کیا
خوشی کی انجمن کہیں الم ہے دل شکن کہیں
پیامِ وصل ہے کبھی اسی سے فصل ہجر کبھی
کہیں چمن ہے گُل فشاں کہیں بہار پُر خزاں
ہے نور کا کہیں ایاغ تو گھر کہیں ہے بے چراغ

سرور و کیف ہست دے
صبوحی الست دے

غزل

از محبوب احمد صاحب ہجرؔ سابق متعلم عثمانیہ کالج اورنگ آباد

بہت مدت ہوئی دل بجھ گیا اے ہجرؔ یار اپنا
کریں ہم کس طرح صد حیف زندوں میں شمار اپنا

سمجھتے جب نہیں وہ تو نہ سمجھیں جاں نثار اپنا
ہے رونا یہ اجل پر بھی نہیں ہے اختیار اپنا

اگر کچھ دن یہی حالت رہی بے صبریٔ دل کی
نکل جائے گا دم اے آرزوئے وصلِ یار اپنا

سرِ تربت چراغِ ضو فشاں کی اب ہے کیا حاجت
کہ ہے داغِ جگر سے خوب ہی روشن مزار اپنا

گُلوں کو دیکھ کر کیا گُل بداماں کی حسرت ہو
کہ ہے جوشِ جنوں میں حیف دامن تار تار اپنا

ہماری قدر تجھ کو ہوگی لیکن ہائے کب ہوگی
کہ ہوگا کالبد جس دن تہِ خاکِ مزار اپنا

اِدھر آؤ متاعِ زندگی کو لوٹنے والے
کہ تجھ سے مل کے کر دے ختم ہجرؔ اب انتظار اپنا

اورنگ آباد کالج کے قدیم طلبا

(ادارت نورس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اورنگ آباد کالج کے قدیم طلبا کے حالات وقتاً فوقتاً پیش کئے جائیں تاکہ موجودہ طلبا پرانی برادری سے آشنا رہیں۔ مندرجہ ذیل حالات مولوی سید احمد صاحب نے خود روانہ فرمائے ہیں اور انہیں سے ہم اس سلسلہ کی ابتدا کرتے ہیں)

(ضروری سنیں اور مختصر کارنامے)

تاریخ پیدائش	چہارشنبہ، ۳ آبان ۱۲۹۷ف
وطن	تعلقہ پٹن ضلع اورنگ آباد
ابتدائی تعلیم	" " " " "
وسطانی تعلیم	مڈل اسکول اورنگ آباد
ثانوی تعلیم	ہائی اسکول اورنگ آباد
ابتدائی صنعتی تعلیم	مدرسہ صنعت وحرفت اورنگ آباد
اعلیٰ صنعتی تعلیم	سر جے۔ جے اسکول آف آرٹ بمبئی

تاریخ ابتدائے ملازمت ۲۶؍فروری ۱۸ف ڈرائنر محکمۂ جیل سررشتۂ پولیس

تنخواہ (۵۰)

اس کے بعد سررشتۂ تعلیمات میں بحیثیت ڈرائنگ ماسٹر مدرسہ صنعت وحرفت نظام آباد پر متعین کیا گیا۔

ترقی بحیثیت ہیڈ ڈرائنگ ماسٹر مدرسہ صنعت وحرفت اورنگ آباد ۱۳۲۰ف

ترقی بحیثیت منصرم مہتمم مدرسہ صنعت وحرفت اورنگ آباد ۱۳۲۲ف

تبادلہ ہیڈ ڈرائنگ ماسٹر ہائی اسکول اورنگ آباد (اسپیشل ڈیوٹی) ۱۳۲۳ف

تبادلہ بہ ترقی محکمہ آثار قدیمہ اجنٹہ بحیثیت محافظ غار ہائے اجنٹہ ۱۳۲۵ف

اس کے بعد ترقی بہ حیثیت مہتمم آثار قدیمہ (اجنٹہ)

موجودہ تنخواہ (۱۳۵ماہ ۱۷۵ ؟)

میرا قدیم وطن پٹن ضلع اورنگ آباد ہے۔ میرے جدّا مجد دہلی سے ابتدا میں بسلسلۂ ملازمت دکن آئے۔ ہمارے سلسلہ کے بزرگ حضرت سید سادات سید نظام الدین صاحب چشتی رح پہلے خلد آباد، اس کے بعد پٹن میں آباد ہوگئے اور یہیں مقام فرمایا۔ چنانچہ وہی سلسلہ اب تک قائم ہے۔

میرا مولد پٹن ہے۔ میری ابتدائی تعلیم پٹن اور اورنگ آباد مڈل اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے صنعتی تعلیم مدرسہ صنعت وحرفت اورنگ آباد میں حاصل کی۔ بعدہٗ ڈرائنگ، آرکیٹکی اور پنٹینگ کے لئے بمبئی اسکول آف آرٹ میں (۵) سال تک زیر تعلیم رہا۔ بعد فراغتِ تعلیم ابتدائی تقرر حیدرآباد اور پھر نظام آباد کے مدرسہ صنعت وحرفت میں ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں لندن سے لیڈی ہیرنگم غار ہائے اجنٹہ کے فریسکوز کی نقل بنانے تشریف لائیں۔ ہندوستان کے تمام معروف اسکول آف آرٹ سے ان کی مدد کے لئے پانچ اشخاص منتخب کئے گئے۔ بمبئی اسکول آف آرٹ اور حیدرآباد سے اس نیازمند کو اسی سلسلہ میں بھیجا گیا۔ چنانچہ دو سال تک میں لیڈی ہیرنگم کے مددگار کی حیثیت سے اجنٹہ میں کارگذار رہا۔ لیڈی ہیرنگم

کے ساتھ حسب ذیل نوجوان مصور بھی تھے: مسٹر نندلال بوس، مسٹر الینٹ کمار، ہالدار، مسٹر گپتا، مس لارجر۔ جب ہم سب اجنٹہ پہنچے تو لیڈی ہیرنگم نے حکم دیا کہ ہم سب غاروں میں جائیں اور اپنی پسند سے ایک ایک سبجکٹ منتخب کرلیں چنانچہ ہم سب بہ یک وقت غاروں میں پہنچے لیکن انتخاب میں بڑی دقت پیش آئی۔ ہر شخص نے آسان اور روشن مورتیاں پسند کرلیں۔ شام میں کھانے کے میز پر لیڈی ہیرنگم نے ہر ایک سے اس کے منتخبہ سبجکٹ کے متعلق دریافت کیا تو ہر ایک نے اپنا اپنا انتخاب پیش کردیا۔ جب مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے بیان کیا کہ جو کام باقی رہ گیا ہے وہ میں کروں گا۔ میرے اس جواب پر صاحبہ موصوفہ بہت خوش ہوئیں۔ لیکن دوسرے دن جب غار نمبر ۱ میں پہنچے اور وہاں مجھے یہ بتلایا گیا کہ "یودھی ستوا بدما پانی"، جو ایک دقیق اور بلحاظ فن نہایت دشوار مورتی ہے، بنانا ہے تو ہوش اُڑ گئے۔ خیر کام شروع کیا اور جوں توں ختم بھی کرلیا۔ خوش قسمتی سے لیڈی صاحبہ نے اُسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا ــــ اس کامیابی نے مجھے اُس راز سے آگاہ کیا جس کے باعث آخر میں اجنٹہ کے فرسیکوز کو سمجھنے میں مجھے کافی مدد ملی۔

اس کے بعد میرا تبادلہ نظام آباد سے اورنگ آباد کے مدرسۂ صنعت و حرفت کی ہیڈ ڈرائنگ ماسٹری پر ہوگیا۔ چند روز کے بعد میرا منصرمانہ تقرر خدمت مہتممی مدرسہ صنعت و حرفت پر عمل میں آیا۔ اس کے بعد میں نے سررشتۂ تعلیمات کو چھوڑ دینے کا قطعی ارادہ کرلیا۔ اسی دوران میں ناظم صاحب تعلیمات نے مجھے اورنگ آباد ہائی اسکول میں اسپیشل ڈیوٹی پر روانہ کردیا۔ اس کے بعد میں وظیفۂ تعلیمی کے لئے کوشاں رہا۔ تاکہ اورنٹیل آرٹ کی اسٹڈی کے لئے یورپ جاسکوں لیکن جنگ عظیم

کے چھڑ جانے کے باعث اس ارادہ کو ملتوی کرنا پڑا۔ عین اِسی زمانہ میں میرے قدیم محسن مولوی عبدالحق صاحب اور میرے عزیز مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم معتمد فینانس کے مفید مشورہ سے میں نے نئی جائداد محافظی غارہائے اجنٹہ کو قبول کیا اور اجنٹہ پہنچ گیا۔

تھوڑے دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اجنٹہ آکر بڑی غلطی کی کیونکہ ابتدا میں مجھے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی باعث میں اجنٹہ سے بجید بیزار ہو گیا۔ اور ہر وقت وہاں سے بھاگ جانے کا خیال کرتا تھا ــــ جس طرح بودھ کے شاگرد اور سوتیلے بھائی نندا نے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ تارک الدنیا ہو کر خانقاہ میں رہے گا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ تنہائی کی تکلیف سے تنگ آکر خانقاہ سے فرار ہو گیا۔ بودھ نے اُس کو بُلوا کر ایسی نصیحت کی وہ ہمیشہ سنیاسی بنکر رہنے پر دوبارہ آمادہ ہو گیا اور اس پر عمل پیرا بھی رہا ــــ بالکل اسی طرح جب کہ میں اجنٹہ سے بیزار ہو چکا تھا مجھے مولوی عبدالحق صاحب نے نصیحت کی اور سرآرل اسٹارئن اور جاپانی آرٹسٹ پروفیسر ساورسورا نے ایسے مشورے دیئے کہ میں نے اجنٹہ چھوڑنے کے خیال کا بھی کبھی خیال نہیں کیا۔ علاوہ ازیں میرے محترم ناظم مولوی غلام یزدانی صاحب نے ہمیشہ میرے ساتھ مشفقانہ اور ہمدردانہ سلوک روا رکھا ــــ یہی چند وجوہات تھے جن کی بنا پر میں نے باوجود مختلف دقائق اجنٹہ میں سکونت اختیار کی۔

دو مرتبہ یہاں سے عجائب خانہ حیدرآباد کی مہتمی پر انصراماً تبادلہ ہوا لیکن پھر اسی جگہ واپس بھیجد یا گیا اور اس دوران میں جو ناچیز خدمت میں نے انجام دی

وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

احسان فراموشی کے مترادف نہ ہوگا اگر میں اپنے سچے محسن و محترم ہز ایکسلینسی رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر کا تذکرہ نہ کروں جنہوں نے ابتدا سے ہر وقت میری اعانت و ہمدردی فرمائی اور مجھے قابلِ کار بنا دیا۔ نواب صاحب ممدوح کی مساعی کے باعث اجنٹہ آج اس صورت میں نظر آرہا ہے ورنہ میری خدمت اُن کی امداد کے بغیر ناممکن تھی۔

خان بہادر سید احمد۔ مہتمم غارہائے اجنٹہ

غزل

جناب مدیر نورس

اپنا ہو کہ بیگانہ اُن کا نظر آتا ہے
پھر کیوں یہ من و تو کا جھگڑا نظر آتا ہے

آئینۂ ہستی میں اُلٹا نظر آتا ہے
کچھ بھی تو نہیں۔ لیکن، کیا کیا نظر آتا ہے

بگڑے ہوئے دل میں سب بگڑا نظر آتا ہے
اچھا ہو جو آئینہ اچھا نظر آتا ہے

آرام سے پہلو میں سوتا نظر آتا ہے
ہر تیر کلیجے کا ٹکڑا نظر آتا ہے

آغازِ محبّت وہ۔ انجامِ محبّت یہ
تب کیا نظر آتا تھا۔ اب کیا نظر آتا ہے

سیلابِ حوادث کے ڈوبے ہوئے کیا اچھلیں
ساحل بھی مصیبت میں دریا نظر آتا ہے

ٹوٹے ہوئے دل میں یہ جلووں کی فراوانی
بکھرا ہوا اک طورِ سینا نظر آتا ہے

آزار محبت کا پکا ہے بُرا لپکا
جو درد ملے دل کو تھوڑا نظر آتا ہے

یہ طبع رواں طیب۔ پردوں میں جھپکتی ہے
پانی بھی اندھیرے میں تارا نظر آتا ہے

آل انڈیا اورنگ آباد کالج ٹورنامنٹ

از مدیر نورس

الحمد للہ کہ دسمبر ۳۷ء کے آخری ہفتہ میں حسب دستور قدیم اورنگ آباد کالج آل انڈیا ٹورنامنٹ منعقد ہوا۔ اور اورنگ آباد کے ہر طبقہ کے تعاون اور امداد کی وجہ سے ہر طرح کامیاب رہا ہر شعبہ میں مختلف مقامات کی ٹیموں نے شرکت کی۔ مدارس فوقانیہ کے مقابلوں کا نیا شعبہ نہایت کامیاب رہا۔ اس سلسلہ میں ہم عالیجناب سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج۔ عالی جناب مولوی غلام ربانی صاحب پرنسپل چادرگھاٹ ہائی اسکول اور عالی جناب مولوی عبدالستار صاحب سبحانی پرنسپل دارالعلوم کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ صاحبان معزز نے اپنے ادارے کی ٹیموں کو ٹورنامنٹ کی شرکت کے لئے روانہ فرمایا جس کے لئے ہم نہایت ممنون ہیں۔

کرکیٹ کے آخری مقابلہ۔ ہاکی کے سیمی فائنل اور ٹینس سنگل کے فائنل میں تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد نے کھیل اور کھلاڑیوں کی تحسین کی۔ دوسری جنوری ۳۸ء کو عالیجناب مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد نے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت فرمائی۔

یہ ٹورنامنٹ بفضل خدا سال بہ سال ترقی کر رہا ہے۔ اس نے گزشتہ سولہ سال میں ورزشی کھیلوں کا غیر معمولی ذوق وشوق پیدا کر دیا ہے۔ صحت اور جسمانی تربیت کے علاوہ ورزشی کھیلوں کے مقابلوں سے "اسپورٹس مین شپ" پیدا ہوتی ہے۔ جس کو ہم انسانیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ دل و دماغ کی ایک خاص کیفیت ہے جو عقل۔ جذبات اور جسمانی تہیجات کے توازن سے پیدا ہوتی ہے اگر دنیا کی

طاقتور فوجیں اسلحہ سازی کے بجائے بین الاقوامی کھیلوں کی طرف توجہ کریں تو دنیا کی پرشور فضا سکون اور امن سے بدل سکتی ہے۔ خدا کرے ہمارے ہندوستانی نوجوانوں میں ورزشی کھیلوں کا شوق پیدا ہو تاکہ ہندوستان کی قومی صحت اور قومی سیرت میں خوشگوار انقلاب پیدا ہو۔ اور ہمارے نوجوان محبت۔ رواداری اور اتحاد سے زندگی کی مشکلات پر غالب آنا سیکھیں۔

تیراکی

از مسٹر رامچندر راؤ مددگار اورنگ آباد کالج

تیراکی کے معنی قدرتی طریقہ پر پانی کو ڈھکیلنے اور اس میں آگے بڑھنے کے ہیں۔ پانی کے اندر یا اوپر حرکت کرنے یا گزرنے کو تیرنا اور اس کے جاننے والے کو ہم تیراک کہتے ہیں۔

فن تیراکی زمانہ حجری (Stone Age) میں موجود تھا۔ اس زمانے کے لوگ اس کو اپنی روزمرہ زندگی کا جزو سمجھتے تھے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم بھی اس مفید شے کو جزو زندگی قرار دیں۔ اس فن کو ہر ملک میں قومیت کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ فرانسیسی اور جرمن لوگ اس کے مشعل بردار تھے۔ جہاں فوجی اپنے کپڑوں سمیت ہتھیاروں کو پکڑے ہوئے تیر کر ندیوں اور دریاؤں کو عبور کرنے کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

فرانسس لیبر (Francis Lieber) پہلا فرانسیسی شخص تھا جس نے جرمن اصولوں پر تیراکی کا پہلا اسکول کھولا۔ اس کی ۱۸۳۰ء کی ڈائری (روزنامچہ) میں یہ لکھا ہوا ہے کہ "۶ اگست ۱۸۳۰ء کو دو چھوٹے بچوں کو پانی میں ڈوبنے سے بچایا گیا"۔

اس فن کی ۱۸۳۷ء سے ۱۸۶۰ء تک جو قدر تھی وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ اس کی ضرورت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ آگے چل کر امریکیوں نے فن تیراکی اور بحری کارناموں کو بہت زیادہ بڑھایا جس کے لئے وہ تعریف کے مستحق ہیں۔

کیونکہ انھوں نے ہی سائنٹیفک اصولوں پر اس فن کو ترقی دی۔

پہلے زمانہ میں تیرنا سیکھنے کے لئے سخت سے سخت مصیبتوں میں مبتلا ہو کر تجربہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً غرق آب ہو کر، اس فن کے مختلف نامکمل اصولوں پر کاربند ہو کر، لیکن اب جبکہ اس فن کے سائنٹیفک اصول معلوم ہو چکے ہیں تو پھر ہم میں سے ہر شخص تیراک بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ اس فن کے بیحد فوائد ہیں۔ اور جدید طبعی تعلیم میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہو گئی ہے۔ تیراکی مرد اور عورت دونوں کی تعلیم کا ایک ضروری جزو ہے۔ مسٹر ال۔ ڈی۔ پی۔ ہینڈلے (Mr. L. D. P. Handly) کا بیان ہے کہ اس فن کی سب سے بڑی اہمیت اپنی جان اور دیگر مخلوق کی حفاظت ہے۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر مثلاً جارج۔ ایچ۔ کورسا (George, H. Corsa) اور سی۔ ایم۔ ڈینیل (C. M. Daniel) اس خیال میں متفق الرائے ہیں کہ یہ فن انسان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ چستی و چالاکی۔ یہ ایسا فن ہے کہ اس کا ماہر اس سے بہت ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس کی اہمیت طبّی نقطۂ نظر سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اور یہ ورزش جسمانی کی ایک بے نظیر مثال ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے:-

(۱) تیراکی پھیپھڑے کو قوت دیتی ہے۔ کیونکہ یہ گہرے سانس لینے سے روکتی ہے۔

(۲) تیراکی کمزوری کو دور کرتی ہے۔ اور رگوں کو قوت دیتی ہے۔ کیونکہ اس سے نیند فطری طریقہ سے آتی ہے۔

(۳) تیراکی ریڑھ کی ہڈی کو قوت دیتی ہے۔ اور سینے کو بڑھاتی ہے۔ کیونکہ یہ سر کو پیچھے کی جانب جھکاتی اور سینے کو آگے نکالتی ہے۔

(۴) تیراکی اعضائے رئیسہ کو طاقت پہنچاتی اور درست رکھتی ہے کیونکہ جسم ہمیشہ افقی حالت میں حرکت میں رہتا ہے۔

(۵) تیراکی کھلی ہوا، اور آفتاب کی روشنی میں جسم کو قوت دیتی ہے جلد پر گرمی اور ٹھنڈک کا اثر نہیں ہوتا اور بال بہت جلد سفید نہیں ہوتے۔

بہرحال تیراکی رگوں اور پٹھوں کی نشو و نما میں مدد دیتی ہے کسی کا یہ کہنا کہ "تیراک کے رگ و پٹھے نہیں ہوتے" بالکل سچ ہے کیونکہ تیراکی رگوں اور پٹھوں کو اس قدر نرم اور ان تھک بنا دیتی ہے جس سے وہ جس طرح اور جدھر چاہے آسانی اور جلدی سے حرکت کر سکتا ہے۔

فرصت کے وقت اس فن کو سیکھنا اور اس پر عمل کرنا ورزشی نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے تیراکی بہت زیادہ تازگی بخشنے والی ہے۔ ایک اچھے تیراک کو بہت زیادہ مسرت ہوتی ہے۔ یہ دونوں جنسوں اور ہر عمر کے تیراکوں کے لئے فائدہ بخش ہے۔ کم از کم پانچ سال کی عمر سے ۷۰ سال تک انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کھیل کے نقطۂ نظر سے یہ بہتر کھیل ہے۔ اگر ایک شخص کی طبیعت عمدہ غوطہ زنی، تیز غوطہ زنی اور پانی کے دیگر کھیلوں کی طرف مائل ہے تو ان میں سے کسی ایک پر عبور حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے فن تیراکی کے اصولوں پر اچھی طرح عمل کرنا سیکھے۔ کسی شخص کے ہر روز تھوڑی دیر تیرنے سے اس کی تیزی اور چستی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مسٹر ہینڈلے (Handly) کہتے ہیں کہ تیرنا کرتبوں کے غیر دلچسپ طریقوں کے مقابلے میں طبعی تعلیم کا اچھا ذریعہ ہے۔

تیراکی حکمتی نقطۂ نظر سے جسمانی شکل و صورت کی نشو و نما میں ویسی ہی مدد دیتی ہے

جیسے کوئی اور ورزش جسم کی ساخت میں۔ ورزش سے جس طرح جسمانی عیوب مثلاً چپٹے پاؤں اور کوزہ پشت وغیرہ دور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح تیرنا مفلوجوں کیلئے مفید ہے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ تیراکی آدمی کی جان بچانے کا ذریعہ ہے۔ ہم سب پانی کے قریب رہتے ہیں ہماری روزمرہ کی زندگی میں آئے دن ایسے مواقع آتے رہتے ہیں۔ جب جان خطرہ میں ہوتی ہے اس لئے ہمیں چاہئیے کہ فن تیراکی کو حاصل کریں۔ تیرنا سیکھ کر ہم محض اپنی ہی جان نہیں بچا سکتے بلکہ ہم ان لوگوں کی بھی جان غرق ہونے سے بچا سکتے ہیں، جو تیرنا نہیں جانتے۔

مسٹر ڈینیل (Mr. Daniel) کہتے ہیں کہ اگر ہر شخص تیرنا سیکھے تو وہ ڈوبنے سے بچ سکتا ہے تیراکی کے حسب ذیل مقاصد ہیں جو ہر انسان کے لئے لازمی ہیں۔

(ا) جان کی حفاظت۔

(ب) رگوں اور پٹھوں کا اتحاد عمل۔

(ج) جسمانی بناوٹ۔

(د) صحت کی درستی۔

(ر) سیاہ بالوں کی عمر میں زیادتی۔

(س) قوت برداشت، تیزی حسی اور ایثار کا پیدا ہونا۔

(ص) ہمت، خود پر بھروسہ، جوانمردی اور بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ۔

آلات تنفس

از جناب محمد عبدالصمد صاحب اہلکار کالج اورنگ آباد

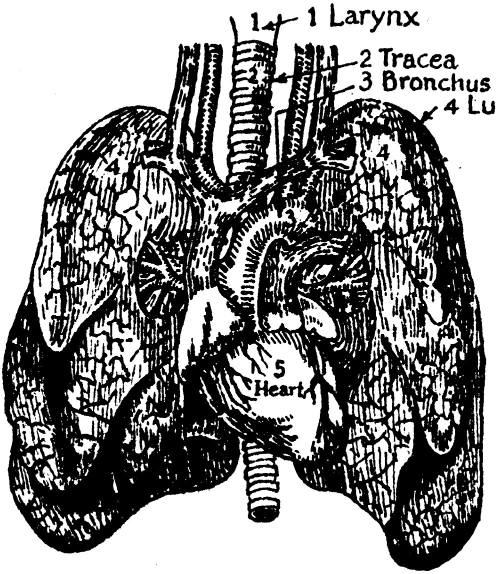

انسان، حیوان، درخت، کیڑے سب کے سب سانس لیتے ہیں۔ انسان ناک سے، درخت پتوں سے، کیڑے جسم سے، اور مچھلی گلپھڑوں کے ذریعہ پانی سے ہوا حاصل کرتی ہے۔ آلات تنفس جو شش (Lungs) یا پھیپھڑے کہلاتے ہیں۔ عالم بے ہوشی اور نیند میں بھی اپنا فعل برابر انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان کی حرکت بے اختیاری ہے جس کا تعلق نظام عصبی سے ہے۔ یہ صاف ہوا کے ذریعہ آکسیجن حاصل کرتے اور کثیف ہوا یعنی کاربانک ایسڈ گیس کو خارج کرتے ہیں۔

ہم جب سانس لیتے ہیں تو صاف ہوا ناک کے نتھنوں کے ذریعہ حلق کے نیچے پہنچکر ہوا کی نالی یعنی نرخرے (Tracea) میں داخل ہوتی ہے۔ جس کی لمبائی ۴ انچ سے زائد ہے (گلے میں سامنے جو چیز چھونے سے سخت سی محسوس ہوتی ہے وہی نرخرا ہے) یہ ایک لچکدار نلی ہے اس کے اختتام پر (جو اسٹرنم (Sternum)

یعنی سینے کی درمیانی ہڈی کے پیچھے ختم ہوتی ہے) دو شاخیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک جس کی لمبائی تقریباً ایک انچ ہے سیدھے شش میں اور دوسری جو ۲ انچ ہے بائیں شش میں داخل ہو جاتی ہے جن کو برانکس (Bronchus) کہتے ہیں۔ اور ان ہی کے ورم سے کھانسی کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ شش میں داخل ہونے کے بعد یہ نالیاں لاتعداد چھوٹی چھوٹی نالیوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور آخر میں چھوٹی چھوٹی تھیلیوں کی صورت میں ختم ہو جاتی ہیں۔ جن کو ایرسلز (Air cells) یعنی ہوائی خانے کہتے ہیں۔ جو سانس لیتے وقت ہوا سے ابھرتی اور پھولتی ہیں۔

خون جب فاسد اجزا کے ساتھ بذریعہ ورید (Vain) شش میں سے گزرتا ہے تو فاسد اجزا کو وہیں چھوڑ دیتا ہے اور آکسیجن حاصل کرتے ہوئے صاف ہو کر دل میں آتا ہے اور سانس کے چھوڑنے کے وقت یہ فاسد اجزا ر کاربانک ایسڈ گیس کی صورت میں جسم سے خارج ہوتے ہیں۔ تندرست انسان بالالتزام منٹ میں تقریباً ۱۸ مرتبہ سانس لیتا ہے اور اس دوران میں خون کی گردش شش کی حرکت سے ۴ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ یہ انتظام صرف صاف ہوا کے حاصل کرنے اور کثیف مادہ کے خارج کرنے کے لئے ہے۔ آلات تنفس کے باقاعدہ عمل ہی پر انسان کی تندرستی اور زندگی کا دارومدار ہے۔ پس ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ صحت و تندرستی کی خاطر آلات تنفس کو محفوظ اور باقاعدگی سے معمول رکھے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پاک و صاف ماحول میں سانس لیجائے لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شخص گرد و غبار اور کثیف فضا سے دور رہے اور اپنے مکان و رہائش گاہ کو پاک و صاف رکھے۔

آلات تنفس کی حفاظت کے لئے حسب ذیل چند ہدایات درج کی جاتی ہیں

جن پر عمل پیرا ہونا خالی از فائدہ نہیں۔

(۱) کھلی ہوا میں سیر و تفریح کرنا۔ کھیل کود میں حصہ لینا اور ورزش کرنا۔

(۲) گرد و غبار سے محفوظ رہنا چونکہ گرد و غبار میں اکثر امراض کے جراثیم شامل رہتے ہیں جو بذریعہ سانس شش تک پہنچکر طرح طرح کے امراض پیدا کرتے ہیں۔ اور اس قسم کی بے احتیاطی سے اکثر زکام۔ سل۔ دق۔ دمہ اور حلق وغیرہ کی دوسری شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۳) کھلے اور ہوادار مکانات میں رہنا۔ رہائش کے کمروں کو ہوادار رکھنا۔ غلاظت سے دور رکھنا۔ غلاظت از قسم تھوک وغیرہ سے بھی اکثر امراض کا اندیشہ رہتا ہے۔ جا بجا تھوکنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ متذکرہ صدر امراض (فقرہ نمبر۲) اکثر بذریعہ تھوک پھیلتے ہیں۔

(۴) سوتے وقت مُنہ کو کھلا رکھ کر سونا تاکہ صاف ہوا کے داخل ہونے اور کثیف مادہ کے جسم سے برآمد ہونے میں رُکاوٹ نہ ہو۔

(۵) صحیح راستے یعنی ناک سے سانس لینا۔ بعض اوقات کسی مرض کی وجہ سے اکثر لوگ بجائے ناک کے حلق سے سانس لیا کرتے ہیں۔ (کم عمر بچوں میں یہ شکایت زیادہ رہتی ہے) اور رفتہ رفتہ عادی ہو جاتے ہیں جو مضر صحت ہے۔ ناک میں بال ہوتے ہیں جو چھلنی کا کام کرتے ہیں۔ یہ گرد و غبار۔ جراثیم وغیرہ کی سانس کے لینے کے وقت روک تھام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ناک سے سانس لینے سے ہوا مرطوب ہو کر نرخرے کے ذریعہ شش میں داخل ہوتی ہے۔ منہ سے سانس لینے میں گرد و غبار و جراثیم وغیرہ کی رکاوٹ ناممکن ہے اور ہوا مرطوب

بھی نہیں ہو سکتی ۔ جس کی وجہ سے حلق اور اس کے غدود ٹانسلز (Tonsils) کے ورم (Tonsillitis) کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ جن کو اس قسم کی عادت ہے ان کو صحیح راستے یعنی ناک سے سانس لینے کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ اگر کسی قسم کی رکاوٹ یا تکلیف محسوس ہو تو تجربہ کار ڈاکٹر سے اس خصوص میں معالجہ کرانا سود مند ہوگا۔

(٦) تمباکو نوشی سے پرہیز کرنا۔ تمباکو میں ایک قسم کا زہر ہوتا ہے جس کو نکوٹین کہتے ہیں جو سم قاتل ہے۔ تمباکو کے استعمال سے ناک اور حلق میں ورم پیدا ہوتا ہے۔ شش اور آلات تنفس خراب ہو جاتے ہیں اور اپنا فعل پوری طرح انجام نہیں دے سکتے۔ اور سانس کی رفتار گھٹ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے خون بھی پوری طرح صاف نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں تمباکو کا جوہر یعنی نکوٹین خون میں شریک ہو کر دل اور معدہ کو بھی رفتہ رفتہ خراب کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ نہ صرف خون، دل اور معدہ کو خراب کرتا ہے بلکہ تمام اعضا کی قوت کو پائمال۔ اعصاب کو سست اور جسمانی نشو و نما میں حائل ہوتا ہے۔ اس کا استعمال نہ صرف مضر صحت ہے بلکہ مہلک بھی۔ فقط

فہرست انعامات و حاصل کنندگان اورنگ آباد کالج ٹورنمنٹ ۱۳۴۷؁ف

	اول	دوم
آل انڈیا خواجہ پرشاد کرکٹ شیلڈ	گراس ہاپرز حیدرآباد	اے۔سی۔سی۔ اورنگ آباد
	(۱۱) تمغہ جات درجہ اول	(۱۱) تمغہ جات درجہ دوم
بہترین بالر	ابراہیم خاں (گراس ہاپرز حیدرآباد)	
بہترین بیٹس مین	جادھو (اے سی سی اورنگ آباد)	
بہترین فیلڈ	ابیارا (ایس یو سی۔ سکندرآباد)	
ہائی اسکول کرکٹ شیلڈ	چادرگھاٹ ہائی اسکول	اورنگ آباد کا بجیٹ اسکول
	(۱۱) تمغہ جات درجہ اول	(۱۱) تمغہ جات درجہ دوم
بہترین بالر	ذکاء اللہ	
بہترین بیٹ	اصغر حسین	
آل انڈیا نواب وست محمد خاں شیلڈ	مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد	نظام کلب اورنگ آباد
	(۱۱) تمغہ جات درجہ اول	(۱۱) تمغہ جات درجہ دوم
بہترین فٹ بالر	غلام احمد ہاشمی (بریفی)	
ہائی اسکول فٹ بال شیلڈ	چادرگھاٹ ہائی اسکول	(دارالعلوم حیدرآباد)
	(۱۱) تمغہ جات درجہ اول	(۱۱) تمغہ جات درجہ دوم

	اول	دوم
بہترین فٹ بالر	ڈی راماراؤ چادر گھاٹ	
آل انڈیا مہاراجہ ہاکی شیلڈ	عثمانیہ کالج اورنگ آباد	عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
	(۱۱) تمغہ جات درجہ اول	(۱۱) تمغہ جات درجہ دوم
بہترین ہاکی کھلاڑی	ڈومنگو پولس ٹریننگ اسکول حیدرآباد	
ہائی اسکول ہاکی شیلڈ	عثمانیہ کالج اورنگ آباد	مدرسہ سلطانیہ ویجاپور
	(۱۱) تمغہ جات درجہ اول	(۱۱) تمغہ جات درجہ دوم
بہترین ہاکی کھلاڑی (گول کیپ)	جی راما کرشنا راؤ (چادر گھاٹ ہائی اسکول)	
بیڈ منٹن کپ	اورنگ آباد کالج	شائننگ اسٹار ٹیم
	(۵) تمغہ جات	(۵) تمغہ جات
ٹینس سنگل	نیل کنٹھن اورنگ آباد	حفیظ حقانی حیدرآباد
ٹینس ڈبل	نیل کنٹھن ۔ شرف الدین	حفیظ حقانی ۔ بدرالدین
پنگ پانگ	حفیظ حقانی حیدرآباد	ظہورالدین ۔ حیدرآباد
بلیرڈز	پسٹن جی سولی	فریدالدین صاحب
آکشن برج	طاہر و شریک	سید و شریک
تقریری مقابلہ (غلام احمد خاں شیلڈ)	مصلح الدین سٹی کالج	صفی اللہ اورنگ آباد کالج
بہترین اسپورٹس مین	وحید رضوی	
رضاکار	عارف اللہ خاں	
	صفی اللہ	
اسپورٹ کپ نمبر ۱	عثمانیہ کالج اورنگ آباد	چادر گھاٹ ہائی اسکول

جلد ۱۰ بابت فروردی۔ اردی بہشت۔ خورداد و تیر سنہ ۴۷ ف نمبر ۳

نورس

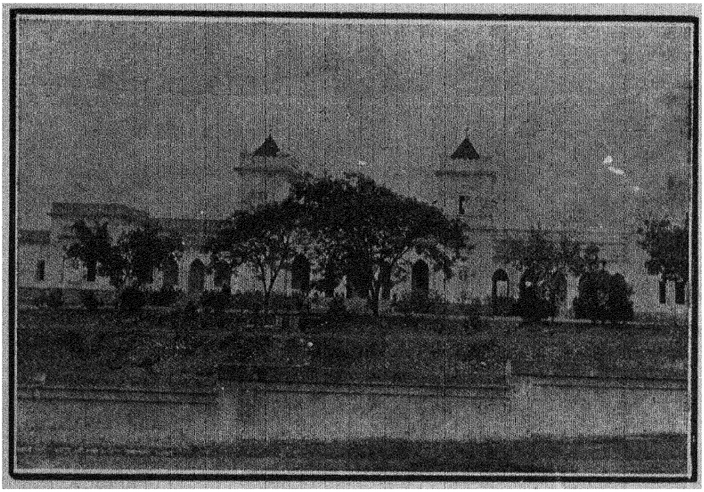

مجلس نورس

صدر :— جناب مولوی الحاج سید محی الدین صاحب، بی۔اے، بار ایٹ۔لا،
پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد۔

نائب صدر و مدیر مسئول:— جناب مولوی غلام طیب صاحب بی۔اے، ایل۔ٹی،
لکچرار اردو عثمانیہ کالج اورنگ آباد۔

نمائندہ کالج و نائب مدیران ۱ عاقل علی خاں صاحب، متعلم سال دوم انٹرمیڈیٹ۔
۲ مرزا متین احمد بیگ صاحب، متعلم سال اول "

نمائندہ فوقانیہ:— ولایت علی صاحب ہاشمی، متعلم جماعت میٹرک۔

جلد ۱۰ بابت فروردی۔ اردی بہشت ۔ خورداد و تیر سنہ ۴۷ ف نمبر ۳

نورس

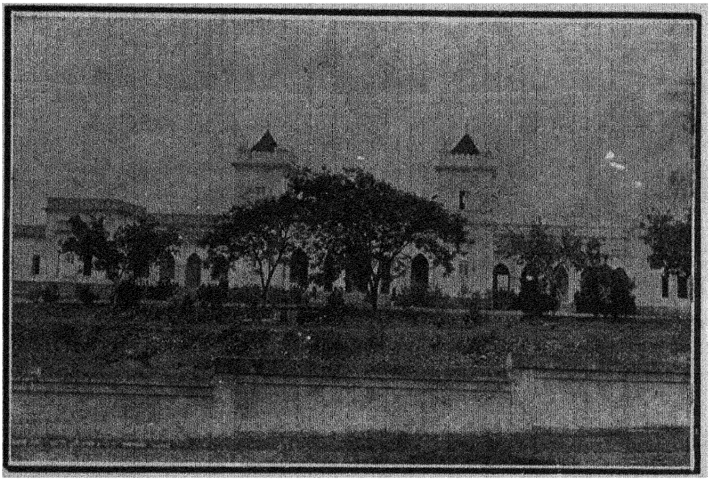

مجلس نورس

صدر :— جناب مولوی الحاج سید محی الدین صاحب، بی۔اے، بار ایٹ۔لا،
پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد۔

نائب صدر و مدیر مسئول :— جناب مولوی غلام طیب صاحب، بی۔اے، ایل۔ٹی،
لکچرار اردو عثمانیہ کالج اورنگ آباد۔

نمائندہ کالج و نائب مدیران ۱ عاقل علی خاں صاحب، متعلم سال دوم انٹرمیڈیٹ.
۲ مرزا متین احمد بیگ صاحب، متعلم سال اول "

نمائندہ فوقانیہ :— ولایت علی صاحب ہاشمی، متعلم جماعت میٹرک۔

	اول	دوم
اسپورٹ کپ نمبر ۲	سٹی کالج حیدر آباد	چادر گھاٹ ہائی اسکول

تمغہ جات خاص

از مولوی عبدالمجیب صاحب معتمد ہاکی	نصرت علی مدرسہ صنعت و حرفت	
از مولوی سردار خاں صاحب	دو تمغہ جات برائے فٹ بال	۱ نظام الدین دارالعلوم ۲ دولت علی دارالعلوم
از جناب راے صاحب	برائے رسٹ فٹ بال ٹیم	
(راے برکت رائے صاحب اول تعلقدار)	دو تمغہ جات	۱ کچریا ۲ فلپ
از جناب مولوی سید معزالدین صاحب	مسٹر ڈومنگو پولس ٹریننگ اسکول	
از مسٹر ولی محمد خاں معتمد فٹ بال	(۱) مسٹر اکبر حسین	نظام کلب
از جناب مولوی سید معزالدین صاحب	(۲) مسٹر اکبر منیر	نظام کلب

فہرست مضامین

			نمبر صفحہ
(۱)	شذرات و اخبار کلیہ	از مدیر نورس	۱
(۲)	سپاسنامہ	اساتذہ و متعلمین کلیہ اورنگ آباد	۱۷
(۳)	ورزش جسمانی اور طلبا	جناب سید محی الدین صاحب صدر کلیہ اورنگ آباد	۲۱
(۴)	رازِ حیات	جناب مولوی غلام طیب صاحب - مدیر نورس	۳۶
(۵)	جرمنی اور جرمن قوم (ترجمہ)	جناب مولوی سید انیس الحق صاحب ایم. اے حال مقیم لیڈس	۳۷
(۶)	قند پارسی	جناب مفتی نواب ضیا یار جنگ بہادر	۴۹
(۷)	مصنف قصہ ہیر رانجھا	جناب مولوی فیض عالم صاحب مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۵۰
(۸)	غزل	جناب مولوی سید صادق صاحب سروش مدگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۶۴
(۹)	یورپ پر آمریت کا اثر	محمد مجیب اللہ صاحب صدیقی متعلم بی اے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد	۶۵
(۱۰)	غزل	جناب مولوی عبدالرب صاحب کوکب مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۷۶
(۱۱)	ہندوستان کے موسیقی	محمد شمس الدین صاحب فاروقی متعلم بی اے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد	۷۷
(۱۲)	غزل	محمد ہاشم صاحب محشر متعلم الگزینڈرا ہائی اسکول بھوپال	۹۰
(۱۳)	کالی داس اور شیکسپیر (ترجمہ)	مرزا متین احمد بیگ صاحب سروش متعلم سال دوم کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۹۱
(۱۴)	غزل	سید عزیز الحسن صاحب ضیا متعلم جماعت دہم کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۱۰۲
(۱۵)	قصائدِ مومن	جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۱۰۳
(۱۶)	یادِ اقبال	جناب مولوی ولی محمد خاں صاحب مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۱۱۶
(۱۷)	فہرست انعامات	نائب مدیر نورس	۱۲۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

شذرات واخبار کلیہ

(۱)

اس سال بڑی بڑی ہستیوں نے کالج کی عزت افزائی کی۔ اس سے پہلے نمبر میں عالی جناب نواب صدر اعظم بہادر کی تشریف آوری کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ عالیہ نمبر ایک شاہانہ ہستی کے ذکر جمیل سے مزیّن ہو رہا ہے۔ کالج کی تاریخ میں یہ دن بھی یاد رہے گا جب بروز یکشنبہ، ۱۰ دی ۱۳۴۸ف علیا حضرت ہز ہائی نس پرنسز آف برار نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے کالج کا پایہ آسمان تک پہنچایا۔ مشرق میں آج بھی خانوادہ شاہی کے افراد مہر و ماہ سمجھے جاتے ہیں۔ رعایا کے قلوب ان کی محبت اور عقیدت سے لبریز رہتے ہیں۔

تقریباً ۴ ½ بجے علیا حضرت کی موٹر کالج کے گیٹ پر پہنچی۔ اسکاوٹ بینڈ نے سلامی دی۔ نسیم بہار نے کلیوں کو متبسم کر دیا۔ عقیدت کے دھارے میں دل اپنے ٹھکانے سے ہٹ گئے۔ بیخودی نے سب کو مست و سرشار بنا دیا۔ مقامی عہدہ داروں نے سرو قد تعظیم دی۔ عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں ماہ آصفی

کی جلوہ گری شب قدر کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے پہلی بار اس درشاہوار یعنی علیا حضرت درشہوار دولھن درو انہ بیگم صاحبہ دام اقبالہا کو دیکھا۔ فن مصوری لاکھ ترقی کرجائے لیکن تصویر کو اصل سے کیا واسطہ۔ اس جلسہ میں صاف نظر آرہا تھا کہ رعایا کے دل میں خانوادہ آصفی کی محبت کیا کام کر رہی ہے۔ پھر علیا حضرت کی موجودگی نے خلافت اسلامی کی یاد کو بیدار کردیا تھا بہت سی آنکھیں پُرنم تھیں۔

جناب صدر صاحب کالج نے زرین ہار پہنائے۔ سپاسنامہ پڑھا۔ اور کشتی میں لگا کر پیش کیا۔ علیا حضرت نے اپنے دست مبارک سے طلبا کو انعامات تقسیم فرمائے۔ اور اپنے مختصر جواب ایڈریس میں کالج کے متعلق اظہار خوشنودی فرمایا۔ اس سلسلہ میں یہ اعلان بے محل نہ ہوگا کہ ہز ہائی نس پرنس آف برار بالقابہ نے ایک سو روپے غریب طلبہ کے لئے عطا فرمائے۔ فہرست انعامات جلسہ تقسیم انعام ضمیمہ میں شایع کی گئی ہے۔

(۲)

کھیلوں کے مقابلے ختم ہوئے۔ تقاریب اور جلسوں کا زمانہ بھی گیا۔ اب معلمین و متعلمین کو امتحانات کی فکر ہے نصاب ختم کیا جا رہا ہے۔ اعادے ہو رہے ہیں، طالبعلمانہ زندگی میں ورزشی کھیل۔ جلسے اور مطالعہ کے مختلف دور ہوتے ہیں۔ آج کل محض نظری اور کتابی تعلیم بے کار سمجھی جاتی ہے۔ زمانے کی ضروریات اور تمدن کی متلون رَو نے تعلیم کے مفہوم کو بالکل بدل دیا ہے۔ بہرحال ابھی کتابوں اور امتحانوں کا جھگڑا ہے، میٹرک۔ انٹر۔ ایس۔ ایل بی اور انٹرمیڈیٹ کے آزمائشی

امتحانات ختم ہو گئے، مندرجہ ذیل تعداد امتحانات میں شریک ہوئی ہے۔ خدا کرے یہ سب کامیاب ہوں اور ان کی محنت ٹھکانے لگے۔ ہمارے طلبا چھٹیوں کا طویل زمانہ بیکاری میں گزارتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ مولوی سید انیس الحق صاحب کا مضمون پڑہیں جو انہوں نے جرمنی کے نظام نوجوانان کے متعلق لکھا ہے۔ اور جو اس نمبر میں شایع کیا جا رہا ہے۔ فہرست شرکا امتحانات۔

انٹرمیڈیٹ	۴۹
میٹرک	۹۳
ایچ۔ایس۔ایل سی	۳۳

(۳)

دو سال سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ اعلان اور تاکید کے باوجود طالب علم نورس کے لئے مضامین لکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ یہی زمانہ مضمون نگاری کی مشق کا ہے۔ یہی دن ہیں جب طلبا کو زبان وقلم میں زور پیدا کرنا چاہئے اس کالج نے اچھے اچھے مضمون نگار نکالے۔ ان کی مشق کا میدان نورس کے صفحات پر تھا۔ مجھے امید ہے کہ طلبا اس طرف توجہ کریں گے یہ رسالہ انہیں کا ہے۔ انہیں کے مضامین پر مشتمل ہونا چاہئے۔ نئی قسم کی نظمیں بھی اب نہیں آرہی ہیں۔ غزل گوئی کا رجحان عام ہے۔ مضامین اور نظموں پر اصلاح سے کر صاف صاف لکھنا چاہئے ورنہ مطبع کے کاتب کچھ کا کچھ لکھ جاتے ہیں۔ اب عاقل علی خاں صاحب کی جگہ جنہوں نے دو سال تک نائب مُدیر کے فرائض انجام دئے مرزا متین احمد بیگ صاحب متعلم سال دوم کام کریں گے۔ طلبا کو چاہئے کہ اپنے

مضامین انہیں کے حوالے کریں۔ اراکین اسٹاف سے بھی میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ گاہے گاہے نورس کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے رہیں۔

(۴)

ہمارے کلیہ کے ایک سرگرم معلم مسٹر راجندر راؤ صاحب کا انتخاب "تعلیم کوراں" کے لئے سررشتہ تعلیمات کی جانب سے ہوا اور صاحب موصوف ٹریننگ کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے۔ جناب صدر اور اسٹاف کلب نے الوداعی عصرانے دئے۔ صاحب معز ایک درویش منش۔ منکسر مزاج معلم ہیں۔ کام اور خدمت کا خاص شوق ہے۔ اس کے لئے ان کا پورا وقت وقف رہتا ہے۔ اسکاوٹ۔ تیراکی۔ ورزش جسمانی۔ رضاکاری۔ جلسوں کا انتظام ہر چیز میں حصہ لیتے ہیں ان کی پاکیزہ سیرت نے سب کو گرویدہ بنا لیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ٹریننگ کے بعد ان کی افادیت میں اور اضافہ ہوگا۔ صاحب موصوف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ نورس کے لئے مضامین روانہ کرتے رہیں گے۔

بعض انتظامی مصالح کی بنا پر مولوی مقصود علی صاحب کامل جو اس کلیہ میں تقریباً ۱۲ سال سے کارگزار تھے مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم حیدرآباد میں متبدل ہو گئے۔ ان کی جگہ مولوی محبوب الحسن صاحب تشریف لائے ہیں۔ امید کہ یہ اسٹاف کے ایک سرگرم رکن ثابت ہوں گے۔

(۵)

برٹش سائنس وفد

کلکتہ سائنس کانگریس کی شرکت کے لئے جو برٹش سائنس وفد ہندوستان آیا تھا اس نے ہندوستان کے مختلف

مقامات کا دورہ کیا چنانچہ یہ وفد، ابہمن ۱۳۴۸ف کو حیدرآباد سے اورنگ آباد آیا۔ سواد اورنگ آباد کے آثار قدیمہ کی سیر کی۔ شام میں کالج میں جلسہ ہوا۔ جملہ اراکین وفد نے جو اپنی علمی حیثیت کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہیں جلسہ میں تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ صدر وفد سر جیمس جین صدر جلسہ ہوئے۔ صدر کلیہ نے ان کا استقبال کیا۔ جناب صوبہ دار صاحب نے قندیلِ مناظر سے اورنگ کی قدیم عمارتوں پر روشنی ڈالی۔ سر جیمس جین نے ارشاد فرمایا کہ ارضی قدامت اور مدت کے مقابلہ میں دنیا کی وسیع تاریخ ایک نقطہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ صدر موصوف کا منشا غالباً یہ تھا کہ اگر دنیا کی قومیں بجائے اس کے کہ اپنی امتیازی باتوں کو پیش کریں متحد ہو کر انسان کے علمی سرمایہ میں اضافہ کریں اور تحقیق و تجربات سے نئے نئے اصول دریافت کریں تو بنی نوع انسان کی زندگی زیادہ پر سکون اور آرام دہ ہوگی۔ صاحب موصوف نے فرمایا کہ اختلافِ رائے کے باوجود دنیا ترقی کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔

(۶)

صنعتی تعلیم

ہندوستان میں جامعاتی تعلیم کی روز افزوں توسیع و اشاعت بڑی مشکلیں پیدا کر رہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بے روزگاری پھیل رہی ہے۔ اس چیز کا حل دریافت کرنے کے لئے ایک عرصے سے صنعتی تعلیم اور مدارس کی تنظیم جدید کے متعلق غور کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل مسٹر ایبٹ حکومت ہند کی دعوت پر اس سلسلہ میں ایک رپورٹ پیش کر چکے تھے مگر ان کے مشورے پر عمل کی نوبت نہیں آئی۔ گزشتہ سال میکنزی اسکیم کو بروئے عمل

لانے کے لئے سرکار عالی نے پھر مسٹر ایبٹ کو بلایا۔ صاحب موصوف مدارس کے معائنوں کے لئے اورنگ آباد تشریف لائے۔ مسٹر پرسٹن، مسٹر بھگوان اور کیپٹن ہاشمی صاحب آپ کی معیت میں تھے۔ ۱۰۔ اسفندار ۴۸ ف کو صاحب معز نے ہمارے کالج۔ اسکول اور اقامت خانوں کو دیکھا اسی روز شام میں کالج ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا مقامی عہدہ داروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا مسٹر ایبٹ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ یورپ اور امریکہ کی حکومتوں نے اپنی ضروریات کے مطابق صنعتی تعلیم کا نظام قائم کرلیا ہے لیکن ابھی ہندوستان بہت پیچھے ہے۔ اس کے حسن تعقل و تعلیم کے متعلق کچھ کہنا عبث ہے کیونکہ اس کا شاندار ماضی اس کا فلسفہ اور فنون لطیفہ اس کی ذکاوت اور سرعت فہم کے ثبوت ہیں جو عام طور پر ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ لیکن ہاتھ پیر اور دماغ کے میل کے بغیر کوئی قوم اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتی۔ ضرورت اس کی ہے کہ ملک کی توجہ صنعتی تعلیم کی طرف پھیر دی جائے۔"

(۷)

نواب صدرالمہام بہادر تعلیمات کا دورہ یکم خورداد ۴۸ ف کو عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالمہام تعلیمات و سیاسیات تشریف فرمائے اورنگ آباد ہوئے جناب ناظم صاحب تعلیمات بھی ہمرکاب تھے۔ اس سے قبل بارہا صاحب معز کی تشریف آوری کی خبریں آئیں۔ مگر کسی نہ کسی سرکاری ضرورت نے اس دورہ کو ملتوی کردیا۔ ابکی بار جب صدرالمہام بہادر تشریف فرما ہوئے تو کالج کی جماعتوں کو تعطیل ہوچکی تھی اور فوقانیہ جماعتوں میں سالانہ امتحان ہو رہا تھا۔ جناب صدر

کلیہ کے ہمراہ صاحب معزنے کالج۔ طبقہ وسطانیہ۔ اور اقامت خانوں کو ملاحظہ فرمایا۔ شام میں جمخانہ گراؤنڈ پر "ماس ڈرل" ہوئی۔ ہاکی۔ فٹ بال۔ اور کرکٹ کی مشق کا انتظام بطور خاص کیا گیا تھا۔ ۲۔ خورداریوم چہارشنبہ کو نواب صدرالمہام بہادر بالقابہ اقامت خانہ اسکول کے طلباء کے ساتھ شب میں ماحضر تناول فرمایا اور سالانہ انعامات تقسیم فرمائے۔ طلبا کی اس دعوت میں بعض مقامی عہدہ دار اور اراکین اسٹاف بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد جناب صدر صاحب کلیہ نے ایک مختصر تقریر فرمائی جو ذیل میں دی جاتی ہے۔ اس کے جواب میں عالی جناب صدرالمہام بہادر نے کالج کے کام اور ہمارے شفیق صدر صاحب کے متعلق جو کچھ فرمایا۔ اس نے ہم سب کو مسرور و مطمئن کر دیا۔

تقریر جناب صدر صاحب کلیہ۔

صدر عالی قدر و معزز حاضرین و اساتذہ و طلباء۔

ایک عرصے سے ہماری تمنا تھی کہ ہمارے سررشتہ کے افسر اعلیٰ یہاں تشریف لائیں کئی بار آپ کی تشریف آوری کی خبریں مشہور ہوئیں لیکن موقع نہیں مل سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کل تشریف فرما ہوئے اور عدیم الفرصتی کے باوجود ہماری دعوت قبول فرمائی اور ہمارے طلباء کو ایسے بڑے افسر کے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ زمانہ امتحانات کا ہے لیکن ہمارے صدر صاحب نے ہم کو موقع دیا ہمارے ہر ادارے کو دیکھا اقامت خانوں اور کھیل کے میدان کا معائنہ فرمایا اور ہم جو کام کر رہے ہیں اس کا اندازہ آپ کو ہوا آپ نے گرمی میں تکلیف برداشت فرماکر معائنہ فرمایا جس کے ہم شکر گزار ہیں۔ اورنگ آباد بلدے سے دور ہے لیکن اس کی

اہمیت بلدے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ حضرت آصف جاہ اول مغفرت مآب نے
سلطنت کی بنیاد یہیں رکھی۔ یہ مقام تعلیم کے لئے بہت موزوں ہے جس وقت
سے عالیجناب نواب عماد الملک بہادر رحمۃ اللہ علیہ نے اس ادارے کی بنیاد رکھی۔
اس وقت سے ادارہ یہاں کی ضروریات کی تکمیل کر رہا ہے۔ اس نے مختلف مدارج
طے کئے۔ ہمارے تمام پیشرو نہایت قابل اور چیدہ لوگ مقرر ہوئے۔ چنانچہ ہمارے
موجودہ ناظم صاحب تعلیمات ہائی اسکول کے ایک عرصہ تک پرنسپل رہے آپنے
اتنے اچھے طریقے سے اس کو چلایا کہ اس زمانے کے لوگ شاہد ہیں جب جامعہ عثمانیہ
کا قیام عمل میں آیا تو یہ کالج بنایا گیا اور دونوں ہائی اسکول ضم ہوگئے۔ اور
مولوی عبدالحق صاحب تشریف لائے۔ پھر اس میں برابر ترقی ہوتی رہی۔ صوبہ کے چار
ضلعوں کے علاوہ برار و بھوپال و دیگر اضلاع کے بھی طلبا یہاں تعلیم پاتے ہیں۔
اے عزیز طلباء ہمارے صدر کی شخصیت معمولی نہیں ہے نہ صرف دکن میں بلکہ
ہندوستان میں بھی۔ آپ کے اجداد کا تعلق قیام سلطنت آصفیہ کے وقت سے
ہے آپ کے آبا و اجداد نے قیام سلطنت آصفیہ سے لے کر اب تک اس سلطنت
کی خدمت کی اور ہمیشہ نیک نامی حاصل کی۔ علم کی روشنی یہاں عالیجناب نواب
عماد الملک بہادر کے سبب سے پھیلی۔ خود ہمارے صدر نے پہلے حیدرآباد میں
تعلیم حاصل کی پھر اکسفورڈ سے ڈگری حاصل کی پھر آپ یو۔ پی میں ڈویژنل انسپکٹر
مدارس ہوئے۔ میں اُس وقت طالب علم تھا۔ پھر آپ یہاں منتقل ہوئے اور مختلف
شعبوں میں فائز رہے۔ پہلے ناظم ہوئے پھر سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل
ہوئے پھر معتمد سیاسیات پھر صدر المہام سیاسیات اور اس کے بعد صدر المہام

تعلیمات اور وائس چانسلر ہوئے۔ علاوہ مغربی علوم کے مشرقی علوم میں بھی آپ کو درک ہے اور آپ کا خاندان ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ مجھے دائرۃ المعارف کے سلسلے میں عالیجناب نواب عماد الملک بہادر سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملتا رہا۔ آپ مشرقی وضع کے پابند تھے ان کی جیسی زندگی اب دیکھنے میں نہیں آتی۔ مجھ پر ان کی زندگی کا بہت اثر پڑا۔ ہمارے شاہ ذی جاہ نے صحیح طریقہ اختیار فرمایا کہ ملکی زبان میں تعلیم کا انتظام کیا۔ عالیجناب نواب سر صدر اعظم بہادر نے اس میں خاص حصہ لیا۔ ہمارے ادارے کو یہ فخر ہے کہ سر صدر اعظم بہادر نے ہمیشہ اس کالج سے دلچسپی لی۔ صدر اعظم ہونے کے بعد بھی آپ تشریف لائے اور اس دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے اعلیٰ عہدہ دار تشریف لاتے ہیں اور ہم کو کام دکھانے کا موقع دیتے ہیں۔ ہمارے یہ ادارے آئندہ ملک کو بنانے والے ہیں اور ان کے مستقبل کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ موجودہ مقامی عہدہ دار بھی ہماری امداد کرتے رہتے ہیں۔ ہر سررشتہ یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا مدرسہ ہے اور اس کالج کے تمام کام باحسن وجوہ انجام پاتے ہیں علاوہ ازیں ہم اس کا بھی خیال کرتے ہیں کہ فقط تعلیم کی سند طلبار کو نہ دیدی جائے بلکہ تربیت کا بھی خیال کیا جاتا ہے۔ مادیت کی جو رو آرہی ہے اس کو روکا جائے اور سادہ زندگی گزاری جائے اگر ایسا نہ ہو تو بے امنی اور ہوا و ہوس کی اتباع ہو جائے گی۔ ہم اگر فقط کھائیں پئیں اور مر جائیں تو ہماری اور جانوروں کی زندگی میں کیا فرق رہے گا۔ ہم اس سعی میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کو دوسرے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے طلبار اگر امیر ہو جائیں۔ تو

برائیوں میں نہ پڑیں اور اگر غریب ہو جائیں تو گھبرائیں نہیں۔ دکن میں صدیوں سے ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ بسر کرتے آئے ہیں پھر ہمارے بادشاہ ذیجاہ خلداللہ ملکہٗ نے جو رواداری رکھی ہے اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑے گا۔ اگر ہمارے لڑکوں میں یہ مادہ پیدا ہو جائے تو پورے ملک میں امن رہے گا۔ میں ہمیشہ لڑکوں سے کہا کرتا ہوں کہ اگر تم تعلیم حاصل کرلوگے تو جاہل سے ہر طرح اچھے رہوگے۔ خواہ دنیا کماؤ یا نہ کماؤ۔ تمہارے سامنے پیغمبروں۔ بزرگوں اور اماموں کی مثالیں موجود ہیں کہ وہ بھوکے رہے مگر کام کرتے رہے میں اساتذہ اور طلباء کی طرف سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے وقت عزیز کو ضائع کرکے ہم کو ہمطعامی کا شرف بخشا ہیں طلباء کو نصیحت کروں گا کہ صدر محترم کی طرح مشرقی و مغربی علوم میں ترقی کریں۔"

اس کے بعد ہار پہنائے گئے اور انعامات تقسیم کئے گئے بعد میں عالیجناب نواب صدرالمہام بہادر نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی۔

جناب صوبہ دار صاحب و صدر صاحب کلیہ و طلباء و معزز حاضرین۔ مجھ کو مختلف قسم کی مسرتیں جو اپنی زندگی میں حاصل ہوئی ہیں اگر کوئی پوچھے کہ ان میں سب سے زیادہ مسرت کس چیز کی ہوتی ہے تو بیدریغ کہوں گا کہ جب مجھ کو طلباء کے ساتھ مل بیٹھنے یا کھانے پینے کا موقع ملتا ہے یا ان کی دوسری دلچسپیوں میں شریک ہوتا ہوں۔ کیونکہ یہی نسل آئندہ قوم بننے والی ہے۔ بلدہ کے بعد اورنگ آباد سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور تاریخی حیثیت سے اس کی اہمیت بڑھی چڑھی ہے یہاں سررشتہ تعلیمات نے ہمیشہ سینیر لوگوں کو

بھیجا۔ مولوی سید محی الدین صاحب سررشتہ کے انہی قابل قدر لوگوں میں۔ انہوں نے اس خدمت کو اس طرح انجام دیا کہ اس خدمت میں چار چاند لگ گئے۔ افسوس ہے کہ مجھے ایسے وقت یہاں آنے کا موقع ملا جبکہ امتحانات ہو رہے ہیں لیکن مجھے اپنے تجربے کی بنا پر یہ کہنے کا حق ہے کہ جو کچھ میں نے دیکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انتظامات بہت اچھے ہیں۔ مولوی سید محی الدین صاحب ان عہدہ داروں میں ہیں کہ جن میں بدرجہ اتم انتظامی مادہ اور کام سے انہماک ہے آپ نے جو انتظام کیا ہے وہ بہت قابل تحسین ہے۔ آپ نے فقط انتظام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ کی نظر بہت وسیع ہے اس لئے آپ نے تربیت پر زور دیا اور اس کی کوشش کی کہ یہاں کے طلباء میں اچھے اخلاق پیدا ہوں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں جو کشیدگی پیدا ہوتی ہے وہ اخلاق کی کمی کی وجہ سے ہے۔ مولوی سید محی الدین صاحب نے اخلاق کے بہتر کرنے کی کوشش کی۔ آپ سررشتہ کے ان عہدہ داروں میں ہیں جو نہ صرف سینیر بلکہ بہت قابل قدر ہیں ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ آپ کی دلچسپی کی چھوٹی سی مثال دیکھئے کہ اس وقت جو انعامات تقسیم کئے گئے ہیں وہ کس قدر دلچسپ ہیں۔ ان انعامات سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی سید محی الدین صاحب کیرکٹر پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس کالج اور اسکول کو دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی اور میں مطمئن ہوں کہ مولوی سید محی الدین صاحب میں بیحد دلچسپی اور انہماک ہے۔ آیندہ اسکیم میں اسکول لیونگ اور میٹرک کے امتحانات ختم ہو جائیں گے آٹھویں اور گیارھویں جماعت کے امتحانات ہوں گے۔ انٹرمیڈیٹ نہیں رہے گا اس

وقت مجھے یقین ہے کہ تعلیم کا معیار بڑھ جائے گا اور جو لوگ اعلیٰ تعلیم میں جانا نہیں چاہتے ان کو کوئی صنعت سکھائی جائے گی۔ اس کی کوشش ہو رہی ہے کہ ایسی درسگاہیں ہوں جن میں بچوں کو مختلف پیشے سکھائے جائیں اسکول میں اساتذہ بچوں کے رجحان معلوم کریں مجھے اساتذہ پر اطمینان ہے کہ وہ قدیم کی طرح جدید تعلیم کو بھی کامیاب کریں گے۔ مولوی سید محی الدین صاحب کو ان کے مدرسے کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ہمیشہ عہدہ داروں کا خیال ان کی طرف سے اچھا رہا ہے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے بالا دست عہدہ داران سے مطمئن ہیں۔

اس کے بعد مشتاق احمد مقیم نے طلباء کی طرف سے سب کا شکریہ ادا کیا۔ ترانہ قومی ہوا۔ اور اعلیٰ حضرت کے لئے تین چیرز ہوئے بعدہ عالیجناب نواب صدر المہام بہادر کے لئے تھری چیرز ہوئے اور جلسہ برخواست ہوا۔

مولوی عبدالحق صاحب

اردو کے محسنوں میں آزاد۔ حالی۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے ناموں اور کاموں سے ہم آشنا ہیں۔ ان بزرگوں نے اردو نثاری کو جو بالکل ابتدائی حالت میں تھی بہت ترقی دی لیکن زمانہ کی ضرورت اس سے بہت زیادہ چاہتی تھی مولانا سلیم نے وضع اصطلاحات کے اصول قائم کئے اور اردو کی ترقی کی نئی راہ نکالی لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے جو کام اپنے ذمہ لیا وہ ان سب سے مشکل وسیع اور نازک تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی پوری زندگی زبان کی خدمت کے نذر کر دی۔ قدیم اردو کی شکستہ تاریخ کی کڑیاں ملائیں۔ پرانے ادب کو تہ خانوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا۔ اور اس طرح

اُردو کی بنیادیں مستحکم کیں۔ اصلاح وترقی زبان کے سلسلہ میں جدید قواعد مرتب کیے اور زبان کو سائنٹفک بنایا۔ ادبی تنقید جس کی ابتدا مولانا حالی کے ہاتھوں ہوئی تھی مولوی صاحب کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ مقدمہ نگاری مولوی صاحب کا حصّہ ہے ہماری زبان میں مقدمات عبدالحق فن تنقید وتحقیق کے بہترین نمونے ہیں۔ مجھے بھی مولوی صاحب کے ساتھ چندروز کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان کے احباب جانتے ہیں کہ مولوی صاحب کی تحقیق کا کیا پایہ ہے اور ان کی نظر زبان کے کن کن پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ زمانہ حال میں ہندی اور اردو کی جو جنگ چھڑی ہے اگر مولوی صاحب اُردو کے پلے پر نہ ہوتے تو اس جنگ میں اُردو کا سر بر ہونا بہت مشکل تھا۔ رسالہ اُردو کی جلدیں مولوی صاحب کے کام کا آئینہ ہیں۔ ہمیں بے انتہا مسرت ہوئی کہ الہ آباد یونیورسٹی نے مولوی صاحب کو "ڈی۔ لٹ" کی اعزازی ڈگری دے کر صاحب موصوف کی بے مثال ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے قیام اور کام میں ہر جگہ مولوی صاحب کا ہاتھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک زبان کی ترقی کی نئی نئی راہیں نہ نکالی جائیں کوئی جدید زبان اعلیٰ تعلیم کا حق نہیں ادا کر سکتی۔ ایسے بزرگ ہستیوں کو ڈگری دینے سے خود جامعہ کی عزت بڑھتی ہے مولوی صاحب کی شخصیت۔ قابلیت اور کام ایسی ڈگریوں سے بہت بالاتر ہے۔

(۱۰)

اقبال اُردو کی بدنصیبی تو دیکھئے کہ اس کا سب سے بڑا شاعر راہی ملک عدم ہوا۔ ان کا جانشین کوئی نظر نہیں آتا۔ پنجاب میں دو ایک شاعر اور ہیں لیکن وہ اقبال

کے پاسنگ بھی نہیں۔ ہندوستان کے دوسرے شاعر غزل گوئی میں پڑے ہیں
اور جو دو ایک اس تنگنائی سے نکلے ہیں تو راستہ بھول گئے ہیں۔ اقبال نے
جو راستہ اختیار کیا تھا اس کے پیچ وخم سے اچھی طرح واقف تھے یہی وجہ ہے
کہ ان کی شاعری حقیقت کی آواز تھی۔ فلسفہ نے اس میں متانت اور مشاہدہ قدرت
نے رنگ بھرا تھا۔ وہ الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ خیالات کا دریا ہے جس میں
ایک حسّاس دل کی کروٹیں ہمیشہ تموّج پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اقبال ابھی بہت دنوں
تک زندہ رہیں گے ان کی شاعری کا اثر اس دور کے تمام شعرا اور ادبا پر پڑا ہے
اور پڑتا رہے گا۔ جب تک کوئی ایسا شاعر پیدا نہ ہو جس میں غالب کی بلند پروازی
اقبال کا فلسفیانہ اظہار خیال اور داغ کی گھلاوٹ ہو اس وقت تک یہ صف ماتم
بچھی رہے گی۔ عالم۔ سائنسداں فلسفی۔ موجد اور دوسری بڑی ہستیاں قوم کی
علمی فضا کی پابند ہیں اور ان کی نمو اسی عام قانون کے ماتحت ہوتی رہتی ہے
لیکن فنون لطیفہ میں یہ قاعدہ پورا نہیں اُترتا۔ دنیا کی علمی ترقی۔ زبان کی توسیع
اور خیالات کی بلندی اور ہمہ گیری شیکسپیر۔ گیٹے۔ غالب۔ اور کالی داس کو نہیں
پیدا کر سکتی۔ یہ وہ بجلیاں ہیں جو کبھی کالی گھٹاؤں میں چمک کر روپوش
ہو جاتی ہیں۔ یہ تمدن کے ارتقا سے بے نیاز ہیں۔ مگر قوم میں شعری احساس موجود
ہو تو یہ توقع ہو سکتی ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسا نکلے گا جو ان احساسات کو اپنے نغموں
میں بھر دے اور ان پر دوام کی مہر ثبت کر دے۔ ہمیں افسوس ہے کہ قوم کا عام
احساس اس راستے سے بہت دور ہے۔ اقبال کی تلخ نوائی نے قوم کی آنکھیں
تو ضرور کھول دیں لیکن اس کی رگوں میں خون کی روانی نہیں بلکہ جمود کی برودت ہے

خدا کرے اقبال کا کلام اس کو پگھلا دے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے آسد
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

(۱۱)

ہفتہ حفظانِ صحت اورنگ آباد

اورنگ آباد میں دو سال سے ہفتہ حفظانِ صحت منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جتھار سول سرجن اورنگ آباد کی ذاتی دلچسپی نے اس ہفتہ کو اس سال بھی بہت کامیاب بنایا۔ صفائی۔ زچگی اور امراض کی تشریح کے لئے جو اسٹال قائم کئے گئے وہ گزشتہ سال سے بہتر تھے۔ لیکن ہم کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس نمائش میں یونانی اور ویدک طب کے لئے ایک اسٹال بھی نہیں دیا گیا۔ طب مغربی لاکھ ترقی کر جائے لیکن وہ امراض مزمن کے علاج اور مقویات میں قدیم طب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ بندر کے غدود نکال کر آدمی کے کمزور غدودوں کی جگہ رکھ دینا یا ان کے عرق سے ادویہ تیار کرنا ہے۔ یہ عمل جتنا پیچیدہ اور خطرناک ہے وہ ہر شخص جانتا ہے۔ ابھی حال میں "کایا کلپ" سے پنڈت مالوی جی میں جوانی پیدا کرنے کی جو کامیاب کوشش کی گئی اس سے ڈاکٹروں کو سبق لینا چاہئے۔ ویدک میں رسائن سے جو کام لیا جاتا ہے اس کا جواب مغربی طب میں نہیں ہے۔ ان تمام واقعات کے بعد ایسی نمائشوں میں قدیم طب کو جگہ نہ دینا باعث حیرت ہے۔ یہ ہیرے پھر نہ ملیں گے ان کی قدر کرنی چاہئے ہمیں امید ہے کہ آئندہ نمائشوں میں اس کا خیال رکھا جائے گا۔ دوسری بات

یہ ہے کہ اس قسم کے سالانہ مظاہرات سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا جب تک کہ کام کے لئے کوئی نظام العمل نہ بنایا جائے۔ کام چاہے معمولی کیوں نہ ہو اگر سال بھر تک ہوتا رہے تو مفید نتائج برآمد ہونے کی توقع ہو سکتی ہے لیکن اگر کام نہیں ہے صرف سالانہ نمائش ہے اور اس کے بعد پھر سال بھر کی بے توجہی تو اس سے وہ نتائج نہیں پیدا ہو سکتے جن کے لئے ایسی نمائشیں کی جاتی ہیں۔ نمائشوں کا مقصد تعلیم اور اشاعت ہے۔ اس کے بعد عملی کام کے کسی پروگرام کا ہونا بے انتہا ضروری ہے۔ ہم ڈاکٹر جتھار کو ہفتہ صحت کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اورنگ آباد کی صحت کی ترقی کے لئے کوئی نہ کوئی عملی کام بھی شروع کریں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سپاس نامہ

بہ پیشگاہ ملازمان

علیا حضرت ہر ہائی نس دی پرنسس آف برار درشہوار دلہن

دردانہ بیگم صاحبہ دام اللہ اقبالہا

یور ہائی نس۔

ہمارے لئے بڑے فخر و مباہات کا مقام ہے کہ آج کالج میں وہ شاہانہ ہستی رونق افروز ہے جس سے حیدر آباد کی علمی، سماجی اور مدنی اصلاح و ترقی کی امیدیں وابستہ ہیں اور جس نے تعمیری کام اور علمی مشاغل کی عظمت کا قابل تقلید نمونہ ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ یور ہائی نس نے ریاست اور رعایا کے رفاہی کاموں میں جس شغف کا اظہار فرمایا ہے وہ خانوادہ آصفی کی تاریخ کا زرین باب ہے۔ علیا حضرت کے اس انہماک میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کے ان زرین کارناموں کا پرتو ہے جنھوں نے دور عثمانی کو اپنی آپ نظیر بنادیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ جو تعلیمی تخیل کا انوکھا کارنامہ ہے اپنے وجود اور علمی پیش روی کے لئے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی نظر کیمیا اثر کی مرہون منت ہے۔

حیدرآباد کو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے کہ اس کے بلند اقبال ولی عہد والا شان کی ذات ستودہ صفات میں اپنے پدر گرامی اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی رعایا پروری اور فلاح ملک کا درد موجود ہے اور آج جس شاہانہ مہمان محتشم نے ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ان کا قلب مبارک بھی اُسی جذبہ سے معمور ہے۔

محترمہ والا ہمم۔

یہ ادارہ جس کی عزت افزائی آج یور ہائی نس نے فرمائی ہے ۱۳۳۲ف میں جامعہ عثمانیہ کا الحاقی کالج بنا۔ اس وقت سے بفضل خدا اس کی تعداد اور نیک نامی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اس کے عمدہ نتائج اور علمی روایات نے اس کو اضلاع ممالک محروسہ اور برار کے طلباء کا مرجع بنا دیا ہے اس کی موجودہ تعداد جو "۱۲۵۰" ہے اس کی مرکزیت اور ہردلعزیزی کا پتہ دیتی ہے۔ اس ادارہ کا کام درس و تدریس پر ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ یہاں طلباء کے اخلاق و عادات پر خاص طور پر نگرانی کی جاتی ہے۔ اس کالج کے چار اقامت خانے ہیں جن میں طلباء کی سیرت اور جسمانی صحت کی نشو و نما کا خاص انتظام ہے۔ کالج میں باغبانی اور صنعت و حرفت کی تعلیم کے اجرا کی تجاویز پیش کر دی گئی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ جلد از جلد نافذ کر دی جائیں۔

میں یور ہائی نس کی اجازت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کالج میں غریب طلباء کی امداد کے لئے مختلف فنڈ قائم ہیں جن میں اساتذہ بعض مقامی عہدہ داران اور چند بیرونی بہی خواہان علم بھی چندہ دیتے ہیں۔ چنانچہ بیسیوں غریب طالب علم اس امداد سے اعلیٰ تعلیم پا کر ریاست کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔

انشاء اللہ تعالیٰ یہ کار خیر یوں ہی جاری رہے گا۔

اس ادارہ میں ورزشی کھیلوں کا خاص اہتمام ہے۔ اس کالج کی ٹیموں نے بیسیوں کپ اور شیلڈس حاصل کئے ہیں اور اس کے کھلاڑیوں نے بیرون ریاست حیدرآباد کے نام کو روشن کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان تمام امور کے دوش بدوش کالج کے نتائج امتحانات ہمیشہ نمایاں طور پر اچھے رہے ہیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ تعلیمی کام بہت اہم ہے اور محنت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔

علیاحضرت۔

یہ کالج طلبا میں مالک اور ملک کی محبت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے ان کی سیرت کو شاہانہ عقیدت کی رنگینی میں رنگتا ہے تاکہ حیدرآباد کی مخصوص اور شاندار روایات نوجوانوں کی رگ و پے میں سرایت کر جائیں۔

آخر میں ہم خدائے بزرگ کی جناب میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے آقائے ولی نعمت ہز اگزالٹڈ ہائی نس دی نظام آف حیدرآباد اینڈ برار۔ شاہزادگان والاشان۔ شہزادیان فرخندہ فال۔ یور ہائی نس دی پرنسس آف برار اور شاہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کو جن کی ذات سے حیدرآباد کا مستقبل وابستہ ہے قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

ہم ہیں یور ہائی نس کے جاں نثار

پرنسپل معلمین و متعلمین

عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد (دکن)

لکچر

"ہفتہ حفظان صحت اورنگ آباد"

میں

بتاریخ ۵۔ خورداد ۴۷؁ف

۶ بجے شام میں

دیا گیا

بسم اللہ

ورزش جسمانی اور موجودہ طلباً

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس عالم موجودات میں بقاء وفناء "وجود و عدم" اور حیات و موت میں وجہ امتیاز ایک ہیجانی کیفیت ہے جسے مختلف مذاہب اور مکاتب خیال نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ حیاتیات داں اپنے خورد بینی تجسسات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ انسانی جسم کے خلیات (Cells) میں جوہر حیات (Protoplasm) پر جب تک تلاطمی کیفیت طاری رہتی ہے زندگی کے آثار عیاں رہتے ہیں اور جب وہ وجدانی کیف مفقود ہوجاتا ہے تو وجود پر عدم مسلط ہوجاتا ہے جسے ہم دنیاوی آداب میں موت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ پروٹوپلازم کا وہ تموج یا روح کا وجود فی الواقع ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں جسے مختلف تخیلات کے تحت مختلف اسماء سے موسوم کیا گیا ہے۔ بہر نوع زندگی اور ہیجان ایک دوسرے سے مثل علت و معلول کے وابستہ ہیں۔

جب زندگی و ہیجان کا تعلق ایک دوسرے سے اس درجہ قریبی ہو تو ظاہر ہے کہ زندگی کو ہیجان سے محروم کرنا علمی و منطقی نقطہ نگاہ سے ناجائز ہے۔ روزمرہ کے مشاہدات سے اس کی تصدیق ہوتی رہتی ہے کہ ہر زندہ شے میں حرکت موجود ہے اور حرکت ہی زندگی کا مظہر ہے۔ نباتات کی دنیا میں گو بادی النظر میں سکون

نظر آتا ہے مگر مظاہرات زیر غور و بین اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ ان میں وہی ہیجانی کوائف موجود ہیں جو حیوانی جیو میں دکھائی دیتے ہیں۔ جدید ترین انکشافات اس ثبوت کے حامل ہیں کہ نباتی زندگی بھی احساسات رکھتی ہے اور اعصاب سے مزین ہے۔ یہ گویا احساس کی ابتدائی منزل ہے۔

المختصر حیات کا ہر اہم و غیر اہم شعبہ اس حقیقت کا علم بردار ہے کہ "زندگی سے ہیجان ہے اور ہیجان سے زندگی ہے"۔

اس حقیقت کے تسلیم کرنے کے بعد ہم پر یہ لازم آتا ہے کہ اس امر کی جستجو کی جائے کہ اس ہیجان کو قائم رکھنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اہم ترین عامل زندگی غذا ہے۔ اس غذا کی ترکیب تناسب و عنصری ساخت مختلف حالات میں مختلف پائی جاتی ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ غذا کے ضمن میں اس کا صحیح انہضام اہم نتائج پیدا کرتا ہے جب غذا کی صحیح طور پر تحلیل نہ ہو اور قدرتی تناسب سے اس کی تقسیم عمل میں نہ آئے تو حیات پر خراب اثرات مترتب ہونے لگتے ہیں جسے ہم اپنی اصطلاح میں بیماری یا خلل حیات کا نام دیتے ہیں اور جب اعتدال حیات ابتر ہوتا چلا جائے تو اس کی انتہا موت ہی۔

غذا کے مناسب تجزیہ اور تقسیم کے لئے ضروری ہے کہ قدرت کے مختلف مناظر کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس تناسب کے لئے مزید خارجی ہیجان کی ضرورت ہے۔ مثلاً جسم کا ہلنا۔ جلنا۔ چلنا پھرنا۔ اٹھنا بیٹھنا یا دوسری متعدد صورتوں میں اس ہیجان کو پیدا کرنا۔ یہ خارجی حرکت ہمیں قدرت کی ہر زندہ نوع میں نظر آتی ہے۔ سہل ترین مثال شیر خوار

بچے کی ہے جو ماں کا دودھ پینے کے بعد ہاتھ پیر ہلاتا ہے۔ اُٹھا سیدھا ہونے کی سعی کرتا ہے۔ اچھلنے کی کوشش کرتا ہے اس کی یہ ظاہری حرکت اس حقیقت پر دال ہے کہ فطرت اسے داخل شدہ غذا کے سچے انجذاب اور خوشگوار تقسیم وتناسب عناصر پر مجبور کرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہندوستانی مائیں لاڈ سے اپنے بچوں کو دوسے ایسے منسلک کرلیں گویا وہ ماں کی گود سے پیوست ہے یا مفلوک الحالی وعسرت اس امر پر مجبور کرے کہ وہ اسے اپنی پیٹھ پر گٹھری بنا کر رکھیں اور اس کی ترقی کے راستے میں تمام ممکنہ مزاحمت پیدا کریں مگر فطرت کا تقاضا تو یہی ہے کہ خارجی ہیجان کے زیر اثر غذا کی متناسب تقسیم عمل میں آئے اور حیات کا جزو لاینفک یعنی اس کا داخلی ہیجان قائم رہے۔ حیات کی اسفل تا اعلیٰ سب انواع میں یہ حرکت از بسکہ لوازمات میں سے ہے۔ حشرات الارض حتیٰ کہ زندگی کے یک خلیاتی مظاہر میں بھی ہمیں یہ بیرونی ہیجان بروئے کار نظر آتا ہے۔

اس خارجی ہیجان کا لزوم اور اس کے اثرات ایسی ناقابل تردید حقیقتیں ہیں جن سے بڑی حد تک دنیا کی مختلف تہذیبیں متاثر ہوئی ہیں۔

انسان کے حلقہ معاشرت میں قدم رکھنے کے بعد وہ انفرادی ہیجان اجتماعی صورت اختیار کرتا ہے اور ہم مختلف قوموں کو جہاں گشت وعالم پیما پاتے ہیں۔ کیا کوئی اس حقیقت کو مستور کرسکتا ہے کہ جو قومیں ہیجان آشنا رہیں انھوں نے ہمیشہ اقامت پسند اقوام کو اپنا مطیع ومنقاد بنایا۔ کیا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جہاں خارجی حملہ آور نہ پہنچا ہو اور اس سرزمین کو اس ہیجانی

ترجیح سے مغلوب نہ کیا اور وہاں کی امن جو و سکون طلب اکثریت کو اپنے حلقہ تقید میں نہ جکڑا ہو۔ اگر ہم قدیم اقوام کے متعلق ایک نظریہ قائم کریں۔ تو اسے یوں ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ " دنیا کے مختلف حصوں اور تاریخ انسان کے مختلف دوروں میں وہ قومیں زیادہ مدت کے لئے غالب رہ سکیں جن میں قدرت نے طلب مہم اور تلاش خطر کی خصوصیات دوسری قوموں کے مقابلہ میں زیادہ ودیعت کی تھیں"۔ تاریخ دنیا کے مطالعہ سے ہم پر یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ انسانی آبادی کی چاروں نسلوں یعنی نارڈک (Nordic) سیاہ فام (Negroes) میڈی ٹرینین (Mediterranean) اور زرد فام (Yellow race) میں نارڈک نسل ایسی ہے جس میں سب سے زیادہ ہیجانی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس نسل کی سب سے اہم شاخ آریاؤں کی ہے جنھوں نے تمدن عالم کی تعمیر میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ ہندوستان۔ ایران افغانستان ترکستان۔ یونان۔ برطانیہ و شمالی یورپ سب کے سب ممالک آریائی تہذیب کا گہوارہ رہے ہیں اور ان سب میں یونانی ایسے ہیں جنھوں نے حقیقی آریائی زندگی کے راز کو سمجھا اور یہی سبب تھا کہ انھوں نے علوم و فنون کی دولت کے علاوہ ورزش جسمانی کے علم و فن سے دنیا کو مالا مال کیا اور اجتماعی زندگی کی ایسی مثالیں قائم کیں جو آج بھی مہذب ترین قوموں کے لئے مشعل ہدایت ہیں۔ ذرا یونان کے ان نقوش پر نظر ڈالئے جو آج دنیا کے اجتماعی تخیل پر ہمیں نظر آتے ہیں۔ اولمپک مشعل اولمپیا سے برلن بڑی عقیدت سے لے جائی جاتی ہے اور دنیا کے منتخب و نمائندہ کھلاڑیوں کی ذہنیت پر ایک نئی کیفیت طاری

ہوتی ہے۔ اسپارٹا کا بھولا ہوا سبق پھر تازہ ہوتا ہے اور قوموں کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں طویل ترین دور حکومت مغلوں کا ہے جو وسط ایشیا کے خطرہ پسند ازبکوں میں سے تھے۔ امیر تیمور خطرات میں لطف حاصل کرتا ہے۔ بابر کی بے چین سیرت ہمیشہ خدشات کا تعاقب کرتی ہے ہمایوں محروم السلطنت ہونے کے بعد بھی وہی اضطرار پسند اور یک سیرت ہے اور سولہ سال کے بن باس کے بعد اپنی کھوئی ہوئی شہنشاہی کو اپنے قبضہ قدرت میں لاتا ہے۔ عربوں کی مملکت کا طویل المدت ہونا اس اجتماعی ہیجان کا نتیجہ ہے خلافت کے احکامات کے تحت فلاحت ممنوع ہے اور عربی فوجیں چھاؤنیوں میں فنون سپہ گری میں مصروف رہتی ہے۔ فوجوں کو مشغول مہم رکھنا عربوں کی مسلمہ حکمت عملی ہے۔

رومیوں نے چھ سو برس تک یورپ۔ افریقہ اور ایشیا کے زرخیز ممالک کو اپنے تصرف میں رکھا۔ تاریخ دنیا میں یہی ایک ایسی قوم ہے جس کا دور اقتدار طویل ترین ہے۔ ذرا ان کی تاریخ کا تحلیلی مطالعہ کیجئے اور ان قوانین کا مطالعہ کیجئے جن سے رومی شہری زندگی متاثر ہوتی ہے۔ آپ پر یہ روشن ہو جائے گا کہ سماجی ہیجان کو زندہ رکھنے کے لئے مجالس مقننہ آئین وضع کرتی ہیں اور عمال مملکت ان کی تعمیل اپنا عین مذہب گردانتے ہیں۔

آج بھی اس صنعتی و تجارتی دور میں قومیں کبھی اس اجتماعی ہیجان کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ برطانوی ہندوستان افواج کا باری باری سے سرحد پر متعین ہونا اور سرحد کے قبائل سے نبرد آزما ہونا اسی حکمت عملی کا ایک ورق ہے۔ جدید یورپ

اور مشرق بعید کے ماحول سے آپ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان قوموں میں اقامت پسندی کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور بالالتزام ہر بچے و بوڑھے کی رگوں میں برنائی و شباب کی کیفیات داخل کرنے کی مساعی عمل میں آتی ہیں

ان تاریخی مثالوں سے یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ خارجی ہیجان انفرادی واجتماعی زندگی کا قلب مضطرب ہے اور اسے سپرد تغافل کرنا آئین فطرت سے ارتداد کے مماثل ہوگا جو قومیں جادہ حیات پر گامزن رہیں گی وہی حیات آشنا رہیں گی اور جو اس سے انحراف کریں گی وہ امن وسکون کی تلاش میں جمود وفنا کی لپیٹ میں آجائیں گی۔ مگر اس لزوم کے ساتھ ساتھ یہ بھی امر بدیہی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں معاشرتی حالات نے چند پیشے وشعبے ایسے مرتب کر دیئے ہیں جو اپنے مشاغل کے اعتبار سے بڑی حد تک اسی خارجی ہیجان سے محروم اور بدیں سبب بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ برائے مثال اہل فکر واہل علم کو لیجئے۔ ان کا بیش بہا جوہر زندگی فکر وتفحص کی نذر ہو جاتا ہے۔ ان تاجروں اور اہل حرفہ پر غور کیجئے جو اپنی مصروفیات کے لحاظ سے تقاضائے فطرت کے خلاف اپنے اعضا کو جائز ریاضت تک نہیں دے سکتے۔ مگر دنیا کی آبادی میں علی الخصوص ہمارے ہندوستان میں ایک طبقہ جو اس اشتہائے حیات کی تکمیل مطلق نہیں کر سکتا طلبا کا ہے جن کی موجودہ صحتیں قومی وملکی زاویہ اعتبار سے گری ہوئی اور جن کی جراثیم خوردہ تندرستیاں فوری توجہ کی محتاج ہیں۔ انفرادی اور مجموعی نقطہ نگاہ سے ہم سب کا فرض ہے کہ ہماری وہ قومی دولت و دولت آفریں وقت جو ان آئے دن کی بیماریوں کی بھینٹ چڑھتا ہے،

محفوظ کر لیا جائے اور قوم کی توانائی و کارکردگی میں معقول اضافہ کی صورت پیدا کی جائے۔

ممالک محروسہ سرکار عالی کے علمی اداروں کے شرکا کی جو جسمانی حالت ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کے مدارس کے بچے رنگ و روپ۔ توانائی۔ قامت اور ڈیل ڈول میں دوسرے ممالک کے بچوں سے کسی شعبہ زندگی میں مسابقت کا بار نہیں اُٹھا سکتے اس تنازع للبقا کے دور میں کسی قوم۔ گروہ۔ جماعت یا طبقہ میں مقابلے کی سکت کا نہ ہونا یا کم ہونا خطرات کا پیام بر ہے۔ ذرا جاپانی طلبا کے مشاغل روزانہ کا مطالعہ کیجئے تو آپ پر یہ روشن ہو جائے گا کہ وہاں کے مدارس کے بچے ہمارے بچوں کے مقابلے میں جسمانی و دماغی لحاظ سے بہت آگے ہیں اور ان میں بیماریوں کی قوت مزاحمت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ اس پر اس قوم کی یہ منتظم کوشش ہے کہ ان کی توانائی میں مزید اضافہ ہو۔ جرمنی یا اطالیہ کے دس برس کے بچے کا موازنہ اس عمر کے ہمارے طالب علم سے کیجئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہم تصور سے خجل و نادم ہونے لگتے ہیں۔

قدرت نے جاپانی کو چھوٹا قد دیا جس کے باعث اسے دوسری طویل القامت قوموں کے مقابلے میں ایک کمزوری دکھائی دیتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ وہاں کے ماہرین فن تعمیر جسمانی نے دس سال میں جاپانی بچوں کا قد اوسطاً فی لحاظ سے بقدر ڈیڑھ انچ کے لمبا کر دیا ہے اور ان کی یہ پیش گوئی ہے کہ پچاس سال کے عرصے میں اوسط جاپانی اوسط یورپ سے پست نہ رہے گا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

جاپان نے گزشتہ تین سال اور اطالیہ نے صرف پندرہ سال میں اپنی قوم کی جسمانی تربیت و تقویت میں جو انقلاب کر دکھایا ہے وہ تمام دنیا کے لئے ایک کھلا سبق ہے کہ متواتر و منظم کاوش سے قوموں کی جسمانی کیفیات ایک نئے سانچے میں ڈھالی جا سکتی ہیں۔

اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے ہمیں مفر نہیں کہ ہم قومی زاویہ نظر سے ناقص الجسم ہیں اور ہمارے نوجوانوں میں وہ خطرہ جوئی مفقود ہے جو دوسری اقوام میں بدرجہ اتم موجود ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی مسلم الثبوت ہے کہ پیہم جستجو و عرق ریزی سے کایا پلٹ سکتی ہے اگر ہم تعمیر قوم و ملک کو اپنا جزو ایمان بنالیں تو سب مشکلات آسان ہو سکتی ہیں۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام بیس سال کے عرصے میں ناخواندہ ملک کو خواندہ بنا سکتا ہے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ ہم فرداً واراً سعی کر کے اپنے بچوں میں وہی اولوالعزمی و مہم پسندی پیدا کر دیں جو دوسری قوموں کا سرمایہ ناز ہے۔

مدارس و ادارات علمی کی اجتماعی صحت کی بہتری کے مد نظر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ریاضت جسمانی کے مسئلے کا تجزیہ کریں اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے ورزشیں منتخب کریں جسمانی تربیت کے لئے جو تراسیم اور نظامات مختلف اہل عمل نے پیش کئے ہیں ان سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ مالش کی مجہول ورزش سے لے کر دمشت آزمائی، باکسنگ و کشتی کی حد تک ورزش جسمانی کے کئی مدارج ہیں۔ اب ہمارے ماہرین فن کا یہ فرض ہے کہ اپنی زیر تربیت

جماعتوں کی موجودہ تاب وتواں کا مطالعہ کرکے مناسب درجے سے ابتدا کریں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک کمزور شش اور ضعیف الاعصاب بچے کو قطب جنوبی کی دریافت کے لئے روانہ کیا جائے یا سر میلکم کیمبل کی طوفان بدوش موٹر میں طبع آزمائی کے لئے بٹھا دیا جائے مگر اس کے ضمن میں یہ آشکارا کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہم اس سہل تدریج کے قائل نہیں جو اس اسراع (Acceleration) سے بے خبر ہو۔ ایک قوم کی تعمیر میں نفسیاتی مواقع کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ موزوں موقع پر غیر معمولی تغیر خوشگوار نتائج پیدا کرتا ہے۔

ہمارے ملک کی موجودہ صحت اس امر کی متقاضی ہے کہ بچوں کو صبح کے وقت کھلے میدانوں میں ورزش کرائی جائے۔ ابتدا میں صرف پندرہ منٹ کافی ہوں گے اور افتتاحی ریاضتیں ایسی ہونی چاہئیں جن کا اصلاحی تعلق زیادہ تر معدہ، جگر اور پھیپھڑوں سے ہو۔ ملر (Muller) کا پیش کردہ نظام ایسا ہے جس سے موزوں ابتدا کی جاسکتی ہے کیونکہ اس کی بتائی ہوئی ورزشوں میں زیادہ تر زور لمبی سانس کھینچنے اور پیٹ کے مختلف عضلات کو موڑنے توڑنے پر دیا گیا ہے جس سے امعا (آنتوں) کے فاسد مادے جو اکثر بیماریوں کی جڑ ہوتے ہیں اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں۔ دوران خون کی تیزی سے غیر ہضم شدہ اجزا ہضم ہونے لگتے ہیں یا خارج ہو جاتے ہیں۔ کھلی ہوا میں سانس لینے سے آکسیجن مناسب مقدار میں پھیپھڑوں میں پہنچتی ہے اور خون کی کاربن کو جو جسم کے خلیات کے جلنے سے خون میں آجاتی ہے کاربن ڈائی اکسائیڈ میں بدل کر

بذریعہ سانس خارج کر دیتی ہے۔ جلد میں مختلف قسم کے سمی مادے پسینے کے راستے خارج ہوتے ہیں اور ان کی جگہ تعمیری اجزا لے لیتے ہیں۔ ملر کے نظام کا سب سے اہم مقصد غذا کا صحیح ہضم کرنا ہے۔ جب غذا صحیح طور پر ہضم ہونے لگتی ہے تو اس پیچیدہ مشین کے سب پرزے اپنی اپنی جگہ کام کرنے لگتے ہیں۔ خون کی صحیح تولید ہوتی ہے۔ اعصاب کو مناسب غذا و اعانت ملتی ہے جس سے دل و دماغ پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ یہ نظام فی الحقیقت موجودہ مرحلہ صحت لابد ہے۔ اس کے بعد دوسری منزلوں میں داخل ہونے کے لئے تدابیر و ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

جب اعضائے رئیسہ کی درستی عمل میں آجائے اور جب ہمارے ماہرین یہ محسوس کرنے لگیں کہ بچوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں تو ایک نقلابی سعی سے ان کی توان آزمائی ہونی چاہئے۔ اگر وہ اس امتحان میں پورے اتریں تو درجہ ثانی میں تعمیری اعتبار سے ورزش کے دوسرے نظام الاوقات پر عمل کیا جانا چاہئے جس میں کبھی کبھی انھیں ادنی درجے کی مہم وری میں مشغول کیا جائے اور جب ایک مناسب مدت گزرنے پر جسمانی حالات حوصلہ افزا نظر آئیں تو انھیں پہلے کے مانند آزمائش ثانی میں گزار کر درجہ اول کی جسمانی ریاضت کے لائق بنایا جائے۔ اور دفاعی بسالت کے ساتھ ساتھ مہم کوشی اور جستجو خطرہ کی شان پیدا کی جائے۔ موجودہ کوائف عالم کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ملک کے بچوں کو درجہ اسفل سے نکال کر جس میں ہمارے بچے چھپکلی اور مینڈک کو دیکھ کر ماؤں کی گود میں جا بیٹھتے ہیں کم از کم اس قابل بنا دیں

کہ وہ شیر کی دہاڑ سن کر اپنے اوسان سے بیگانہ نہ ہو جائیں اور رات میں اگر گھر میں چور گھس آئے تو لحاف نہ اوڑھ لیں۔ آج بھی ہمارے ملک میں شاذ و نادر ہی سہی ایسے ناگوار واقعات ایسے سننے میں آتے ہیں جو ہمارے لئے وجہ صد حوصلہ ہیں۔ ان لوگوں کو یہ شجاعت ورثہ میں نہیں ملی۔ اس میں کا بڑا جزو حالات و کوائف کے زیر اثر متشکل ہوا ہے۔

ایک مزاحمت ہمارے راستے میں یہ ہے کہ ہمارے ملک کے والدین کم ازکم ان کی مائیں اس بزدلی و کمزوری کا سبب ٹھیرتی ہیں اور اس جرم کو کچل دیتی ہیں جو قدرت ہر بچے میں ودیعت کرتی ہے۔ جب مدرسے سے واپس آنے کے بعد ماتنا کی ماری غریب ماں بڑے لاڈ سے بچے کی نظر اتارے تو یہ سمجھ لیجئے کہ بچے کا مستقبل تاریک ہوگیا۔ ایک طرف ہم ہیں کہ حیدر آباد سے نظام آباد اگر کسی کا تبادلہ ہوگیا تو مارے امام ضامنوں کے ڈنڈ میں گٹھلیاں آجاتی ہیں اور ریلوے اسٹیشن پر کا منظر خواہ مخواہ جذبات میں رقت پیدا کرکے آنکھوں کو نمناک بنادیتا ہے اور دوسری قومیں ہیں جو خطرہ ڈھونڈتی ہیں آپ ان ہوائی جہازوں کے روزمرہ کے واقعات پڑھئے کتنی جانیں گزشتہ تیس سال میں اس سے ضائع ہوئی ہیں مگر ہر نیا سانحہ ایک نئے ولولے کی تخلیق کرتا ہے۔ جاپانی بچوں کا برف میں کھیلنا دیکھئے۔ ہمارے ہاں تو باسی پانی سے نزلہ ہونے لگتا ہے۔ افریقہ کے جیسا تمازت آغوش بر اعظم اس وقت سب کا سب اس یورپ کے قبضے میں ہے جن کے ہاں سو درجے سے شاید ہی کہیں اوپر پارہ کوئی درجہ چڑھتا ہو۔ بڑی ندامت کی بات ہے کہ نانگا پربت۔ دھولگری کی بلندیاں سر کرنے

کے لئے ہمیں یورپ سے آتی ہیں اور ہم آرام کرسی پر اخبار پڑھ کر اس پر تھوڑی سی حیرت کر لیتے ہیں۔ جو خجالت و رسوائی اس وقت ہم پر طاری ہے اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ انفرادی و اجتماعی اعتبار سے ہم شجاعت ناآشنا ہیں اور اگر کوئی صلاحیت ہوتی بھی ہے تو ہمارے ہاں کی محبت بھری مائیں اس کو چور دانت کی طرح مسل ڈالتی ہیں۔ اس صورت حالات کے دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم نسواں کی اشاعت میں ہم غایت درجہ سعی کریں اور ان موانع کا استیصال کریں جن سے ہماری کوششوں کے متاثر ہونے کا احتمال ہو علاوہ بر آں یہ بھی ضروری ہے کہ عام نظام تعلیمی میں تغیرات پیدا کئے جائیں اور حصول علم کے ساتھ ساتھ یہ امر ملحوظ رکھا جائے کہ بچوں کے دماغ پر ایسا بار نہ پڑے کہ ان کی صحتیں اور دماغی اہلیتیں کمزور پڑ جائیں۔ دماغی محنت کے ساتھ ساتھ اگر ریاضت جسمانی باقاعدہ طور پر جاری نہ رکھی جائے تو اس امر کا امکان ہے کہ انسانی دماغ ایسے مشاغل کی جانب مائل ہو جائے گا جو قوم کی تعمیری زندگی کے منافی ہوں گے۔

"Sound mind within a sound body"

یہ ایسی حقیقت ہے جسے زریں حروف میں لکھا جانا چاہیئے۔ ان کے سامنے وقتاً فوقتاً ایسے واقعات بیان کئے جائیں جن سے ان کا تخیل اثر پذیر ہو۔ خاص مواقع پر ان کو دوسرے مقامات اضلاع بلکہ دوسرے صوبوں میں پھرایا جائے تاکہ ان کی پابند قوت عمل کو جرأت سے ہم کنار ہونے کا موقع ملے۔

اس سلسلے میں ایک اور امر مستحق توجہ ہے۔ بچوں کے غیر درسی مشاغل اور ان کے اہم نتائج کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لازمی ہے

کہ ایک خاص ضابطہ کے تحت طلبار کی فرصتوں پر خوشگوار نگرانی ہوتا کہ ہماری جد وجہد کے نتائج پر ناگوار اثرات مترتب نہ ہوں سینما۔ تھیٹر۔ ہوٹل۔ رسٹارنٹ ایسی تفریح گاہیں ہیں جن کی موزونیت کا مطالعہ ہمارا عین فرض ہے۔ مہذب ممالک میں بچوں کو وہ کھیل دیکھنے کا موقع ہرگز نہیں ملتا جن سے ان کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے اور قومی اجتماعی زندگی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

تعمیر جسم کے مسئلے کی چھان بین کرتے وقت ہم اس غذا کو نظر انداز نہیں کر سکتے جس سے تعمیر ہوتی ہے اگر ہماری یہ تمنا ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں جوانمرد۔ صحیح الجثہ۔ صحیح الدماغ۔ اور صحیح السیرت ہوں تو ہمارا یہ بھی فرض ہوگا کہ ان کی غذا کی موزونیت پر غور کرکے عملی تدابیر اختیار کریں۔ اگر ہم کسی غریب بچے سے صبح کے وقت سخت جسمانی ورزش لیں اور دن بھر دماغی ریاضت ہوتی رہے تو جسم کے ان خلیات کا جو اس دوہری مشقت کی وجہ سے جلتے یا سوکھتے ہیں ازالہ کیونکر ہوگا۔ اس میں کلام نہیں کہ جو غذا اسے ملتی ہے اس سے ایک حد تک پا بجائی ہوتی ہے لیکن انسان کے خالص تعمیری دور میں اس حد تک قدرت سے شمشیر آزمائی کرنا اور بموجب طبی اصطلاح کے درپے تخریب رہنا غیر معمولی غذا کا مقتضی ہے۔ ہمارا یہ کہنا نہیں کہ اسے مرغن غذائیں دی جائیں ہرگز نہیں۔ ہم کیا اس وقت تمام طبی دنیا ان غذاؤں کو نقصان دہ ثابت کر چکی ہے۔ غذائیں ہلکی ہونی چاہئیں مگر ان میں تعمیری جزو ایک معقول تناسب میں ہونا چاہئے مثلاً گائے کا دودھ ان بچوں کے حق میں جن سے متضاد مشقتیں لی جاتی ہوں۔ غایت

درجہ ضروری ہے اور اس دودھ کا انتظام بھی حفظان صحت کے اصولوں کے تحت ہونا چاہیئے اگر ہم دودھ کے مہیا کرنے میں ان اصولوں کو مدنظر نہ رکھیں تو اس امر کا امکان ہے کہ بجائے فائدے کے نقصان اور ہمارے مطمح نظر کا حصول محال ہو جائے بہر نوع قومی اجتماعی زندگی میں اس غذا کی ایسی شدید ضرورت ہے جسے اہم نہ سمجھنا شکست مقصد کے مرادف ہوگا۔

نواہی کے سلسلے میں ایک اور امر بھی توجہ طلب ہے۔ تمباکو نوشی ایک ایسی وبا ہے جو تقریباً تمام مہذب۔ نیم مہذب وغیر مہذب دنیا کو محصور کرکے اسے اپنے خونی پنجے میں جکڑ چکی ہے۔ مسر والٹر ریلے نے ورجینیا کی اس لعنت سے جو دنیا کو لذت آشنا کیا ہے ہم اس کے تخمینۂ تخریب سے قاصر ہیں گو بظاہر ہم اس مخرب عالم نیم مسکر کی روز افزوں ترقی کو روکنے سے مجبور ہیں لیکن اتنا ممکن ہے کہ اپنی قوم کے بچوں کو اس بلا سے ان کے تعمیری دور کی حد تک بچالیں۔ اب ذرا آپ غور کیجئے جسمانی محنت دماغی ریاضت ناقص غذا شغل سینما پر جائے اور ان سب پر سگریٹ نوشی کا اضافہ کیا جائے تو بچے کے اعصاب میں کیا رہ جائے گا۔ میری تو یہ خواہش ہے کہ قانون اور ضابطے کے زور سے مدرسوں اور کالجوں میں اس عادت بد کا استیصال کیا جائے۔ شراب نوشی دراصل تمباکو نوشی سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ لیکن اس کے پینے والے تعداد میں کم ہیں۔ تمباکو پینے والے بادہ نوشوں سے کئی گنے ہیں۔ اگر ہم الجبرا کی ایک مساوات اعداد و شمار سے ترتیب دیں تو سگریٹ و تمباکو کے اجتماعی نقصانات شراب سے کم نہ ہوں گے۔ یہ مسئلہ پوری قوم کی اجتماعی توجہ کا محتاج ہے۔

المختصر ہماری اجتماعی قومی زندگی اس ضرورت کی طالب ہے کہ ہمارے مدارس میں ورزش جسمانی کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس کے نفاذ میں ان تینوں مدارج پر نظر رہے۔ تعمیری غذا کے لئے انتظام ہو اور وہ معاشرتی معائب جو ہماری سماجی زندگی کا گھن ہیں شد و مد سے مسدود کر دئیے جائیں۔ تب ممکن ہے کہ ہم پچیس سال گزرنے کے بعد دوسری قوموں کے دوش بدوش زندگی بسر کر سکیں۔

وما توفیقی الا ما شاء اللہ

رازِ حیات

از

جناب مولوی غلام طیب صاحب مدیر نورس

ستارہ صبح کی صدا ہے کہ "جاگ او بے خبر مسافر"
سحر کے نغمے پکارتے ہیں "بہت ہے باقی سفر مسافر"

شرارہ دل کا نور مضطر۔ چراغ ہے راہ زندگی کا
نہیں اگر یہ۔ تو راہ کیسی۔ سفر کہاں کا کدھر مسافر

جنونِ دل کا یہ مشورہ ہے۔ سفر سفر ہے سفر ہی منزل
خلش یہ تلووں کی چاہتی ہے۔ بنے رہو عمر بھر مسافر

سکون و آرام موت ہے موج بحر سے پوچھ لو یہ نکتہ
نہیں ہے گردابِ زندگانی میں کوئی زندہ مگر مسافر

نگاہ کے رنگ روپ ہیں سب چمن چمن کی ہزار شانیں
یہ ہستیاں ہیں فریب ہستی اِدھر مسافر اُدھر مسافر

شجر کا سایہ ہے دامِ صیاد۔ اُس طرف بھول کر نہ جانا
قدم قدم پر لگے ہیں رہزن۔ نہ سو کمر کھول کر مسافر

ابھی سے تھک تھک کے سو رہے گا تو نیند آئیگی کیا لحد میں
قدم میں دم ہے تو بس چلا چل۔ چلی ہے باد سحر مسافر

جرمنی اور جرمن قوم

از جناب مولوی سید انیس الحق صاحب ایم اے حال مقیم لیڈس

انگلستان میں موسم گرما کی تعطیلات بڑی لمبی ہوتی ہیں دور و دراز ممالک کے طالب علموں کے لئے تعطیلات سے قبل یہ مسئلہ قابل غور ہوتا ہے کہ چھٹیوں کا زمانہ کہاں گزارا جائے اور یورپ کے کن کن ملکوں کی سیر کی جائے کیونکہ واپسی ہونے کے بعد دوبارہ یورپ کا سفر بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے مزید برآں یورپ کے ممالک میں بیرونی سیاحوں کے لئے رعایتی کرائے کے علاوہ اور بہت سی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں ہندوستان میں یہ چیز ذرا مشکل سے سمجھ میں آئے گی کہ یورپ میں سفر اور سیاحت تعلیم کا جزو اعظم ہے یورپ میں ہر جگہ طالب علموں کے لئے بہت کم اخراجات سے سیاحت کا انتظام کیا جاتا ہے اور بعض وقت مختلف ممالک کے درمیان طلبار کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً فرانس کے کچھ طالب علم انگلستان بھیجے جاتے ہیں اور ان کے بدلہ میں انگلستان کے طلبہ فرانس جا کر وہاں کی سیر کرتے ہیں میرے لئے یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل تھا کہ میں کس ملک میں یہ چھٹیاں گزاروں ایک طرف پیرس کی نمائش اور فرانس کی زندہ دلی کی دلربائی تھی دوسری طرف آسٹیریا۔ تیرل اور سویٹزرلینڈ کی حسن کاردوکانیں اور جمالیاتی دلچسپیوں کی کشش تھی جن کو چھوڑنا مشکل تھا۔ اٹلی کے نیلگوں آسمان اور دھوپیلے میدان اپنا حق مانگتے تھے سب سے زیادہ جرمنی کی عجیب و غریب قوم اور اس کا

پر جوش تمدن اپنی طرف مجھے کھینچتا تھا۔ میرے پاس نہ تو اتنا روپیہ تھا نہ وقت
کہ میں ان سب ملکوں کی سیر کرتا اس لئے میرے ایک ہندوستانی دوست اور
ایک جرمن خاتون نے میرے لئے سیاحت جرمنی کا نظام العمل بنا دیا میرا منشا بھی
جرمنی جانے کا تھا اور مجھے یہ دیکھنے کا شوق تھا کہ جنگ عظیم کے بعد نازی حکومت
نے کس طرح جرمنی کو سنبھالا اور اس کی کایا پلٹ دی۔ جرمنی کے علاوہ میں نے
پیرس کی بین الاقوامی نمائش بھی دیکھی اور دو ہفتے سوئیٹزرلینڈ اور بلجیم میں بھی
ٹھیرا۔ جرمنی میں ہمارا قیام تین ہفتے رہا اور ہم نے میونخ۔ برلن۔ ہائیڈل برگ
بیڈن۔ بیڈن سینٹ گوور۔ بون کولو اور ڈیوسل ڈورف کی سیر کی اور دریائے
رائن میں منیز سے کولونک اسٹیمر کا سفر بھی کیا جن حضرات نے ایسے ممالک
کا سفر کیا ہے جہاں کی زبان سے وہ ناواقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ
ہم کو جو جرمنی زبان سے نابلد ہیں کیسی دشواریاں پیش آئی ہوں گی برلن اور میونخ
جیسے بڑے شہروں میں تو زیادہ دشواری نہیں پیش آئی کیونکہ یہاں معمولی سے
معمولی ہوٹل میں بھی ایک نہ ایک انگریزی بولنے والا ملازم رہتا ہے۔ مگر
سینٹ گوور اور ہائیڈل برگ جیسے چھوٹے قصبات میں میلوں تک انگریزی
زبان سمجھنے والے آدمی سے ملاقات نہ ہوئی جرمنی زبان کو انگریزی زبان سے
کوئی علاقہ نہیں اور اس کا بولنا بہت مشکل ہے بعض مواقعہ بہت پُر لطف ہوتے
تھے جب ہم ایک "انگریزی۔ جرمنی" جیبی لغت کے ذریعہ الفاظ نکالتے تھے مگر
صحیح تلفظ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ان کو نہ سمجھ سکتا تھا بسا اوقات ہم کو یہ کرنا پڑتا
تھا کہ بولنے کی بجائے ہم وہ الفاظ کاغذ پر لکھ دیتے تھے اور وہ کاغذ کسی راہ رو

کے سامنے پیش کرتے تھے اس کے جواب میں وہ ہم سے اس طرح گفتگو کرتا تھا جیسے کوئی گونگوں کو سمجھائے۔ آپ ہم سے یہ پوچھیں گے کہ ہم نے جرمنی اور جرمن قوم کے متعلق کیا رائے قائم کی جرمنی زبان سے بے بہرہ بھلا میں کیا خاک بتا سکتا ہوں جرمنی کے مسائل بہت وسیع اور پیچیدہ ہیں اور ہٹلر نے ان کے لئے جو تدابیر اختیار کی ہیں ان کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے نازی حکومت عزیمت تامہ اور سخت توانین کے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے گو ہمارا سفرِ جرمنی میں بالکل سرسری تھا لیکن اس کے باوجود جرمنی کی قومی اور سماجی زندگی کے چند نمایاں پہلوؤں نے ہم کو خاص طور پر متاثر کیا پہلی بات جو ایک سیاح کو بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے یہ ہے کہ جرمنی میں ہر چیز بہت منظم ہے اور ہر تنظیم میں کسی نہ کسی شکل میں حکومت کا فولادی ہاتھ کام کر رہا ہے جرمنی میں جانے سے پہلے سکّہ کے تبادلہ کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے روپیہ کے بدلہ میں آپ کو جرمنی سکّے نہیں ملتے بلکہ ہنڈیاں جن کے بدلے میں جرمنی میں آپ کو پچاس مارک تک روزانہ خرچ کے لئے مل سکتے ہیں۔ لیکن اس سے زاید ایک حبّہ نہیں۔ جرمنی کی سرحد میں داخل ہوتے ہی آپ کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ آپ کے پاس کتنی رقم ہے یہ رقم ایک رسید میں مندرج کر دی جاتی ہے جرمنی سے واپس آتے وقت اگر آپ کے پاس اس مقدار سے ایک حبّہ بھی زیادہ ہو تو حکومت اس کو ضبط کر لیتی ہے آپ جرمنی سے باہر ایک پائی نہیں بھیج سکتے پٹہ خانے میں بیرونی ڈاک کی سخت تنقیح کی جاتی ہے ایک نئے شخص کو اس سخت ضابطہ سے نہ صرف اچنبھا بلکہ تکلیف بھی ہوتی ہے لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ ۱۹۱۶ء سے

۱۹۲۷ء تک جرمنی مالیات کی کیا حالت تھی اور جرمن سکہ کیسا بے قیمت ہو گیا تھا وہ مندرجہ بالا ضابطوں کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ جرمنی روپیہ دوسرے ملکوں میں نہ جلنے پائے جرمنی کی چوسالہ اسکیم میں جس کا منشا جرمن کی اقتصادی اور مالی استواری ہے مندرجہ بالا قوانین کو خاص اہمیت حاصل ہے نازی حکومت کی دوسری نمایاں چیز جرمنی نوجوانوں کی وسیع تنظیم ہے جو تحریک "نوجوانانِ جرمنی" کے نام سے یاد کی جاتی ہے یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ جرمنی میں امریکن اور انگلش تخیل تعلیم کے برخلاف یہ سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم افراد کی تربیت کا ایک ذریعہ ہے اور ہر فرد کا وجود قوم اور حکومت کے لئے ہے قومی اقتدار اور اس کی افضلیت کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ جرمنی میں جنگ عظیم سے بہت پہلے یہ تخیل موجود تھا ہٹلر نے اسی تخیل کو عملی جامہ پہنا کر اس قدر نمایاں کر دیا ہے کہ جرمنی میں ہر ادارہ نوجوانوں کو قوم اور حکومت کی خدمت کے لئے تیار کرتا ہے انگلستان کی طرح جرمنی میں بھی چودہ برس کی عمر تک ہر شخص کو اسکول جانا پڑتا ہے مگر انگلستان میں اس عمر کے بعد پیشے کے انتخاب میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے جرمنی میں ایسا نہیں ہے یہاں ختم تعلیم کے بعد ہر شخص کو چھ مہینے سے لے کر دو سال تک لیبر کیمپ میں رہنا پڑتا ہے اس سے فارغ ہونے کے بعد مردوں کو دو سال تک فوجی تعلیم دی جاتی ہے اس کے علاوہ ہر جرمن نوجوان کا فرض ہے کہ وہ جرمنی کے مختلف حصوں کی سیاحت کرے اور تجربہ حاصل کرے اس کا اہتمام حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے جس کو (K. D. F.) کہتے ہیں اس انجمن کے بیسیوں جہاز دریائے رائن کی سطح پر نظر آتے ہیں جس میں بچے اور

بوڑھے موسم گرما میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ میں نے بھی چند افسروں کی دعوت پر ایسے ہی ایک جہاز میں مینز سے کولون تک سفر کیا۔ جہاز میں کم وبیش ۵۰۰ جرمن ہر عمر کے تھے جو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے اور سیاحت کا لطف اُٹھاتے تھے۔ موسم گرما میں ہر جگہ ایسی ٹولیاں جرمنی میں گھومتی نظر آتی ہیں۔ کاش کہ ہمارے ملک میں بھی نوجوانوں کی سیاحت کے لئے ایسی ہی آسانیاں پیدا کی جاتیں تاکہ وہ اپنے ملک کے حالات سے کماحقہٗ واقف ہوتے۔ میرے خیال میں قومیت کی زنجیروں کو استوار کرنے اور ملک کے دور و دراز علاقوں میں اخوت پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی......

"تحریک نوجوانانِ جرمنی" کی سب سے نمایاں خصوصیت انکا لیبر کیمپ ہے۔ جہاں مدرسوں سے نکلنے کے بعد ان کو تھوڑے دنوں رہنا پڑتا ہے یہ ایک قسم کا فوجی ادارہ ہے جس کا منشا یہ ہے کہ نوجوانوں کو توانا اور مضبوط بنایا جائے اور ان میں جفاکشی اور محنت کی عادتیں پیدا کی جائیں...... لیبر کیمپ کی وضاحت کے لئے میں ایک چھوٹے سے کیمپ کا حال بیان کرتا ہوں جو میں نے دریائے رائن کے ساحل پر دیکھا موضع لوربی کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر یہ کیمپ واقع ہے بلندی کی وجہ سے دریائے رائن کے پیچ وخم سبزہ زار اور پرانے قلعوں کے آثار چاروں طرف نظر آتے ہیں نشیب میں انگور کے باغات ہیں کیمپ میں چھوٹے چھوٹے جھونپڑے کھلے میدان میں بنائے گئے ہیں کیمپ کے پھاٹک پر فوجی وردی میں ایک جرمن نوجوان پہرہ دے رہا تھا اس کے ہاتھ میں ایک پھاوڑہ تھا ہم نے اس کو اپنا اتا پتا بتایا اور کیمپ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی

اس نے ایک دوسرے افسر کو بلوایا جس نے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا اور کچھ دیر تامل کرنے کے بعد ہمیں کیمپ دیکھنے کی اجازت دی کیمپ میں چھوٹے چھوٹے سیکڑوں کمرے تھے جن کا فرنیچر مختصر تھا یہ سب چیزیں کیمپ والوں ہی کی بنائی ہوئی تھیں کیمپ کے رہنے والے بڑے بڑے ملوں میں کام کرتے تھے اپنا کھانا پکاتے تھے اپنے کپڑے دھوتے تھے صفائی کا کام بھی خود انھیں کو کرنا پڑتا تھا ہر روز کا ایک نظام الاوقات پہلے سے تیار ہو جاتا تھا وہ علی الصباح اٹھتے تھے کچھ لوگ کھیتوں کو چلے جاتے تھے کچھ صفائی اور پخت و پز کا انتظام کرتے تھے سہ پہر کو وہ سب جمع ہوتے تھے اور ان کے سامنے جرمنی کے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر مختصر تقریریں ہوتی تھیں اس کے بعد ان کو ورزشی کھیلوں میں حصہ لینا پڑتا تھا ان کی غذا سادہ لیکن قوت بخش تھی کیمپ میں امیر و غریب ہر طبقہ کے لوگ تھے۔ لیکن وہ ایسے مل جل کر رہتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا یہ ایک ہی خاندان کے رکن ہیں ان میں کسی قسم کا امتیاز نہ تھا ان کیمپوں میں نہ صرف محنت کی عظمت کے مظاہرے ہوتے ہیں بلکہ نوجوانوں میں مساوات اور اخوت کا بیج بویا جاتا ہے ایسا ہی ایک ادارہ جرمنی کی لڑکیوں کے لئے بھی ہے جہاں ان کو محنتی شریف بیوی اور عقلمند ماں بننے کی تعلیم دی جاتی ہے جہاں وہ ۱۷ سال کی عمر میں داخل ہوتی ہیں اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ ایسی تعلیم کے بعد جرمنی قوم نے جنگ عظیم کے نقصانات کی تلافی اس قدر جلد کر دی ہندوستانیوں کو جو محنت میں کسر شان سمجھتے ہیں جرمنی سے سبق لینا چاہیئے ہندوستانی نوجوانوں کو فخر و مباہات کے جھوٹے

خیالات دل سے نکال دینا چاہئے اور محنت اور جفاکشی کو اپنا مطمح نظر بنانا چاہئے
..... اب میں ہٹلر کے چو سالہ پروگرام سے اقتصادی پہلو پر کچھ مختصر تبصرہ کروں گا
ہم سب جانتے ہیں کہ جرمنی جنگ عظیم کے بعد اپنی نوآبادیات سے محروم کردیا
گیا خام پیداوار کے ذرائع محدود ہو گئے چھ کروڑ کی آبادی بڑے بڑے صنعتی کارخانے
کپاس اون۔ لوہا۔ ربر۔ پٹرول۔ گوشت گیہوں اور دوسری غذائیات میں جرمنی
دوسرے ملکوں کا دست نگر ہو گیا۔ ہندوستان والے جن کے ملک میں تقریباً
ہر چیز پیدا ہوتی ہے ان مصیبتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو جرمن جیسی صنعتی
قوم پر عائد ہوئی۔ ملک کی بیشمار دولت خام اشیاء کی خرید کے لئے باہر چلی گئی ۱۹۳۳ء
میں جب نازی جماعت برسر اقتدار ہوئی تو انھوں نے اپنے سیاسی اقتدار اور
صنعتی اصلاح کے لئے جدوجہد شروع کی ..... معاشیات کا ہر طالب علم جانتا ہے
کہ اقتصادی فارغ البالی کے بغیر سیاسی اقتدار ناممکن ہے نوآبادیات کے نکل جانے
کے بعد جرمنی کو صنعتی اشیاء کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کرنے پڑے۔ اس
نازک وقت میں جرمنی کے سائنس دانوں کی عقل و فراست نے بہت مدد دی
اور ملک کو خام اشیاء سے بے نیاز کر دیا اس وقت جرمنی میں لکڑی کوئلہ چاک
پانی اور ہوا سے ربڑ کانچ اون اور سوت کے کپڑے بنائے جا رہے ہیں ہم نے
ڈیوسل ڈورف کی صنعتی نمائش میں ان اشیاء کو دیکھا اور اس سائنٹیفک عمل کو بھی
دیکھا جس سے یہ چیزیں تیار کی جاتی ہیں ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ
لکڑی کے گودے سے نرم و نازک زنانہ لباس اور مردانہ پوشاک تیار کی جاتی ہیں
لکڑی سے شکر۔ چاکلیٹ۔ سرکہ۔ گلیسرین۔ مویشیوں کے لئے چارہ اور دوسری

عجیب و غریب چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ نمائش میں ریل کا ایک نفیس ڈبہ تھا۔ جو صرف لکڑی سے تیار کیا گیا تھا لکڑی کی نشستیں تھیں لکڑی ہی کا چمڑا لکڑی ہی کے پردے لکڑی ہی کا پائپ۔ لکڑی ہی کا فرش لکڑی ہی کا رنگ اور لکڑی ہی کی پالش تھی۔ اسی طرح کوئلہ سے صابون اور دوسری اشیا ر تیار کی جاتی ہیں۔ ایک انگریز سیّاح نے ۲۷ راگست ۱۹۳۷ء کے اخبار ڈیلی ہیل میں اس نمائش کے متعلق لکھا ہے "ایک سائنسداں لکڑی کا سوٹ پہنے لکڑی کی ٹائی لگائے ہمارے سامنے آیا۔ لکڑی کا تھیلا کھولا اور لکڑی کے چھچے میں لکڑی کی بنی ہوئی شکر نکال کر ہم کو چکھنے کے لئے دی بہت ممکن ہے کہ خود سائنسداں بھی لکڑی کا بنا ہوا ہو" جرمنی میں لکڑی سے ایسی ایسی چیزیں بنائی جا رہی ہیں کہ یہ بہت قیمتی ہوگئی ہے اور ہٹلر نے قانون نافذ کر دیا ہے کہ کوئی شخص لکڑی نہ جلائے جرمنی کے بڑے بڑے جنگل آج کل سونے کی کانیں بنے ہوئے ہیں اور لکڑی کا برادہ جرمنی کے لئے سفید سونے سے کم نہیں ہے لکڑی کے علاوہ دوسری چیزوں سے بھی کام لیا جا رہا ہے مصنوعی ربر کسی چیز میں اصلی ربر سے کم نہیں۔ کوئلے اور چاک سے فولادی کانچ بھی بنائی گئی ہے جو ہر قسم کے رنگ کو قبول کر لیتی ہے۔ شیشے میں لوچ پیدا کر کے اس کو نرم کر دیا گیا ہے یہ اس قدر مضبوط ہے کہ بندوق کی گولی بھی اس کو نہیں توڑ سکتی۔ کوئلے ہی سے پٹرول نکالا جاتا ہے پھٹے پرانے ردی کاغذ اور چندیوں سے بھی نئے لباس اور نئی اشیا ، تیار کی جا رہی ہیں۔ برلن میں ایک دوست نے تمسخر کے طور پر کہا "مجھے حیرت نہ ہوگی اگر کہا جائے کہ روٹی انڈے گوشت جو ہم استعمال کرتے ہیں پرانے پھٹے ہوئے جوتوں اور

پرانی ٹوپیوں سے بنتے ہیں" اس بیان سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ جرمن قوم مجبور ہو کر یہ چیزیں استعمال کر رہی ہو۔ نہیں۔ یہ مصنوعی اشیا کسی طرح قدرتی چیزوں سے کم نہیں بلکہ بعض حالات میں ان سے بہتر ہیں اس میں شک نہیں کہ صنعتی عمل کی وجہ سے بعض مصنوعی اشیار کی قیمت اس وقت قدرتی اشیار سے بڑھ کر ہے لیکن جب ان کی مانگ بڑھ جائے گی تو رفتہ رفتہ ان کی لاگت اور قیمت کم ہو جائے گی دیکھئے ایک جوان ہمت قوم کس طرح اپنی ضروریات پوری کرتی ہے اس نے دوسروں سے خام اشیار خریدنے کی بجائے خود اپنے لئے نئے وسائل پیدا کر لئے ان ایجادوں نے اس کی درآمد بہت کم کر دی ہے۔ ۱۹ اکتوبر ۳۶ء کے ہین چیسٹر گارجین میں ایک شخص لکھتا ہے " چار سال ہوئے اسٹریلیا کے اون کی سب سے زیادہ درآمد جرمنی میں ہوئی تھی وہ سالانہ ۱۰ کروڑ پونڈ خریدتا تھا اب اس کی درآمد صرف تین کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ ہے یہ معجزہ مصنوعی اون کا ہے" میں نے جو کچھ لکھا ہے یہ جرمنی کی صنعتوں کے متعلق ایک اشارہ ہے۔ ہٹلر کا چو سالہ پروگرام صنعتی اور اقتصادی حیثیت سے بہت وسیع ہے اور اس نے جرمنی پر فارغ البالی کے بیشمار دروازے کھول دیئے ہیں ....

آپ نے دیکھا ہو گا کہ میں نے اب تک اس مضمون میں نازی سیاست سے بحث نہیں کی ہے تین ہفتے کے سرسری قیام سے جو ایک تفریحی سفر تھا میں نازی حکومت کے متعلق کوئی سیر حاصل بحث نہیں کر سکتا اس کے لئے کافی وقت مطالعہ اور سیاسی معلومات کی ضرورت ہے۔ البتہ ایک بات تو سرسری مشاہدہ سے بھی نظر آتی ہے وہ یہ کہ جرمنی میں ہر طرف سیاسی فضا میں جبری

خاموشی نظر آتی ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگلستان کی آزاد
فضا میں رہنے کے بعد جو سلطنت برطانیہ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جرمنی
میں دم گھٹتا ہے جرمنی نے چار سال کے قلیل عرصہ میں اپنی مالیات کو بہت
بہتر بنا لیا ہے مگر قوم نے اس کی بہت گراں قیمت ادا کی ہے اس نے اپنی
انفرادی آزادی۔ رائے اور سیاسی حقوق کو تج دیا ہے حکومت کے خلاف اگر
کوئی کچھ کہے تو ایسے کیمپ میں نظر بند ہونا پڑتا ہے جو قید خانے سے بدتر ہے
ایک معزز جرمن نے مجھ سے کہا کہ جرمن ریخ یا پارلیمنٹ کے انتخابات اور رائے
زنی ایک ڈھکوسلہ ہیں اگر کسی نے نازی حکومت کے خلاف رائے دی تو فوراً
جبر اور ظلم کا شکار ہوتا ہے جرمن قوم نہایت صبر اور ضبط سے ان چیزوں کو گوارا
کر رہی ہے۔ انگلینڈ۔ فرانس اور امریکہ جیسے جمہوری ممالک کے لوگوں کے لئے
یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جرمن شہریوں کی حقیقی رائے اس معاملہ میں کیا
ہے مجھے چند جرمنوں کی سرگوشیوں سے یہ پتہ تو ضرور چل گیا کہ وہ بھی ایک
آزاد اور جمہوری فضا کے تمنائی ہیں لیکن یہ آواز نازی حکومت کے ڈر کے علاوہ
اور دو چیزوں سے دب جاتی ہے نازی جماعت پروپیگنڈا کرنے میں استاد ہے
وہ برابر جرمنوں سے کہتی رہتی ہے کہ جنگ عظیم کے بعد وہ کس طرح مفلوج ہو گئے
کس طرح ان کا اقتدار برباد ہوا اور نازیوں نے کس طرح ان کو قعرِ مذلت سے
نکال کر بام عروج پر پہنچایا۔ دوسری چیز جس نے ان کو بے زبان بنا رکھا ہے۔
ہٹلر کی شخصیت اور اس کا کیرکٹر ہے۔ ہٹلر کے سخت سے سخت دشمن کو بھی یہ
ماننا پڑے گا کہ اس کا دل فلاح ملک اور قومی درد سے معمور ہے اس نے

ملک کی خدمت میں اپنے ذاتی ولولوں کو بھلا دیا ہے جرمنوں پر اس چیز کا بڑا اثر پڑا ہے کہ ہٹلر نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کبھی شادی نہ کرے گا کیونکہ یہ قومی خدمت کے منافی ہے اس جذبہ ایثار نے ساری قوم کو ایثار پر آمادہ کر دیا ہے جرمنی میں غذائیات کی کمی ہے معیار زندگی ہلکا ہوگیا ہے انفرادی آزادی مفقود ہے لیکن قائد کے ایثار قوم کی فرمانبرداری چار سال کی غیر معمولی کامیابی اور ایام افلاس کی یاد نے جرمنی کو اس بات پر تیار کر دیا ہے کہ وہ نازی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کرے جب تک یہ حالات قائم ہیں جرمنی میں خانہ جنگی اور پھوٹ کا امکان نہیں. نازی حکومت کا ایک نمایاں پہلو یہودیوں کی مخالفت ہے. جرمنی جانے سے پہلے یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ جرمن قوم یہودیوں سے کیوں اس قدر متنفر ہے جبکہ یہودیوں نے جرمنی کی علمی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے جرمنی جانے کے بعد بھی میں اس معمہ کے حل کرنے سے قاصر رہا ممکن ہے کہ دوسری قومیں جرمنوں کے نقطۂ نظر کو نہ سمجھ سکتی ہوں مجھے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ جرمنی میں یہ خیال عام ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم کے بانی یہودی سرمایہ دار تھے انھوں نے اپنے اغراض کے لئے دوسروں میں جنگی ذہنیت پیدا کی جنگ کے بعد بہت سے یہودی روس سے جرمنی آ گئے جب جرمن بھوکوں مر رہے تھے تو بھی یہودی چاندی رول رہے تھے اور مزے اُڑا رہے تھے وہ ملک کی تجارت پر حاوی تھے. جرمنی کسان ان کا غلام بنا ہوا تھا بہرحال وجوہات کچھ ہوں آج ہر جرمن یہودیوں سے سخت نفرت کرتا ہے نازی حکومت نے اس شعلہ کو اتنا بھڑکا دیا ہے کہ آج جرمنی میں

یہودیوں کی وہی حالت ہے جو جنوبی ہند میں ہری جنوں کی ہے بلیک فارسٹ جاتے ہوئے ہم ایک ہوٹل میں اترے جہاں بورڈ پر لکھا ہوا تھا "یہودیوں کو اندر آنے کی ممانعت ہے" یہودیوں کو ہر طرح ذلیل کیا گیا ہے وہ فوج، مدارس، یونیورسٹی کہیں داخل نہیں ہو سکتے آزادانہ طور پر تجارت نہیں کر سکتے شہروں میں ان کے محلے الگ کر دیئے گئے ہیں اگر وہ ملک کے باہر جائیں تو دس روپیہ سے زیادہ نہیں لے سکتے اگر کوئی ان سے ملے جلے تو اس پہ بھی شبہ کیا جاتا ہے ممکن ہے کہ نازیوں کی شکایات بجا ہوں لیکن نازیوں نے انتقام میں بڑی شدت برتی ہے اور ان کے اس طرز عمل نے یہودیوں سے زیادہ جرمنوں کو نقصان پہنچایا ہے برلن میں ایک ہندوستانی طالب علم نے مجھ سے بیان کیا کہ یہودیوں کے نکل جانے کی وجہ سے جرمنی کا علمی اور عقلی معیار بہت گھٹ گیا ہے کیونکہ نازی ظلم سے قبل جرمنی میں بڑے بڑے قابل وکیل سائنس داں اور پروفیسر یہودی تھے اس معاملہ میں یہودیوں کے مسئلہ کی ایک عام اور وسیع تحقیق سے پہلے کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے یہ واقعہ ہے کہ یہودی ہر جگہ الگ تھلگ رہتے ہیں وہ مرفع ہیں اور تجارتی دنیا میں ان کی خفیہ چالیں سب کو پریشان کرتی رہتی ہیں انگلستان میں بھی ان کے خلاف نفرت پھیل رہی ہے چند دن ہوئے ایک شخص ہائیڈ پارک میں یہودیوں کی حمایت میں تقریر کر رہا تھا کہ چند نوجوان انگریزوں نے اس کو دھکے دے کر ہٹا دیا اور یہ کہا "یہودی بھیڑ کے لباس میں ایک خونخوار بھیڑیا ہے"

ممکن ہے کہ بعض لوگ نازی حکومت کی اکثر چیزوں کو ناپسند کریں لیکن ان کے جذبہ ایثار، صنعتی ترقی، قومی اتحاد، اور شریفانہ اخلاق سے ہر شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قند پارسی

از

جنابِ مفتی نواب ضیاء یار جنگ بہادر ضیاؔ

ہر نیک و بد ز خارقِ عادت عیاں شود ناممکن است خوۓ نہفتن نہاں شود
در زیرِ خاک حسرتِ دنیا و دیں برند داند خدائے حشرِ لئیماں چساں شود
خوئے کرم نہفتہ نماند در احتیاج چوں بوئے عنبرست گزاش عیاں شود
سرسبزئی نہالِ تمنا نصیبِ کیست خوں می دہند نخل اگر ناتواں شود
خواہم کہ تا خبر نشود شب کسے زمن گر آہ میکنم سرِ کوئش فغاں شود
پرسد کسے ز نرگسِ شہلا چہ دیدہ در گلشنے کہ جنگِ بہار و خزاں شود
دامانِ عشق گیر کہ از دستِ قدرتش یوسف رسد بہ تخت و زلیخا جواں شود
خوباں چرا ز ما سخنے آرزو کنند گر ذکرِ دشمناں گلۂ دوستاں شود
شکّر فشاں شوند ہمہ طوطیانِ ہند جائیکہ ذکرِ صائبِ شیریں بیاں شود
چیزے نماند در کفِ دل از برائے غم
مہماں ضیاؔ بہ خاطرِ مفلس گراں شود

سیّد وارث شاہ صاحب مرحوم و مغفور

مصنّف قصّہ ہیر و رانجھا

از

جناب مولوی فیض عالم صاحب مددگار طبقہ وسطانیہ

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قصّہ ہیر و رانجھا ایک فرضی داستان ہے لیکن پنجاب کی قدیم روایات سے ان مشاہیر کے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ ہیر و رانجھا کا مزار ضلع جھنگ میں ہے اور ان کا سالانہ عرس بہت دھوم سے ہوتا ہے۔ ان کے عقائد اور مذہب کے متعلق بھی عجیب عجیب باتیں بیان کی جاتی ہیں بعض ان کو ہندو سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں مسلمان تھے۔ مگر جیسا کہ واقعہ ہے عاشقوں کا مذہب نرالا ہوتا ہے۔ لوگوں کو ان کے ناموں سے بھی دھوکا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دیہات پنجاب میں اولاد کا نام دیسی زبان میں رکھا جاتا ہے۔ عربی اور فارسی کے ادق نام ان کی سمجھ میں نہیں آتے اور نہ وہ ان کا صحیح تلفظ کرسکتے ہیں۔ رانجھے کا اصلی نام دھیدو تھا رانجھا اس کی ذات تھی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کا نام ہی رانجھا مشہور ہوگیا۔

وجہ تصنیف ہیر و رانجھا کے واقعات کو گزرے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ لوگ ان کی عاشقانہ رنگ رلیوں کو بھولتے جارہے تھے کہ اسی اثنا میں چند احباب نے وارث شاہ صاحب سے فرمائش کی کہ شاہ صاحب یہ قصّہ مٹتا جارہا ہے

آپ اس کو پنجابی زبان میں نظم کرڈالئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا یہ کام مشکل ہو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ لیکن تقدیر اپنا کھیل کھیل رہی تھی۔ خود شاہ صاحب کے دل کو ایک دوشیزہ کے عشق نے گھایل کر دیا۔ اور ان پر وہی واردا تیں گزرنے لگیں جو عاشقوں پر عموماً گزرتی ہیں۔ یہ خود رانجھا کی جون میں آ گئے۔ اور گفتہ آید در حدیث دیگراں کے مصداق شاہ صاحب نے ہیر ورانجھا کے قصے کے پیرائے میں اپنی حسرتوں کا نقشہ کھینچا اور اپنے عشق کی تمام حقیقتیں اس قصہ میں بیان کر دیں۔ اور ایسی بیان کیں کہ رہتی دنیا تک لوگ اس قصہ کو سنتے رہیں گے۔ دوستوں کی فرمائش کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

یاراں اساں نوں آن سوال کیتا قصہ ہیر داانواں بنا دیئے جی
ایس پریم دی جھوک دا سب قصہ ڈھب سوہنے نال سنا دیئے جی

ترجمہ | دوستوں نے آکر مجھ سے فرمائش کی کہ ہیر ورانجھے کا قصہ لکھ ڈالو۔ یہ پریم کا ایک گیت ہے اس کو اچھے طریقے سے بیان کیجئے۔ ہیر ورانجھے کے عشق کو سوئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے اس کو دوبارہ زندہ کر دیجئے تاکہ عاشق لوگ اس کو پڑھیں اور پڑھ کر مزہ لیں۔

شاہ صاحب دوستوں کی فرمائش پوری کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

حکم من کے پیاریاں سجناں دا قصہ عجب بہار دا جوڑیا اے
فقرہ جوڑ کے خوب درست کیتا نواں پھل گلاب دا توڑیا اے
بہت جیو دے وچ تدبیر کر کے فرہاد پہاڑ نوں پھوڑیا اے
وارث شاہ فرمایا پیاریاں دا اساں منیاں تے نہیں موڑیا اے

ترجمہ | میں نے دوستوں کا حکم مان لیا اور عجیب و غریب بہار کا قصہ لکھا ہے فقروں کو جوڑ کے خوب درست کیا جیسے کہ تازہ گلاب کا پھول توڑا گیا ہو۔ کام مشکل تھا میں نے اپنے دل میں پکا ارادہ کرلیا اور کر ڈالا جیسے فرہاد نے پہاڑ کو پھوڑا تھا۔ وارث شاہ میں نے دوستوں کی فرمائش کو پورا کر دیا۔ رد نہیں کیا۔

اوپر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ شاہ صاحب نے دوستوں کی فرمائش پر لکھا تھا چنانچہ خاتمہ کتاب پر جو چند اشعار شاہ صاحب نے لکھے ہیں ان سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دوستوں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی وہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ختم رب دے کرم نال ہوئی فرمایش پیاروے یار دی سی
گل سوہنی عاشقاں سچیاں دی خوشبو گلاب گلزار دی سی
طول کھول کے ذکر بیاں کیتا رنگا رنگ دی خوب بہار دی سی
تمثیل دے نال بیان کیتا جیہی زینت لعل دے ہار دی سی
جو کوئی پڑھے سو بہت خورسند ہووے واہ واہ سب خلق پکاردی سی
وارث شاہ نوں سِک دیدار دی سی جیہی ہیر نوں بھڑکنا یار دی سی

ترجمہ | خداوند تعالےٰ کی مہربانی سے پیارے دوستوں کی فرمائش پوری ہوئی سچے عاشقوں کا قصہ تھا جیسے کہ گلاب کی خوشبو ہو۔ میں نے قصہ کو خوب کھول کر بیان کیا ہے اور اس میں خوب رنگ آمیزی کی ہے تمثیل کے ساتھ بیان کرکے ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

جیسے کہ لعل کا ہار ہو جو کوئی پڑھتا ہے بہت خوش ہوتا ہے سب لوگ تعریف کرتے ہیں۔ وارث شاہ کو بھی ہیر کے دیدار کی خواہش تھی جیسی ہیر کو رانجھے کی تھی اب ہم اس شاعر کے مختصر حالات زندگی بیان کرتے ہیں۔

پیدائش سید وارث شاہ صاحب کی پیدائش ۱۱۰۵ ہجری میں ہوئی۔ آپ ذات کے سید تھے۔ والد کا نام سید قطب شاہ صاحب تھا۔ سید قطب شاہ صاحب چونکہ گاؤں کے امام مسجد تھے اس واسطے گاؤں والے آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ نیز گاؤں والوں نے آپ کو ضروریات زندگی سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔

وطن سید وارث شاہ صاحب موضع جنڈیالہ شیر خاں ضلع شیخوپورہ پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ گاؤں بہت مختصر سا چند زمینداروں کے گھروں پر مشتمل تھا۔ گاؤں اب بھی ہے اور پہلے سے زیادہ آباد ہے۔

تعلیم شاہ صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کی مسجد میں ہی پائی۔ یہ تعلیم آپ کے لئے بالکل ناکافی تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ قصور تشریف لے گئے۔ یہ شہر ان دنوں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور اسے پنجاب بھر میں شہرت تھی۔ دور دور سے لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ قصور میں ان دنوں حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مخدوم کی درسگاہ بہت عروج پر تھی۔ شاہ صاحب اسی درسگاہ میں شریک ہو گئے۔ قصور آج کل بھی ویسا ہی با رونق شہر ہے لیکن ویسی تعلیم نہیں جیسی شاہ صاحب کے زمانہ میں تھی۔ شاہ صاحب جس زمانہ میں قصور میں تعلیم پا رہے تھے اس وقت وہاں کا

بافتہ بہت مشہور تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں۔

۱؎ کوئی اساں جیہا ولی سدھ ناہیں نظر آوندا جگ ظہور جیہا
دستار بجواڑیوں خوب آوے آتے بافتہ نہیں قصور جیہا
ہور لکھ پہاڑ نے زمین اُتے رتبہ کسیدا نہیں کوہ طور جیہا
دان دیونے جیڈ نہ عمل کوئی ذکر رب دے جیڈ نہ نور جیہا
کشمیر جیہا سرد ملک ناہیں نہیں چانا چن دے نور جیہا
اگے نظر دے مزا معشوق والے اتے ڈھول سہاوندا دور جیہا

۱؎ رانجھا جوگی بن کر ہیر کے سسرال میں جاتا ہے تاکہ ہیر کا دیدار کرے۔ ہیر کی نند سہتی اس سے پوچھتی ہے کہ تو کون ہے رانجھا اس کو جواب میں یہ شعر کہتا ہے جو اوپر لکھے گئے ہیں۔ اس جواب میں رانجھے کو صرف یہ کہنا ہے کہ میں بہت پہنچا ہوا جوگی ہوں لیکن اتنی سی بات کے لئے دنیا بھر کی چیزیں گنا دی ہیں جو اپنا مقابل نہیں رکھتیں۔ یہی خوبی وارث شاہ کی تمام کتاب میں نظر آئے گی۔

حاجتمند نہ آدمی جیڈ کوئی بے پرواہ نہ رب غفور جیہا
وارث شاہ جیہا گنہگار ناہیں بخشنہار نہ رب غفور جیہا

ترجمہ | میرے جیسا کامل ولی دنیا میں نہیں ہے جس طرح کہ بجواڑے کی دستار سب سے اچھی ہوتی ہے اور قصور جیسا بافتہ کہیں نہیں ہوتا۔

دنیا میں لاکھوں پہاڑ ہیں لیکن جو رتبہ کوہ طور کا ہے وہ رتبہ کسی پہاڑ کا نہیں دان دینے سے بہتر عمل کوئی نہیں ہے اور خدا کا ذکر کرنا سب عبادتوں سے

بڑھ کر عبادت ہے سب ملکوں سے بڑھ کر کشمیر سرد ملک ہے اور چاند کا نور سب سے اچھی اور ٹھنڈی روشنی ہے۔ سب سے بہتر مزا یہ ہے کہ آنکھ کے سامنے معشوق ہو۔ اور ڈھول کی آواز دور ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے آدمی سے بڑھ کر دنیا میں حاجتمند نہیں ہے اور خداوند کریم سے بڑھ کر بے نیاز کوئی نہیں ہے، وارث شاہ سے بڑھ کر کوئی گنہگار نہیں ہے۔ اور خدا سے بڑھ کر کوئی بخشنے والا نہیں ہے۔ (جس طرح یہ سب چیزیں دنیا میں اپنا مقابل نہیں رکھتیں اسی طرح میں بھی اس پایہ کا کامل جوگی ہوں کہ میرے جیسا جوگی دنیا میں کوئی نہیں ہے)

آج کل قصور کی میتھی بہت مشہور ہے۔ یہ میتھی خوشبودار ہوتی ہے۔ اور سالن میں بطور خوشبو کے ڈالتے ہیں۔ قصور میں زمین کا ایک خاص ٹکڑا ہے بس اسی جگہ پیدا ہوتی ہے اگر کسی دوسری جگہ وہ میتھی بوئی جائے تو اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ اس زمین میں ہی کچھ خاصیت ہے۔ جیسے کہ کشمیر میں زعفران کے لئے ایک خاص جگہ مخصوص ہے۔

حافظ غلام مرتضےٰ صاحب مخدوم

حافظ صاحب شاہ صاحب کے استاد تھے اور انھیں کے سامنے شاہ صاحب نے زانوئے ادب تہہ کیا حافظ صاحب کی توجہ زیادہ تر شاہ صاحب کی طرف ہوتی تھی۔ کیونکہ حافظ صاحب نے بھانپ لیا تھا کہ میرا یہ شاگرد ایک دن ضرور پنجاب میں چاند بن کر چمکے گا اس لئے حافظ صاحب نے سید وارث شاہ صاحب کی تعلیم پر خاص توجہ کی۔ شاہ صاحب کا حافظہ بہت اچھا تھا چنانچہ بہت کم مدت میں تمام علوم حاصل کر لئے مثلاً تفسیر، فقہ، حدیث وغیرہ۔ حافظ صاحب نے

شاگرد کو بلا کر فرمایا اب تم نے علوم ظاہری تو حاصل کر لئے علوم باطنی کی بھی تکمیل ہونی چاہئے۔ تمہیں اختیار ہے جہاں چاہو جا کر بیعت کر لو۔ یہ کہہ کر حافظ صاحب نے رخصت کر دیا۔ شاہ صاحب جب روانہ ہونے لگے تو رو دئے لیکن حافظ صاحب نے سر پر ہاتھ پھیر بہت ہمت دلائی اور دعائیں دیں۔ شاہ صاحب کو بھی اپنے استاد سے غائت محبت تھی۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

وارث شاہ وسنیک جنڈیالڑیدا شاگرد مخدوم قصور والے

ترجمہ وارث شاہ جنڈیالہ کا رہنے والا ہے۔ اور مخدوم قصوری کا شاگرد ہے۔

شاہ صاحب فخر یہ کہا کرتے تھے کہ میں مخدوم قصوری کا شاگرد ہوں۔ پرانے زمانہ میں لوگ اپنے نام کے ساتھ استاد کا نام شریک کرنا فخر سمجھتے تھے لیکن آج کل نام کے ساتھ درسگاہ کا نام ہوتا ہے۔

شیخ فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت

قصور سے رخصت ہو کر شاہ صاحب سیدھے پاک پٹن تشریف لے گئے۔ اور وہاں جا کر شیخ فریدالدین صاحب کے خاندان چشتیہ سے اظہار عقیدت کیا۔ شاہ صاحب ایک مدت تک وہیں رہے اور ریاضت کرتے رہے۔ جب شاہ صاحب روحانی فیوض سے بھی فیض حاصل کر چکے تو پھر اپنے وطن کی طرف مراجعت فرمائی۔

وطن کی طرف مراجعت

جب وطن کی طرف واپس آرہے تھے تو آپ کا گذر ایک گاؤں "جاہد کے ٹھٹے"

سے ہوا۔ یہ گاؤں پاک پٹن سے چند میل کے فاصلہ پر ہے چونکہ شام ہوگئی تھی اس لئے شاہ صاحب نے رات اسی گاؤں میں بسر کی۔ صبح کے وقت جب شاہ صاحب روانہ ہونے لگے تو اتفاقاً گاؤں کی ایک نوجوان دوشیزہ سے نگاہ لڑگئی۔ شاہ صاحب دل وجان سے فریفتہ ہوگئے۔ گاؤں والوں کو اس بات کی خبر ہوگئی انھوں نے شاہ صاحب کو گاؤں سے نکال دیا۔ لیکن شاہ صاحب اپنا دل اس دوشیزہ کو دے چکے تھے اس لئے وطن واپس ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ گاؤں کے باہر ایک مسجد تھی اسی میں قیام فرمالیا۔ گاؤں کے چند آدمی آپ کی قابلیت اور میٹھی میٹھی باتوں پر مرتے تھے لہذا وہ آپ کے موافق ہوگئے۔ ایک جولاہے نے آپ کے کھانے اور دیگر ضروریات کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ رہتے رہتے بھاگ بھری (یہ اس دوشیزہ کا نام ہے) کو بھی آپ سے اُلفت ہوگئی۔ اب وہاں شاہ صاحب نے عشق ومحبت کے عجیب وغریب نظارے دیکھے۔ شاہ صاحب اس وقت بالکل نوجوان اور شکل وصورت کے بھی اچھے تھے۔ بھاگ بھری سے نہ رہا گیا اس کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔ اب عشق حقیقی نے عشق مجازی کی شکل اختیار کر لی۔ اسی عشق نے شاہ صاحب کو قصہ ہیر ورانجھا لکھنے پر مجبور کیا عشق کی تمام کیفیتیں اور دلربائیاں جو شاہ صاحب نے بھگتی تھیں انھیں اس قصہ میں لکھا۔ اس قصہ کی تمام باتیں شاہ صاحب کے دل سے نکلی ہیں۔ اسی لئے ان کا اثر انسان کے دل پر ہوتا ہے۔ جو ایک دفعہ اس قصہ کو پڑھتا ہے وہ عمر بھر پڑھتا ہی رہتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ قصہ ہیر ورانجھا نہیں بلکہ وارث شاہ اور بھاگ بھری کا ہے

توبے جانہ ہوگا۔ اسی مسجد میں یہ قصہ ۱۱۸۰ھ میں تیار ہوا۔

سن یاراں سو اٹھیاں نبی ہجرت لے دیس وچ تیار ہوئی
اٹھاراں سے تے بیسیا سمتاں ندا راجے بکرماجیت دے سار ہوئی

شاہ صاحب کے عشق کا کیا انجام ہوا یہ معلوم نہیں لیکن جب قصہ تیار ہوگیا تو اپنے وطن کی طرف روانہ ہوئے۔ گاؤں والے شاہ صاحب سے ملکر بہت خوش ہوئے کیونکہ ایک عرصہ کے بچھڑے ہوئے تھے۔ اس قصہ کی نقل سب سے پہلے آپ کے شاگرد میاں الٰہی بخش درزی نے کی۔ چونکہ یہ قصہ بہت پُر تاثیر تھا چند ہی دنوں میں تمام پنجاب میں مشہور ہوگیا۔ لوگوں نے زبانی یاد کرنا شروع کردیا۔ شعروں میں اس قدر روانی ہے اور رمزیں بھری ہوئی ہیں کہ ایک دفعہ سننے ہی تمام اشعار زبانی یاد ہو جاتے ہیں۔ آئندہ کسی وقت ہم منتخب اشعار پیش کریں گے۔

جب اس قصہ کی خبر حافظ غلام مرتضےٰ صاحب کو پہنچی تو انھوں نے اسی وقت قصور آنے کے لئے کہا۔ شاہ صاحب استاد کی خدمت میں قصور حاضر ہوئے۔ حافظ صاحب شاہ صاحب کو دیکھ کر فرمانے لگے "افسوس عمر بھر میں مجھے دو ہی شاگرد ملے جن کی تعلیم پر میں نے خاص توجہ کی ان میں سے ایک تو فقیر ہوگیا (صوفی بلھے شاہ صاحب) اور دوسرے نے ہیر ورانجھے کا قصہ لکھا" حافظ صاحب بہت افسردہ خاطر ہوئے آخر تھوڑی دیر کے بعد فرمانے لگے "اس قصہ کا کچھ حصہ مجھے بھی سناؤ۔ چنانچہ شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھ کر سنائے۔ (ہیر کے ماں باپ ہیر کی زبردستی شادی کرکے ڈولی میں

اس کو روانہ کر دیتے ہیں۔ ڈولی میں بیٹھتے وقت ہیر اپنے یار رانجھا کو اس طرح یاد کر کے روتی ہے۔

ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں پیاں سخت رنجھیٹیا بھایاں وے
آویکھ رنجھیٹیا حال میرا جیکھ گذریا میں نال سایاں وے
میرے جوبن بہار جوانڑی تے آج خوب اداسیاں چھایاں وے
آج ویکھیا نہ تتی مکھ تیرا اکھیں ریجھ دے نال سن لایاں وے
دن چار نہ رج آرام پایا دکھ درد مصیبتاں سہ چلے وے
سانوں بولیا چالیا معاف کرنا پنج روز تیرے گھر رہ چلے وے
لے وے رانجھیا رب نوں سونپیو توں اسیں ظالماں دے وس پے چلے وے
جیہڑے نال خیال اسار دی ساں خانے سب امیدڈے ڈھے چلے وے
اساں وت نہ آنکے کھیڈناں نی بازی عشق والی کر کے طے چلے وے
سیدے کھیڑے وی آج مکان ہوئی رووں پٹن کردے ہے ہے چلے وے
میریاں چارے کنیاں ویکھ خالی اسیں نال ناہیں کجھ لے چلے وے
کوڑی دنیا تے شان گمان کوڑا وارث شاہ ہوری سچ کہہ چلے وے

ترجمہ: جب ہیر ڈولی چڑھنے لگی تو چیخیں مار کر اپنے یار رانجھے کو یاد کر کے رونے لگی۔
رانجھے میرے مالک! آ دیکھ میرا کیا حال ہے اور میرے ساتھ کیا گذر رہی ہے۔
آج کے دن میرے جوبن پر اداسیاں چھائی ہوئی ہیں۔
آپ کے ساتھ میں نے محبت کا رشتہ جوڑا تھا لیکن آج آپ کا مکھ بھی نہ دیکھ سکی۔
چار دن بھی اچھی طرح آرام نہ کرنے پائے تھے کہ دکھ درد اور مصیبتیں سہہ کر جا رہے ہیں

ہمیں معاف کر دینا اگر کوئی ناگوار بات بول دی ہو۔
میرے پیارے رانجھے آپ کو خدا کی حفاظت میں دیتی ہوں ور میں تو ظالموں کے پنجوں میں جا رہی ہوں۔
ہائے! میں اپنے دل میں کیا کیا سوچتی تھی۔ اب میری سب امیدیں برباد ہوتی جا رہی ہیں
اب میں دوبارہ تمھارے ساتھ آ کر نہ کھیل سکوں گی میں عشق کی بازی طے کر کے جا رہی ہوں۔
آج سیدا کھیڑا (ہیر کا شوہر) مر گیا ہے روتی ہوئی اس کی موت میں جا رہی ہوں۔
میری چادر کے چاروں کونے خالی ہیں میں کچھ باندھ کر نہیں لے جا رہی۔
(اور یہ بھی صحیح کیونکہ) وارث شاہ سچ کہتا ہے کہ یہ دنیا جھوٹی ہے اور اس کی
سب شان بھی جھوٹی ہے یہاں سے کوئی کیا لے کر جائے گا۔
جب حافظ صاحب نے اس قسم کے اشعار سنے تو ان کی حالت غیر ہونے لگی۔
ایک وجدانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ سن کر رو دیئے اور فرمانے لگے" وارث
شاہ! تو نے مونجھ[1] کی رسی میں لعل پرو دئیے ہیں"۔ پھر دعا دے کر رخصت کر دیا۔
وہاں سے سیدھے اپنے وطن جنڈیالہ شیر خاں میں تشریف لے آئے۔ بقیہ عمر
وہیں گذاری۔

وفات شاہ صاحب کی وفات اپنے گاؤں جنڈیالہ شیر خاں میں ہوئی۔
آپ نے ۔۔ کے روز اس دنیا سے کوچ کیا۔ مزار اب بھی ہے۔
ہر سال عرس ہوتا ہے۔

اولاد شاہ صاحب کی اولاد نرینہ نہ تھی صرف ایک لڑکی تھی۔

---

[1] ایک جنگلی گھاس ہوتی ہے پنجاب میں اس کی رسی بناتے ہیں اور موٹے موٹے کاموں
میں استعمال کرتے ہیں۔

حلیہ آپ کا چہرہ خوبصورت اور بارعب تھا۔ پنجابی کرتہ اور شلوار پہنتے تھے سر کے بال لمبے اور ڈاڑھی بھری ہوئی تھی۔ سر پر سفید ململ کی پگڑی باندھتے تھے۔

پنجابی زبان اور وارث شاہ صاحب

پنجابی زبان پر وارث شاہ صاحب نے قصہ ہیر رانجھا لکھ کر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس سے پہلے پنجابی زبان میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس کو اتنی شہرت ملی ہو۔ اور نہ ہی کسی اور نے آج تک ایسی کتاب لکھی ہے۔ زمانہ حال کے شاعروں میں سید فضل شاہ صاحب مرحوم کا نام بہت مشہور ہے ان کا یہ شعر سب کی زبانوں پر ہے۔

سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماپے حسن جوانی سدا نہ صحبت یاراں

لیکن ان کی شاعری میں عربی اور فارسی کے سینکڑوں الفاظ آگئے ہیں جس کی وجہ سے گاؤں کے رہنے والے اس کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ وارث شاہ صاحب باوجود عربی اور فارسی کے عالم ہونے کے انھوں نے اس قصہ میں قریب قریب خالص پنجابی زبان استعمال کی ہے۔ اسی لئے اس کو ہر پنجابی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ شاہ صاحب کے کلام میں سب سے زیادہ خوبی یہ ہے کہ وہ دل پر اثر کرتا ہے اسی لئے زیادہ مقبول ہے۔ یہ کتاب پنجاب میں اس قدر بکتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی اور کتاب نہ بکتی ہوگی۔ تقریباً ۵۰ فی صدی گھروں میں یہ کتاب ہے۔ گاؤں کے رہنے والوں کے لئے یہ ایک

نعمت ہے۔ ہر طبقے کے لوگ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ اس کتاب کی عزت کرتے ہیں۔ گاؤں کا مسلمان تو اس کو مذہبی اور الہامی کتاب مانتا ہے اسے چوم کر کھولتا ہے اور پڑھتا ہے کیونکہ اس میں بہت سی قرآن شریف کی آیتوں اور حدیثوں کی تفسیر ہے۔ ایک ہندو شاعر لالہ منی لال صاحب آتش فرماتے ہیں۔

وارث تاج پنجاب دے شاعراں دا جویں چند دی ہستی ستاریاں وچ
نقطے نقطے وچوں بوئے توحید آوے رمزاں گجھیاں اہدے اشاریاں وچ
لڑی سیداں وچوں نایاب موتی ایہہ خوبیاں بنی دے پیاریاں وچ
ہیر ترجمہ انہاں دا جاپدا ئے آیتاں پاک جو ہیں سپاریاں وچ
ہر ایک مذہب نوں پیاری کتاب لگے صفتاں نہیں ایہ شاعراں ساریاں وچ
آتش سدا زندہ جدہا نام زندہ خوبی نہیں کوئی اساں نکاریاں وچ

ترجمہ: وارث شاہ پنجاب کے شاعروں کا سرتاج ہے جس طرح چاند کی ہستی ستاروں میں ہے۔ اس کے ہر ہر نقطے میں سے توحید کی بو آتی ہے اور اس کے اشاروں میں گہری رمزیں ہیں سیدوں میں وارث شاہ ایک نایاب موتی ہے اور یہ خوبی ان میں ہوتی ہے جو نبی کے خاص پیارے ہوتے ہیں۔

ہیر کا قصہ قرآن شریف کی آیتوں کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔
یہ کتاب ہر مذہب والے کو پیاری ہے سب شاعروں میں یہ بات نہیں ہے کہ ایسی کتاب لکھے۔
آتش جس کا نام زندہ ہے وہ ہمیشہ زندہ ہی رہتا ہے ہمارے جیسے نکموں میں کوئی خوبی نہیں ہے۔

ہیر ورانجھے کے واقعہ کو گذرے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا تھا۔ لوگ اس

قصہ کو بھولتے جا رہے تھے۔ شاہ صاحب نے اس قصہ کو دوبارہ زندہ کیا ہی۔
چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

رانجھے ہیر دے عشق دی گل ستی نویں سرے توں پھیر جگا ویئے جی
وارث شاہ پیاریاں نال رل کے ہن عشق دی بات ہلا ویئے جی

شاہ صاحب نے اس کو اپنی کتاب کے ذریعہ ایسا زندہ کیا ہے کہ یہ قصہ تمام دنیا میں مشہور ہو گیا ہے۔ دنیا اس سے بہتر حسن و عشق کا قصہ پیش نہیں کر سکتی۔ پنجاب کے دوسرے قصے مثلاً سسی پنوں، سوہنی مہینوال وغیرہ کو اتنی شہرت نصیب نہیں ہوئی جتنی قصہ ہیر و رانجھا کو اور یہ سب شاہ صاحب کی طفیل ہے۔

میں نے اس مضمون میں پنجابی زبان کے اشعار کثرت سے درج کئے ہیں حالانکہ مجھے نقل نہ کرنے چاہیئے تھے۔ لیکن اس سے میرا ایک خاص مطلب ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو بتاؤں کہ پنجابی اور اردو زبان میں کہاں تک فرق ہے۔ چنانچہ ان اشعار سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج سے تین سو سال پہلے کی پنجابی زبان کیسی تھی۔ تقریباً اردو سے ملتی جلتی۔ عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے نہیں۔ یہ زبان مرہٹی اور گجراتی کی طرح سنسکرت سے ہی نکلی ہی موجودہ زمانہ کی پنجابی زبان پنجابی نہیں رہی۔ بلکہ اردو زبان اس قدر چھا گئی ہی کہ اردو ہی ہوتی جا رہی ہی پنجاب کے شہروں میں تو بے تکلف اردو بولی جاتی ہی آہستہ آہستہ پنجابی زبان غائب ہوتی نظر آ رہی ہی کیونکہ مدرسوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہی ہی۔

کسی آیندہ قسط میں ہم ہیر و رانجھا کا اصلی قصہ جو سید وارث شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے پیش کرینگے۔ قصہ تو آپ نے سینما میں دیکھا ہو گا لیکن اس میں بہت کچھ ترمیم کی گئی ہے +

غزل

ازجناب مولوی سید صادق صاحب سروش مددگار کلیلہ ورنگ آباد

مقتل میں کیا ادا ہے تری کس بلا کے ہاتھ
ہر وار پر دُعا کو اُٹھے ہیں قضا کے ہاتھ

انگڑائی لی تو کُھل گئے ناز و ادا کے ہاتھ
لاکھوں کئے شہید ہوا ہیں گُھما کے ہاتھ

کہنے کو تھا میں کچھ سرِ محفل رقیب کو
خاموش کر دیا مجھے اُس نے دبا کے ہاتھ

وہ دن گئے کہ پھرتے تھے دشمن گلی گلی
آتی ہے اب تو موت کسی آشنا کے ہاتھ

قدرِ شباب کوئی زلیخا سے پوچھتا
ہوتی ہے قدر اُس کی جو آجائے جا کے ہاتھ

مجھ کو حسد نہیں غمِ فرہاد و قیس پر
ہے وہ مرا جو دیدیا اُس نے اٹھا کے ہاتھ

جو پاس ہیں وہ پی چکے ساغر کئی کئی
ساقی میں دور ہوں مجھے دینا بڑھا کے ہاتھ

بے مانگے دے رہا ہے وہ اندازہ سے سوا
رحمت سے اُس کی کھیل رہے ہیں دُعا کے ہاتھ

بد قسمتی سے بے اثری کا شکار ہوں
ملتے ہیں اُس کی تیغ سے میری دُعا کے ہاتھ

اللہ جانتا ہے کہ قاتل کو کیا ہوا
آنسو بہا دیا ہے جو مجھ پر لگا کے ہاتھ

جوشِ جنوں میں چھیڑ کے ناخن سے زخمِ دل
دُھوتا ہوں دونوں آنکھوں سے آنسو بہا کے ہاتھ

کیں اک نگاہِ ناز پہ سب شوخیں نثار
بیٹھا ہوں بُت بنا ہوا اپنے کٹا کے ہاتھ

سینہ میں دل سنبھالکے رکھے رہو سروش
پڑ جائے گا وگرنہ کسی بیوفا کے ہاتھ

یورپ پر آمریت کا اثر

از

محمد مجیب اللہ صاحب صدیقی متعلم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

جنگ عظیم سے پہلے یورپ کے اکثر ممالک میں صرف پارلیمنٹری اور کانگریسی طرز حکومت تھا۔ جرمنی میں دستوری حکومت قائم تھی اور وہاں کا قیصر دستوری حکمران تھا۔ اٹلی میں بھی پارلیمنٹ تھی اور وہاں کے بادشاہ وکٹر ایمینویل کی حالت بھی قیصر کی طرح تھی۔ روس میں خاندان رومانوف حکمراں تھا۔ ترکی میں ۱۹۰۸ء تک سلطان عبدالحمید کی بادشاہت تھی۔ لیکن بعد میں اس کی بدعنوانیوں سے تنگ آکر اسے معزول کردیا گیا اور اس کے بعد انجمن اتحاد و ترقی برسر اقتدار آئی جس نے اخوت، حریت اور مساوات کی بنیادوں پر سلطنت عثمانی کو ہموار کرنا چاہا لیکن تدبر نہ ہونے کی وجہ سے یہ کامیاب نہ ہوسکی۔ اکثر ممالک نے اس بے چینی سے فائدہ اٹھایا اور چند علاقہ جات ہڑپ کرلئے۔ اس کے چند دنوں بعد ہی جنگ عمومی شروع ہوگئی۔

بعض اندرونی وجوہات کی بنا پر جو وسطی یورپ سے شروع ہوئیں ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوگئی اور مسلسل ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اس میں بہت سی حکومتیں تباہ ہوئیں سلطنتوں کا شیرازہ بکھرا اور بہتوں کی قسمت سنور گئی۔ روس میں زار کی حکومت تھی۔ جو اپنی ملکہ زارینہ کے ساتھ ایک راہب راس پوٹین نامی کا اس قدر گرویدہ تھا کہ اس کا سلطنت کے معاملات میں کافی دخل ہوگیا۔ اس

توہم پرستی سے زار کو وہ نقصان اٹھانا پڑا جس کی مثال شاید ہی روس کی تاریخ میں مل سکے۔ زار کو راہب نے حد سے زیادہ دھوکہ دیا۔ جرمنی سے ساز باز کر کے یہاں کے حالات سے اسے برابر مطلع کرتا رہتا تھا۔ اس نے زار کو جرمنی کی بتائی ہوئی چالوں پر چلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدہر روسی فوجیں بڑہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دی گئیں۔ اور بعد میں چل کر اس کا نتیجہ شکست کی شکل میں برآمد ہوا۔ اس تباہی وبربادی کی وجہ سے ملک میں زار کے خلاف ایک ہیجان پیدا ہوا اور ۱۹۱۷ء میں زبردست انقلاب ہوا۔ زار اور زارینہ تہ تیغ ہوئے۔ کمیونزم[1] کامیاب ہوئی۔ سرمایہ داری کا بالکل خاتمہ کر دیا گیا۔ اور حکومت کی رہنمائی لینن نے کی جو آگے چل کر آمر بن بیٹھا اور بالشویک حکومت کی بنیاد ڈالی فرق صرف اس قدر رہا کہ زار کی حکومت سے نقصان ہوا تھا لیکن لینن نے باوجود مطلق العنانی کے جو اس نے انقلاب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حاصل کی تھی، ملک کو زندہ اور خوش حال کیا۔ اور اپنے غیر متناہی اختیارات عوام کی بھلائی میں صرف کئے۔

ترکی میں جس وقت سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا اور محمد رشاد خاں کو خلیفہ بنا کر بالکل دستوری حیثیت دے دی گئی اس وقت وہاں عجب ہلچل مچی ہوئی تھی۔ جنگ عظیم میں ترکی جرمنی کا ساتھی تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اسے شکست اُٹھانی پڑی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحادیوں کا اثر ملک پر چھا گیا۔ سلطان ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا اس زمانے میں مصطفیٰ کمال نامی ایک شخص اٹھا جو اناطولیہ کا گورنر تھا۔ جب اس نے مرکز کی حالت ابتر دیکھی تو اس نے اپنی طاقت منظم کرنی شروع کی تاکہ اپنے ملک اور اپنی قوم کو

---

[1] اشتمالیت۔

پستی اور شکست سے بچائے۔ جب اتحادیوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا تو سلطان کو مجبور کر کے فرمان نکلوایا جس میں مصطفٰے کمال اور اس کے ساتھیوں کو باغی قرار دے کر قابل گردن زدنی قرار دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پہلی مرتبہ ترکوں میں آلِ عثمان کے خلاف بغاوت کا احساس پیدا ہوا۔ مصطفٰے کمال نے مختلف قسم کی دقتوں کا سامنا کیا۔ لیکن قسمت نے اسے ہر جگہ کامیاب کیا۔ اس نے اب شاہی کو بالکل ہی ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں صاف طور پر اعلان کر دیا کہ "ان سلاطین نے ملک کی دولت عیاشیوں میں برباد کر ڈالی ہے۔ اور قوم کو فقیر و قلاش کر دیا ہے۔" آگے چل کر مصطفٰے کمال نے انگورہ کو اپنا مرکز بنایا اور صدر منتخب ہو کر اپنی جماعت کو اکثریت دلاتے ہوئے جمہوری حکومت کا اعلان کر کے ۱۹۲۴ء میں خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

اطالیہ میں گو اب تک وکٹر ایمنیول سوم ایک دستوری بادشاہ کی حیثیت سے موجود ہے اور پارلیمنٹ بھی برائے نام قائم ہے۔ مگر مسولینی نے ان کو بالکل ایک عضو معطل بنا رکھا ہے۔ جنگ میں مسولینی نے اتحادیوں کا ساتھ دیا گو کامیاب ہوا لیکن اُسے کوئی مادی فائدہ نہ ہوا۔ اطالوی قوم کا شمار بھی ایک ہاری ہوئی قوم کی طرح ہونے لگا۔ جنگ کے بعد مسولینی نے ۱۹۲۲ء میں اپنی فاشی جماعت کے ساتھ وزارت قائم کی لیکن ۱۹۲۴ء میں اس نے سارے اختیارات حکومت پر موقع پا کر قبضہ کر لیا۔ اشتراکیت اور مزدور پارٹی کو اپنے قابو میں رکھ کر تقریباً ان کا خاتمہ ہی کر ڈالا۔ اس وقت وہ وزیر خارجہ بھی ہے اور وزیر داخلہ بھی۔ وزیر جنگ بھی ہے اور حاکم بھی۔ بالفاظ دیگر مطلق العنان حاکم ہے جس کے خلاف

کوئی بھی سر نہیں اُٹھا سکتا۔

جرمنی میں قیصر دستوری بادشاہ تھا۔ جنگ عظیم میں گو ابتداً جرمنوں کو کامیابی ہوئی لیکن بعد میں ہر جگہ اُن کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ہر طرف سے جرمنی دشمنوں کے نرغے میں آگیا جس وقت ۱۹۱۹ء میں عہدنامہ ورسائی پر جنگ کا خاتمہ ہوا اس وقت جرمنی ایک ہاری ہوئی طاقت رہ گئی۔ اتحادیوں نے دست تصرف دراز کیا اس کے حصے بخرے کر ڈالے مستعمرات آپس میں بانٹ لیں۔ اس پر جنگ کا تاوان عاید کیا۔ عدم ادائی کی صورت میں رہائن لینڈ کو بطور ضمانت لے لیا گیا۔ اور علاقہ سارا فرانس کو دے دیا گیا۔ جرمنی میں اس سے اخلاقی پستی اور سیاسی انتشار شروع ہو گیا۔ عین وقت پر قیصر ملک سے بھاگ گیا۔ اسے اس بنا پر جلاوطن کر کے معزول کر دیا گیا۔ جمہوریہ کا صدر ہنڈن برگ تھا اس نے بادشاہ کے خلاف پروپیگنڈے کو حتی الامکان روکا اکثریت کو شاہ پسند بنا بھی دیا جو قیصر کی واپسی کے منتظر رہنے لگے۔ قیصر کی جلاوطنی ۱۹۲۷ء تک تھی لیکن دو سال اسے اور بڑھا دیا گیا۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ قیصر نے اعلان کیا تھا کہ جب تک اُس کی سرزمین پر اجنبی سپاہ رہے گی وہ اس پر قدم نہ رکھے گا۔ کیونکہ وہ غیر قوم کی ماتحتی پر جلاوطنی کو ہی بہتر سمجھتا ہے۔ جرمنی پر جنگ کی وجہ سے بیجا بار پڑا تھا اس لئے وہاں انتشار برابر قائم رہا۔ ملک پر افلاس کے بادل چھا گئے۔ حکومت کے کاروبار کا چلانا جمہوریہ کے لئے مشکل ہو گیا۔ پھر بھی ہنڈن برگ کی کوششوں سے حالت سنبھلی اور کچھ کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ اس زمانہ میں کابینہ کا صدر ہر ہٹلر تھا۔ اُس نے اپنے اثر سے کام لے کر ایک نازی جماعت بنائی سب سے زیادہ نوجوانوں کو ہموار کیا۔

ایک نیا نظام العمل کابینہ کے سامنے پیش کرکے اس پر عمل کرنے پر ممبروں کو مجبور کیا۔ ۱۹۳۳ء تک اس نے برابر قوت میں اضافہ کیا۔ اسی سال ہنڈن برگ کا انتقال ہوگیا۔ ہٹلر نے اس کی جگہ لینے کی کوشش کی۔ اور اعلان کیا کہ "میں ہی وزیر اعظم اور میں ہی صدر جمہوریہ ہوں"۔ ملک میں انتخابات ہوئے۔ ایک اکثریت نے اس کا ساتھ دیا چنانچہ اُس کی مرضی کے موافق اسی کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور اب سارے اختیارات مقننہ اور عاملانہ اسی کے ہاتھ میں آگئے۔ اور کامل طور پر اس کا اقتدار ہر طرف چھا گیا۔ اس نے خود کو آمر کا لقب دیا۔ آمر کے معنی مطلق العنان حکمراں کے ہیں جس کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ وہ کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی زبان ہی اس کی نظر میں قانون ہوتی ہے۔ جرمنی کی آزادی کا جنازہ ہر ہٹلر کے کاندھوں پر نکل چکا ہے۔

جنگ کے بعد اس سیاسی انقلاب کی وجہ یہ ہوئی کہ مدت سے یورپ میں مختلف قسم کے خیالات اور نظریئے پھیل رہے تھے جن کی وجہ سے بتدریج ہیجان پیدا ہو رہا تھا جنگ کی آگ کو بھڑکانے میں اُنھوں نے تیل کا کام دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کے بعد لینن، مسولینی، ہٹلر اور مصطفےٰ کمال کی جیسی ہی شخصیتیں پیدا ہوگئیں۔ جو پہلے سے مساعد حالات کی منتظر تھیں۔ جب قوم نے دیکھا کہ یہ لوگ ملک اور قوم کے لئے مفید ہوں گے تو ان کے سامنے سر جھکا دیا۔

اطالیہ میں مسولینی نے برسر اقتدار آتے ہی اپنی قوم کے سامنے اعلان کر دیا تھا کہ اس وقت ملک کو ایسے زبردست حاکم کی ضرورت ہے جو ہر بے چینی کو کچل کر فنا کر سکے۔ مسولینی نے ۱۹۲۷ء میں یہ بھی اعلان کیا تھا کہ اسے خود حکومت کا

شوق نہیں بلکہ اطالیہ کو اس کی ضرورت ہے اس لئے وہ اس کے سرپر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسولینی مخالفت کا خفیف سا عنصر بھی رکھنا نہیں چاہتا کسی موقع پر مسولینی نے کہا تھا کہ دنیا کا امن خطرہ میں ہے۔ جرمنی کی حالت ناقابل بھروسہ ہے۔ اُس نے قوم کے سامنے بری اور بحری اور ہوائی قوتوں کو ترقی دینے پر زور دیا۔ اس نے ۵۰ لاکھ بری فوج کی ہر وقت تیار رہنے کی اہمیت واضح کی ایک زبردست ہوائی بیڑے کی ضرورت کو بتایا۔ اُس نے اُسی وقت کہا تھا کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ یورپ کی قسمت کا آخری فیصلہ کرے گا۔ اُس وقت ہمارے پاس اتنی فوج ہونی چاہیئے کہ ہم دنیا کو اپنی آواز سننے اور اپنے حقوق منوانے پر مجبور کر سکیں۔ اسی قسم کی پیشین گوئی ۱۹۲۷ء میں قیصر نے عالم جلاوطنی میں کی تھی کہ مجلس اقوام جن بنیادوں پر قائم ہے ان کی کسی ملک کو پرواہ نہیں۔ تمام ممالک اب بھی جنگی طیاریوں میں مصروف ہیں جو ایک دوسر سے خائف ہیں۔ آیندہ دس سال کے عرصہ میں ایک خونریز جنگ کا سامنا دنیا کو کرنا ہوگا۔ یہ جنگ دنیا کی چولیں ہلا ڈالے گی۔ اس سے بڑی بڑی سلطنتوں کی کایا پلٹ جائے گی۔ یہ جنگ پچھلی جنگ کی مانند کئی سال تک متواتر جاری نہ رہے گی بلکہ بجلی کی سرعت سے آناً فاناً کام ہوگا

مندرجہ بالا دونوں پیش بینیاں آج کل ثابت ہو رہی ہیں۔ ہر ملک فوجی تیاریوں میں تیزی کے ساتھ منہمک ہے۔ مصطفیٰ کمال نے کامل طور پر ملک کو آزاد کرا لیا اور جدید ترکی کی بنیاد ڈالی۔ ایک زبردست بیڑا اور فوج تیار کر لی۔ ملک پر اب تک وہی صدر جمہوریہ ہے۔ اس نے مختلف ممالک سے معاہدات

کر لئے ہیں۔ نئی نئی تحریکات کی بنا پڑ چکی ہے اور اب ملک بہ نسبت پہلے کے بہتر حالت میں ہے۔ ہٹلر نے موجودہ حالت پر پہونچتے ہی معاہدہ ورسائی کو کالعدم قرار دیتے ہوئے آیندہ سے تاوان جنگ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے بھی اپنی طاقت بڑھانی شروع کر دی ہے۔ دنیا میں اس وقت روس کے بعد اسی کی فوجی قوت سب سے زیادہ ہے۔ جرمنی اب ایسی حالت پر پہونچ گیا ہے کہ اُس سے ہمسایہ سلطنتیں گھبرا رہی ہیں۔ اس نے ۱۹۳۵ء میں رہائن لینڈ کا علاقہ واپس لے لیا۔ اور کسی نے مزاحمت نہ کی۔ اس وقت مالیہ کی حالت ذرا خراب ہو چلی ہے اس لئے نوآبادیات کا مطالبہ شروع کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انقلاب کا اندیشہ ہو اس کے نمایندے اس وقت سارے یورپی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جو اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ سب ہٹلر کا ساتھ دیں۔ نیز جس وقت جرمنی جنگ کا اعلان کرے وہ ملک کے اندر خانہ جنگی شروع کر دیں۔ تاکہ ہٹلر کو کامیاب ہونے کا اچھا موقع ہاتھ آئے۔ بلغاریہ اور زیکوسلوویکیا جرمنی کے ساتھ ہیں۔ بلجیم نے تھوڑا عرصہ ہوا اعلان کر دیا ہے کہ وہ آیندہ جنگ میں غیر جانب دار رہے گا۔ فرانس اس سے گھبرا گیا ہے کیونکہ بلجیم پر اسے کافی بھروسہ تھا۔ اس سے ہٹلر کی ہمت اور بڑھ گئی ہے۔ وہ فرانس کو ہر طرف سے اسی طرح پریشان کرنا چاہتا ہے جس طرح جنگ عظیم میں اُس نے جرمنی کو پریشان کیا تھا۔ فرانس کی سیاسی ہوا بھی بدلتی جا رہی ہے جمہوریت سے کچھ کچھ بے اعتمادی سی ظاہر ہونے لگی ہے۔ اور اب دوبارہ شاہی کی طرف رجحان نظر آرہا ہے۔ فرانس میں ہر ملک کے کارندے موجود ہیں اور انھوں نے وہاں ایک ہلچل مچا رکھی ہے

شاہی کا طرفدار ایک شخص ڈک ڈی گائز ہے یہ خود کو قدیم شاہی خاندان کا فرد ظاہر کر کے طرفداروں کی جماعت بنا رہا ہے۔ برطانیہ خاموش ہے۔ اس کی عدم مداخلت کی پالیسی نے ہٹلر کے ولولے اور بڑھا دئیے ہیں۔ ضرورت ہے کہ برطانیہ کی خارجی حکمت عملی ایسی ہو جو جنگ جو اقوام کے بڑھتے ہوئے ارادوں میں حائل ہو سکے۔ لیکن جب تک برطانوی پالیسی غیر جذبہ دار رہے گی دنیا کے لئے جنگ اور بد امنی کا خطرہ ہر روز بڑھتا ہی جائے گا۔ انگلستان ایک زمانہ سے فرانس کا حلیف ہے لیکن اس کی خاموش روش سے فرانس مایوس ہوتا ہوا نظر آرہا ہے اس کو دور کرنے کے لئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب فرانس اور برطانیہ کے وزیر خارجہ مل چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی تشفی بخش نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ مسولینی نے ۱۹۳۶ء میں حبش پر قبضہ کر لیا۔ اب اُس نے مجلس اقوام سے بھی علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ وہ اس وقت تک مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہے جب تک دوسری حکومتیں اس کے حبش کے قبضہ کو تسلیم نہ کریں۔ یہ بھی اپنی قوت کو آئے دن بڑھاتا ہی جاتا ہے۔ آبادی عمداً بڑھائی جا رہی ہے جس عورت کے سب سے زیادہ بچے ہوتے ہیں اس کو انعام دیا جاتا ہے۔ اس سے مقصد یہی ہے کہ قوم مضبوط رہے۔ فرانس اس وقت جرمنی اور اطالیہ دونوں سے خائف ہے۔ بحیرۂ روم کے قضیہ کی وجہ سے ہر ایک کا خصوصاً برطانیہ کا مفاد خطرہ میں آگیا ہے۔ برطانیہ اس کوشش میں ہے کہ اطالیہ سے کسی طرح مفاہمت ہو جائے تاکہ اس کا مشرقی مفاد خطرہ میں نہ آئے جیسا کہ نہ وولی کانفرسوں کے انعقاد سے ثابت ہو چکا ہے چند دنوں تک برابر آبدوز کشتیاں نقصان پہونچاتی رہیں۔ تھوڑے سے وقفہ کے

بعد سے اب پھر وہی حالت ہو رہی ہے برطانیہ سخت پریشانی کے عالم میں پھنسا ہوا ہے۔ سب سے زیادہ اس وقت دنیا کی نظروں میں اسپین کی خانہ جنگی خطرناک شے ہے۔ جہاں جمہوریہ اسپین کے خلاف جنرل فرانکو نبرد آزما ہے۔ جو آمریت قایم کرنا چاہتا ہے۔ اٹلی اور جرمنی در پردہ امداد کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہٹلر اور مسولینی کچھ دنوں قبل برلن میں مل چکے ہیں انھوں نے آئندہ کے لئے دوستی اور صلح و آشتی کا پیمان باندھا ہے۔ یہ دونوں فرانس کو ہر طرف سے گھیر کر مٹانا چاہتے ہیں بلجیم نے تو غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ اسپین پر فرانکو قابض ہو کر ممکن ہے کہ ہٹلر اور مسولینی کا ساتھی ہو جائے۔ آسٹریا کو الگ ہٹلر ہموار کر رہا ہے۔ اس حالت نے فرانس اور باقی یورپ کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اسپین پر باغیوں کا قبضہ بحیرۂ روم، ساحل آفریقہ اور جبرالٹر پر اطالوی اور جرمن اقتدار کی تمہید ہے۔ اس سے خاص سراسیمگی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن برطانیہ آنکھیں بند کئے ہوئے عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ مشرق میں جاپان چین کے ساتھ برسرپیکار ہے نصف سے زیادہ چین کو ہڑپ کر چکا ہے۔ جرمنی اور اٹلی ادھر بھی منہمک ہیں۔ اور پیمان باندھا جا چکا ہے۔ روس چین کا موافق ہے گا ہے گاہے امداد بھی دے رہا ہے۔ خطرہ ہے کہ اسپین کی خانہ جنگی جس میں پرتگال باغیوں کے ساتھ ہے۔ اور جنگ چین و جاپان کہیں عالمگیر جنگ کے محرک نہ بن جائیں۔ روس میں آسٹالن کے ہاتھ میں اقتدار ہے جس کے خلاف تھوڑا عرصہ ہوا سازش ہوئی تھی جس میں جرمنی کا ہاتھ سمجھا جا رہا ہے۔ انگلستان کو روس سے بہت خطرہ ہے۔ کیونکہ روس نے افغانستان سے تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ جنوب میں افغانستان کے بعد ہندوستان

ہی ہے جہاں کی سیاسی فضا آج کل حد سے زیادہ مکدر ہو چکی ہے جس کی وجہ ۱۹۳۵ء کا قانون حکومت ہند ہے برطانیہ روس سے محض اس لئے خائف ہے کہ کہیں وہ ہندوستان کی طرف پیش قدمی نہ کر بیٹھے۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ افغانستان اور روس کے معاہدہ کو توڑوا دیا جائے لیکن ناکامی ہوئی۔ روس سے ترکی نے بھی تعلقات کو مضبوط کر لیا ہے۔ سابق وائسرائے ہند لارڈ ارون جو اس وقت لارڈ ہیلی فیکس ہیں ۱۷ نومبر ۱۹۳۷ء کو جرمنی ہٹلر سے ملنے گئے تھے جس کا مقصد نوآبادیاتی مسائل پر گفتگو کر کے سمجھوتہ کرنا تھا۔ کیونکہ برطانیہ کو اس وقت امن کی ضرورت ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کافی تیار نہیں ہے۔ جرمنی کو برطانیہ سے اس وقت دشمنی کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی جب نوآبادیات کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جرمنی کو اگر نوآبادیات واپس کر دی جائیں تو وہ مزید دس سال کے لئے صلح اور امن کے لئے معاہدہ کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ جرمنی کی امن پسندی کا مطلب ہٹلر کی طاقت میں اضافہ کرنا ہے اس کے علاوہ معاشی حالت ایسی ہی صورت میں درست ہو سکتی ہے۔ جرمنی نے ابھی حال میں یہ اعلان کیا ہے کہ ۱۸۹۷ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان جو لوگ پیدا ہوئے ہوں ان کا طبی معائنہ کیا جائے تاکہ وہ فوج میں بھرتی کئے جا سکیں۔ جو فوج میں محفوظ سپاہیوں کا کام انجام دیں گے۔ اس طرح ۲۵ لاکھ سپاہیوں کو جمع کیا جائے گا۔ جرمنی نے یہودیوں کو ملک سے نکال دیا ہے اب وہ فلسطین میں آکر بس رہے ہیں جس سے وہاں کی حالت بھی نازک ہو رہی ہے۔ عرب اس کے سخت مخالف ہیں۔ اٹلی نے اب اس وقت مسلم نواز

پالیسی اختیار کی ہے۔ مسولینی نے محافظ اسلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے یہ بھی ایک سیاسی ہتھکنڈہ ہے جس سے اس کا مقصد شام، مصر اور حجاز پر اپنا اثر قائم کرنا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ ان حالات کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

موجودہ دور کی اس سیاسی کشمکش سے عوام اور خصوصاً ترقی یافتہ ممالک کا رجحان آمریت کی طرف ہو چلا ہے جس کا اثر اب ایشیا پر بھی پڑ رہا ہے۔ اس رجحان کا سبب یہ ہے کہ جمہوری یا دستوری شاہی اتنی مفید ثابت نہیں ہو رہی ہیں جتنی کہ آمریت۔ ملک میں جو کاروبار ہوتے ہیں وہ آمریت کے تحت آناً فاناً پایہ تکمیل کو پہونچائے جاتے ہیں۔ جمہوریہ میں ایک ایک معاملہ برسوں تک ٹلتا رہتا ہے کیونکہ جب تک پارلیمنٹ کا انعقاد نہ ہو کوئی چیز زیر بحث اور تصفیہ آ ہی نہیں سکتی۔ ایسی ہی اور بھی چند باتیں ہیں جو جمہوریت کے مقابلہ میں آمریت کو ہر دلعزیز بنا رہی ہیں۔ فرانس جو دستوری اعتبار سے جرمنی کا سخت مخالف ہے بہ سن کر تعجب ہوتا ہے کہ وہاں جمہوری طریقۂ حکومت سے بیزاری برتی جا رہی ہے۔ اور آمریت کے قیام کے لئے مختلف کمیٹیاں زور دے رہی ہیں جن کا خیال ہے کہ آمریت کو قائم کرکے آہستہ آہستہ قدم اٹھایا جائے اور آخر کار شاہی قائم کر دی جائے۔ اس خیال کا حامی زیادہ تر قدامت پرست طبقہ ہے۔ آمریت کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس حد تک اور کتنی مدت تک کامیاب رہے گی لیکن یہ امر یقینی ہے کہ جب بھی سیاسی ہیجان شروع ہوگا تو اس کے بعد ہر صورت میں یہی طریقہ مفید اور کار آمد ثابت ہو سکتا ہے جس کا ثبوت زمانہ حال کے رجحانات ہیں۔ جو بتا رہے ہیں کہ آمریت کو شاید ہی زوال ہو لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ آمریت کا اسی وقت تک بول بالا رہے گا جبتک قومیں ساتھ دیں گی اور آمر نیک نیتی سے کام کرتا رہے گا۔ جہاں ذاتی مفاد کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت آمریت کا خاتمہ یقینی ہے۔ ختم شد

غزل

از جناب مولوی عبدالرب صاحب کوکب مددگار کلیہ اورنگ آباد

کیوں رہ نہ جائیں کام سے تیغ آزما کے ہاتھ
میں سخت جاں ہوں موت ہے میری قضا کے ہاتھ

دل کو لیا ہے آپ نے ہم جانتے ہیں سب
جاتے کہاں ہو سادگیوں سے ملا کے ہاتھ

ہیں اور اشارہ تم کو کروں ہاتھ ٹوٹ جائیں
اپنے خدا سے کی تھیں دعائیں اٹھا کے ہاتھ

سب کو شراب دی عمداً اک مجھے نہ دی
اور میں نے لے لیا جو سبو جب بڑھا کے ہاتھ

دیکھے ذرا ہماری روا داریاں کوئی
اُٹھے تو بزم غیر میں سب سے ملا کے ہاتھ

دے اور کر غرور نہ دے کر نہ کر غرور
اے دینے والے بند نہیں ہیں خدا کے ہاتھ

میں پوچھتا ہوں یہ کہ مجھے تم نے کیا رہا
جینا بقا کے ہاتھ ہے مرنا فنا کے ہاتھ

ہے آدمی کے ساتھ زمانہ کا یہ مذاق
جس طرح کھینچ لے کوئی اپنا بڑھا کے ہاتھ

جبر اُس پہ اختیار ہوا دوسرا یہ جبر
باندھے ہیں اُس نے بندۂ بے دست و پا کے ہاتھ

گلشن میں وقتِ صبح نہ کیوں مُسکرائیں پھول
اک آشنا کے ہاتھ میں تھے آشنا کے ہاتھ

کیسے تُنک مزاج سے عہدِ وفا ہوا
آئے جو منتوں سے تو جائے چھڑا کے ہاتھ

ساقی کو پھر دعائیں بھی مُنہ بھر کے دیں ضرور
پی لی وہی جو آگئی کچھ بچ بچا کے ہاتھ

ہے سنسناتی گھومتی پھرتی جو بادِ صبح
چلا رہی ہے آتشِ گل سے جلا کے ہاتھ

گھبرا کے فصلِ گل کی جنوں خیزیوں سے ہم
صحرا میں پاؤں رکھتے ہیں گھر سے اُٹھا کے ہاتھ

کوکب یہ تم ستم پہ ستم ڈھاؤ شوق سے
وہ بد نصیب اور نکل جائے آ کے ہاتھ

ہندوستان کے مویشی

از

محمد شمس الدین صاحب فاروقی متعلم جامعہ عثمانیہ

ہندوستان میں مویشیوں کے بغیر زراعت ایک حد تک ناممکن ہے مویشی بالراست و بالواسطہ تمام زرعی مدارج کے طے کرنے میں کاشت کار کا ہاتھ بٹاتے ہیں، تخم ریزی کرنا، رہٹ چلانا، ہل جوتنا، دروکرنا، درو کے بعد بذریعہ کھلہ اناج اور بھوسی کا علیحدہ کرنا، پیداوار کو فروخت کے لئے بازار لے جانا وغیرہ بھی مویشیوں کے ذریعہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ غیر اوقات فصل میں منڈی چلانا اور شیر خانوں کا قیام ان ہی کے وجود پر مبنی ہے۔ اصلی اور بہترین کھاد ان ہی سے دستیاب ہوتا ہے۔ الغرض ہر درجہ میں کاشتکار مویشیوں کی مدد کا محتاج ہے بدیں وجہ وہ کاشت کار کے دست و بازو اور زندگی کا سہارا سمجھے جاتے ہیں۔

تعداد مویشیاں بھی ہندوستانی آبادی کے مماثل ہے۔ یہاں (۱۰۰) ایکڑ مزروعہ رقبہ پر (۶۶) مویشی پائے جاتے ہیں ہالینڈ (۳۸) اور مصر میں (۲۵) گو ہندوستان میں مویشیوں کی تعداد مسلمہ طور پر زیادہ ہے یعنی برطانوی ہند میں (۱۵۲) ملیں اور دیسی ریاستوں میں (۳۶) ملیں۔ بالفاظ دیگر ہندوستان میں مویشیوں کی تعداد، دنیا کی مجموعی تعداد کے ⅓ ہے۔ (دنیا کے مویشیوں کی مجموعی تعداد (۶۹۰) ملین ہے) لیکن اس کثرت تعداد کے باوجود ان کی

اکثریت ناکارہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان سے یہاں کی ضروریات پوری نہیں کی جاسکتی، برخلاف اس کے ہالینڈ کے مویشی وہاں کی ضروریات کو پورا کرکے غیر ممالک کی ضروریات میں حصہ لیتے ہیں۔ اصل چیز قسم مویشی ہے نہ کہ تعداد مویشی!

ہندوستان میں تقسیم عدم مساوات مویشی کے اسباب ہندوستان میں مویشیوں کی تقسیم بھی غیر مساوی ہے۔ بعض صوبوں میں ان کی تعداد زیادہ ہے اور بعض میں کم۔

ذیل کا جدول مختلف صوبوں میں مویشیوں کی کم و بیش تعداد بتلاتا ہے

صوبہ	تعداد مویشی	ہر سو ایکڑ کاشت پر
میرٹھ	۷۸	״ ״ ״
گورکھپور	۸۲	״ ״ ״
اکولہ	۲۸	״ ״ ״
رائپور	۶۰	״ ״ ״
بلاری	۲۱	״ ״ ״
تنجور	۸۰	״ ״ ״
لائل پور	۴۹	״ ״ ״

مذکورہ بالا کمی بیشی کے مختلف وجوہات ہیں تقسیم کاشت، طریقۂ کاشت، چاہی آبپاشی، چراگاہوں کی کثرت یا قلت تقسیم و انتشار اراضی، مویشیوں کی جسمانی حالت۔

ان کی تعداد کی کمی میں زمین کی نوعیت کو بہت کچھ دخل ہے سمت مرھواڑی میں زیادہ رقبہ کے لئے کم مویشی درکار ہوتے ہیں برخلاف اس کے تلنگانہ میں زیادہ مویشی رکھنا پڑتے ہیں کیونکہ وہاں زمینوں پر زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ طریقۂ کاشت سے بھی مویشیوں کی تعداد متاثر ہوتی ہے، کاشت عمیق کے لئے زیادہ مویشی اور کاشت وسیع کے لئے نسبتاً کم مویشی درکار ہوتے ہیں۔ چاہی آبپاشی کے لئے زیادہ مویشیوں کی ضرورت ہے۔ چراگاہوں کی کثرت اور قلت کے ساتھ ساتھ مویشیوں کی تعداد بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ تقسیم انتشار اراضی کی شدت کے لحاظ سے فی کس رقبہ کی کمی کے باوجود کاشت کار کو اپنی ضروریات کے لئے زیادہ مویشی درکار ہوتے ہیں۔

کاشت کاروں کی مفلسی اور مفلوک الحالی بھی مویشیوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عدم واقفیت اور جہالت کی وجہ سے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ وقتی فائدے کی خاطر آئندہ مفاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مویشیوں کی جانب سے لاپرواہی برتتے ہیں بوقت ضرورت ان کی اچھی طرح نگہداشت اور دیکھ بھال کی جاتی ہے لیکن کام نکل جانے کے بعد انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

عمدہ غذا اور چارے کی کمی کی وجہ سے مویشی کمزور اور ناقص ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو غذا کی کمی، مویشیوں کی تندرستی کو تباہ کر رہی ہے، تو دوسری طرف تباہ حال کاشت کار ضروریات کے لحاظ سے زیادہ مویشی رکھنے پر مجبور ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مویشیوں کا مسئلہ، دراصل ان کی تعداد میں کمی

ونیز بہتر قسم کے مویشیوں کا انتخاب اور عمدہ غذا فراہم کرنا ہے۔

مویشیوں کی غذا اور متعدد نقائص

(۱) مغربی ممالک میں فراہمیٔ غذا کی ذمہ داری مالکان مویشی پر عاید ہوتی ہے لیکن یہاں ذیلی پیداوار میں (مثلاً موٹا اناج اور بھوسی وغیرہ) بطور غذا کے دی جاتی ہیں، ذخیرہ کے ختم پر مقامی چراگاہوں سے غذا حاصل کی جاتی ہے کثرت آبادی مقامی چراگاہوں پر اثرانداز ہو رہی ہے جس کا نتیجہ چراگاہوں کے رقبہ کی کمی کی شکل میں نکل رہا ہے۔ اور اب حالت یہ ہے کہ چراگاہیں مویشیوں کی ضروریات کے لئے ناکافی ہیں دیگر چراگاہوں کا فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے مویشی متمتع نہیں ہو سکتے۔

(۲) چراگاہوں کی قسم گھانس ادنیٰ ہوتی ہے کثرت بارش کی وجہ سے گھانس بہت جلد بڑھ جاتی ہے اور ناقص چارے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ علاوہ ازیں ان چراگاہوں کی سرسبزی کی مدت بھی قلیل ہوتی ہے کیونکہ ایسی آب وہوا میں پرورش پاتی ہیں جہاں سال کے چار ماہ بارش ہوتی ہے اور اسی دوران میں وہ سرسبز اور شاداب بھی رہتے ہیں مگر دسمبر اور ماہ جولائی کے درمیاں سوکھ جاتے ہیں۔

(۳) چراگاہیں مشترک ہوتی ہیں۔ علاوہ کاشت کار طبقہ کے مویشیوں کے غیر کاشت کار طبقہ کے مویشی بھی بے روک ٹوک غذا حاصل کرتے ہیں۔

(۴) مقامی چراگاہوں پر مویشی اس کثرت سے چرتے ہیں کہ گھانس کو اچھی طرح اُگنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

۵۔ بعض زمین دار چراگاہوں کا ہراج کر دیتے ہیں اور خریدار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہوسکے ان پر زیادہ سے زیادہ مویشی چریں تاکہ اس کی آمدنی میں اضافہ ہو۔

۶۔ زمین دار، نیز حکومت، بعض اوقات چراگاہوں کے رقبہ میں سے لگان پہ اراضیات اٹھا دیتے ہیں۔

اصلاحی تدابیر

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چراگاہوں کے رقبہ میں اضافہ کیا جائے لیکن بڑھتی ہوئی زراعت پیشہ آبادی کے مدنظر یہ صورت ناممکن ہے البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ موجودہ چراگاہوں سے بیشتر فائدے اٹھانے کی کوشش کی جائے اور ساتھ ہی احتیاط سے استعمال کیا جائے۔ چرائی کے حقوق پر پابندیاں عاید کی جائیں چراگاہوں کے حصص کئے جائیں اور ہر حصے پر یکے بعد دیگرے مویشی چرائے جائیں تاکہ گھاس اچھی طرح اُگنے پائے۔ ذخیرہ رکھے جائیں۔

ا۔ چرائی پر پابندیاں

غیر کاشت کار طبقہ کے مویشی صرف کسانوں کے مویشیوں کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ فصلوں کو بھی غارت کرتے رہتے ہیں جہاں عام چراگاہیں ہیں وہاں غیر کاشت کار طبقہ کے مویشیوں پر پابندی عاید کرنا مشکل ہے البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ دیہاتیوں کے ضروریات کے مدنظر مویشیوں کی ایک معین تعداد چراگاہوں میں چرنے کے لئے مقرر کی جائے۔ جہاں رقبہ وسیع ہو حصص میں تقسیم کیا جائے۔ زراعت پیشہ طبقہ کے مویشی اور غیر کاشت کار طبقہ کے مویشیوں کے لئے دونوں حصص مختص

کئے جائیں نگرانی کے لئے انجمنیں قائم کی جائیں تاکہ کسی کاشت کار کے مویشی مقررہ تعداد سے زیادہ چرنے نہ پائیں۔

۲۔ گھاس کے ذخائر خشک گھاس ناقص ہونے کی وجہ سے بطور غذا کے استعمال نہیں کی جاتی۔ موسمی حالات اور کاشت کاروں کی لاپروائی خشک گھاس کو ناقص بنانے کی ذمہ دار ہے۔ کثرت بارش اور گرمی کی وجہ سے گھاس بہت جلد تیار ہو جاتی ہے اسی دوران میں ذخیرہ جمع کیا جائے تو سڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے عموماً گھاس اس وقت کاٹی جاتی ہے جب اس کے بہترین اجزا ضائع ہو چکتے ہیں اگر ختم بارش پر گھاس دَرو کی جائے تو بہتر ہے لیکن یہ زمانہ کاشت کا کی مصروفیات کا ہوتا ہے۔ ذیلی فصلوں کی طرح اس کو بھی اہمیت دی جائے اور دَرو کے لئے اوقات مقرر کئے جائیں تو بہترین چارہ حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن کاشت کاروں کو فرصت ہے اور نہ سہولتیں حاصل ہیں بدیں وجہ حکومت نے اس فرض کو اپنے ذمہ لیا ہے اور ذخیرے جمع کئے ہیں تاکہ خشک سالی میں کاشت کاروں کی مدد کی جا سکے۔

SILAGE -۳ چارے کی قلت کو "Silage" کے ذریعہ رفع کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقے میں چارے کے گلنے سڑنے کا اندیشہ نہیں رہتا، چارے کو گڑھوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے اور حسب ضرورت استعمال کیا جاتا ہے "Silage" کی بڑی خوبی یہ ہے کہ چارہ محفوظ رہنے کے علاوہ ذائقہ دار بھی بن جاتا ہے اور مویشی بڑے شوق سے

کھاتے ہیں۔ درختوں کے پتے اور بعض ناقص گھاس بطور چارہ استعمال نہیں کئے جا سکتے اس لئے انھیں "Silage" کے ذریعہ کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔

۴۔ چارے کی فصلیں مویشیوں کی کثرت کے باوجود ہندوستان میں چارے کی فصلیں مجموعی مزروعہ رقبہ کے بہت کم حصے پر پائی جاتی ہیں یہاں ۴ % رقبہ چارے کی فصول کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے مصر میں جہاں مویشی مقابلۃً کم ہیں چارے کی فصول کے تحت رقبہ کا اوسط ۱۶٫۶ % ہے۔ چارے کی فصول کی متعدد دیسی اقسام مثلاً جوار، باجرا وغیرہ موجود ہیں، بدیسی چارے کے فصول کی ترویج بہت کچھ ممکن ہے، علاوہ ازیں ایسی فصول اگانے کی کوشش کی جائے جن سے علاوہ پیداوار کے چارہ بھی دستیاب ہو سکے۔

چارے کے استعمال کے طریقوں میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ چارہ احتیاط سے صرف کیا جائے اور ضائع نہ ہونے دیا جائے، ممکن ہو تو مشین کے ذریعہ چارا کاٹا جائے، نمک اور گڑ ملا کر ذائقہ دار بنایا جائے۔ درختوں کے پتے اور بعض ناقص گھاس جو کڑوے پن یا کسی اور وجہ سے مویشیوں کے کام نہیں آسکتے، ذائقہ دار بنا کر بطور چارے کے استعمال کیا جائے۔

اصلاح مویشی افزائش نسل حیوانات: کسی زمانہ میں ہندوستان میں مویشیوں کی نسل اعلیٰ قسم کی تھی لیکن گذشتہ

صدی سے چند اسباب، یقیناً، بے قدری، غفلت، لاپرواہی اور ملاپ کی وجہ سے نسلیں خراب ہوتی گئیں۔ کاشت کاروں کی پستی کے ساتھ مویشیوں کی حالت بھی گرتی گئی اور اب خالص نسل کے مویشیوں کو علیحدہ کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ پھر بھی چند صوبوں میں اعلیٰ قسم کی نسلیں پائی جاتی ہیں۔

ہریانہ اور ساہی وال	پنجاب
سندھی	سندھ
مالوی	وسط ہند
کانگریج	گجرات
گیر	کاٹھیاوار
گاولدو	صوبۂ متوسط
اونگول	مدراس

حیدرآباد میں مویشیوں کی تعداد فی صد آبادی (۸۸) ہے یہاں تین قسم کی عمدہ نسلیں پائی جاتی ہیں۔

دیولی: مرہٹواری میں اس نسل کو بہت فروغ حاصل ہے قوی اور صحت ور اور ایگرز زمینات میں ناگرکشی کے لئے موزوں ہیں، گائیں بھی مقابلۃً زیادہ دودھ دیتی ہیں۔

مالوی: جسم کے ہلکے اور پھرتیلے ہوتے ہیں اور باربرداری کے لئے موزوں ہیں۔

کرشنا ویلی: ہو ریائے کرشنا اور تنگھدرا کے درمیان پائے جاتے ہیں۔

اور دیولی کے بہ نسبت ہلکے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مویشیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سخت جان اور کم غذا پر زندہ رہ سکتے ہیں اور خشک سالی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

افزایش نسل سے مطلب یہ ہے کہ ایسے مویشی پیدا کئے جائیں جو تندرست اور قوی ہوں، زیادہ دودھ اور بچے دیں، کم خوراک ہونے کے علاوہ باربرداری کے لئے موزوں بھی ہوں۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف قسم کی نسلیں پائی جاتی ہیں ان عمدہ نسلوں کو علیحدہ کرکے بہترین قسم کے مویشی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ابتدا میں نسل کو ملاپ کے ذریعہ بہترین بنانے کی کوشش کی گئی اور اس غرض کے لئے غیر ممالک سے سانڈ بھی منگائے گئے۔ لیکن یہ نسلیں مجموعی طور پر زیادہ امید افزا ثابت نہیں ہوئیں اور نہ یہاں کی آب وہوا میں پنپ سکیں۔

مستقل کامیابی اور باربرداری کے لئے بہتر قسم کے مویشی حاصل کرنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ مقامی مویشیوں سے ہی بہتر نسلوں کا انتخاب کیا جائے۔ افزائش نسل کی ترقی کے لئے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں حکومت کی جانب سے عمدہ قسم کے سانڈ تقسیم کئے جا رہے ہیں تاکہ ان سے بہتر قسم کے مویشی پیدا ہوں ناقص قسم کے سانڈوں کو آختہ کیا جائے جو کاشت کاروں کے لئے وبال جان ہونے کے علاوہ ترقی افزائش نسل میں روڑے اٹکاتے ہیں اور مویشیوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے عمدہ اور اعلیٰ

نسل کے سانڈ چھوڑے جائیں۔ اکثر لوگ اپنی ضروریات کے مدنظر اپنے ذاتی صرفے سے، سانڈوں کو چھوڑ کر، مویشیوں کی اعلیٰ نسلیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انجمن ہائے افزائش نسل حیوانات

ہندوستان کے اکثر حصوں میں انجمن ہائے افزائش نسل حیوانات قائم ہو چکی ہیں، ان کا کام یہ ہے کہ ارکان کو عمدہ قسم کے مویشی رکھنے کی ترغیب دیں۔ چارے کا انتظام کریں۔ ناقص قسم کے سانڈوں کو آختہ کرائیں اور عمدہ سانڈ فراہم کریں۔ علیحدہ رجسٹر میں مویشیوں کی نسل اور تعداد کا اندراج رہے۔ نمائشیں قائم کی جائیں۔ اس قسم کی انجمنیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہو چکی ہیں بالخصوص پنجاب میں ان کی زیادہ تعداد ہے۔

مویشیوں کے امراض

ہندوستان میں مویشیوں کی شرح اموات بھی بڑھی ہوئی ہے۔ مویشیوں کا مرنا کاشتکاروں کے لئے مصیبت ہے کیونکہ ان کی مدد کے بغیر زراعت ایک حد تک ناممکن ہے، نئے مویشی خریدنے کے لئے مہاجن سے گراں شرح سود پر قرض لینا پڑتا ہے اگر خوش قسمتی سے کچھ مویشی مرض کے حملہ سے بچ جاتے ہیں تو ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کاشتکار زیادہ مویشی رکھنے پر مجبور ہے، تاکہ وبائی امراض سے بچے کھچے مویشی اس کی کمترین ضروریات کو پورا کر سکیں۔ اصلاح مویشی میں وبائی امراض بھی شامل ہیں۔

I Rinder Pest, II Haimorrhagic Septicaemia

III Foot & Mouth Disease.

ملا سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

محکمہ علاج حیوانات

ہر صوبے میں محکمہ علاج حیوانات قائم ہیں جن کا مقصد جانوروں کا علاج اور متعدی امراض کو روکنے کے لئے انسدادی تدابیر اختیار کرنا ہے امراض سے مویشیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں ٹیکہ لگایا جائے لیکن مویشیوں کی کثرت اور کاشت کاروں کا جہل اور تعصب ان عملی تدابیر پر عمل پیرا ہونے سے روکتا ہے۔

اگرچہ تعلقہ جات اور اضلاع پر دورہ ڈاکٹر اور دواخانوں کا قیام عمل میں آیا ہے مگر ضروریات کے لحاظ سے اس میں توسیع کی ضرورت ہے۔ مزید براں حکومت اس بار گراں کو برداشت نہیں کرسکتی۔ لہذا ضرورتاً اس امر کی ہے ٹیکہ اندازی کے اخراجات کاشت کاروں کے ذمے رہے۔

ٹیکہ کے اقسام

ٹیکہ دو طریقوں سے لگایا جاتا ہے۔

I Serum Alone II Serum Simultaneous

پہلے طریقے میں صحت یافتہ مویشیوں کا خون ٹیکہ کے ذریعہ متاثرہ مویشیوں کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے تاکہ مویشی مرض کا مقابلہ بخوبی کرسکیں، لیکن یہ ٹیکہ عارضی ہوتا ہے اور چند روز کے بعد اس کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔ اور اگر ٹیکہ اندازہ شدہ مویشیوں پہ مرض کا دوبارہ حملہ ہوجائے تو ان کا بچنا محال ہوجاتا ہے، اس نقص کو رفع کرنے کیلئے (Serum Simultaneous)

کا طریقہ رائج کیا گیا ہے۔

ایسا خون جس میں مرض کے جراثیم موجود رہتے ہیں ٹیکہ کے ذریعہ مویشیوں کے جسم میں پہنچایا جاتا ہے تاکہ مرض کا ایک ہلکا سا حملہ ہو جائے اور مویشی بڑی مدت کے لئے مرض سے نجات پا جائیں لیکن یہ ٹیکہ خطرناک ہوتا ہے اور بعض مویشی اس کے متحمل نہ ہوکر ہلاک ہو جاتے ہیں بدیں وجہ کاشت کار کو اس قسم کے ٹیکہ کے لئے آمادہ کرنا امر مشکل ہے ٹیکہ کامیاب ہونے کی صورت میں مویشی دودھ دینے سے معذور سمجھے جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹیکہ اندازی سے دوسرے مویشیوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے ٹیکہ شدہ مویشیوں کو علیحدہ رکھا جائے۔

زرعی کمیشن کی سفارشات

۱۔ عمدہ نسل کے مویشیوں یا سانڈوں کو ٹیکہ لگایا جائے۔

۲۔ وبائی امراض کے اثر انداز ہونے کی صورت میں عمدہ اور تندرست مویشیوں کے بچاؤ کی فکر ہونی چاہئے۔

۳۔ صوبوں میں امراض کے انسداد کے لئے قوانین نافذ کئے جائیں جس میں وبائی امراض کی اطلاع دہی اور متاثرہ مویشیوں سے علیحدگی قانوناً لازمی قرار دی جائے۔

۴۔ متاثرہ ہلاک شدہ مویشیوں کو احتیاط سے دفن کیا جائے۔

۵۔ وبائی امراض کے دوران میں متاثرہ اور غیر متاثرہ مویشیوں کے نقل و حمل پر پابندیاں عاید کی جائیں۔

۶۔ ٹیکہ اندازی کے لئے کوئی معاوضہ نہ لیا جائے اور نہ جبراً ٹیکے لگائے جائیں بلکہ تشہیر و تبلیغ کے ذریعہ فوائد بتلا کر۔

۷۔ متاثرہ مویشیوں کی جبراً ٹیکہ اندازی ضروری ہے۔

۸۔ محکمہ علاج حیوانات کو وسعت دی جائے تاکہ مویشیوں کی دیکھ بھال اچھی طرح ہو سکے۔

۹۔ ڈاکٹروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور دورہ ڈاکٹر مقرر کئے جائیں جو تعلقہ کے کل مواضعات کا دورہ کر سکے۔ ہر ۲۵ ہزار مویشیوں پر ایک ڈاکٹر کا تعین لازمی قرار دیا جائے۔

۱۰۔ ہندوستان میں حیوانات کے ڈاکٹروں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

غزل

از

محمد ہاشم صاحب محشرؔ متعلم درجہ دہم الگزینڈرا ہائی اسکول بھوپال

دل کو جو شائقِ غمِ ہجراں بنا دیا — اُلفت نے اس ستم کو بھی احساں بنا دیا
چھپ کر نگاہِ شوق سے یہ کیا ستم کیا — اتنے چھپے کہ خود کو نمایاں بنا دیا
سو جان ہو تو عشق پر کردوں نثار میں — انساں بنا دیا ہے مجھے انساں بنا دیا
ناصح بس اب نہ چھیڑ کہ عشقِ تمام نے — ذوقِ نظارہ جُو کو رگِ جاں بنا دیا
شورِ فغاں ہے شورِ سلاسل کے ساتھ ساتھ — زنداں کو میری قید نے زنداں بنا دیا
حسرت رہی نہ جوش نہ ارماں نہ ولولے — دل لے کے تم نے بندۂ احساں بنا دیا
انکار پر نہ جانے بلا آئی کونسی — اقرار پر تو قیدیٔ امکاں بنا دیا

محشرؔ جنوں نے چھین کے سب جامہ زیبیاں
داماں و آستیں کو گریباں بنا دیا

کالیداس اور شکسپیر

مقابلہ اور موازنہ

از

ڈاکٹر رانجی۔ جی۔ شہانی۔ ڈی۔لٹ

مترجمہ

مرزا متین احمد بیگ سروش متعلم سال اول

حسن کے متعلق یورپی اقوام کا نظریہ یہ ہے کہ حسن کی تجلیات اور کیفیات بہت واضح اور روشن ہیں۔ اس کے تاثرات اگرچہ محدود ہیں مگر اس کی رنگینیاں کائنات عالم کے ذرہ ذرہ میں رنگ آفریں ہیں۔ یہ حسن ہی تو ہے جو ایک مشتِ غبار کالبد خاکی کو حیات ابدی بخشتا ہے اس کی زندگی میں نشاط و سرور پیدا کرتا ہے۔ لیکن ہمارا نظریہ اس کے برخلاف ہے۔ ہم حسن کو چند صفات اور معنے میں مخصوص کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے نزدیک انسانی ذوق کے ساتھ ساتھ حسن کی بدمستیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ ہمارے نزدیک جس طرح ایک انگریز حسینہ حسن و جمال کا مظہر ہے۔ اسی طرح ایک حبشی دوشیزہ بھی حسین ہو سکتی ہے ان میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح دینا اختلاف رجحانات کا کرشمہ یا "لیلی را بچشم مجنوں باید دید" کا مصداق ہے۔

بات یہ ہے کہ انسانی طبائع کے رجحانات۔ خصائص۔ اور نفسیات'

طبعی (Physical) اختلافات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ہر سوسائٹی کے کارنامے اپنے مقامی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں اسی لئے اس کے کردار میں مقامی رسم ورواج کی جھلک ضرور نمایاں رہتی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ شکسپیر کے ڈراموں میں عہد الزبتھ کی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ اور کالیداس کے گلدستوں سے عہد بکرماجیت کی تہذیب وتمدن آشکار ہیں۔ ان دونوں ہستیوں کا مقابلہ اور موازنہ عہد رواں کے ہندوستان اور انگلستان کی تمدنی، معاشرتی اور روحانی فتوحات کے تقابل اور توازن کا مرادف ہوگا۔

اس مختصر مضمون میں یہ تو بہت دشوار ہے کہ کالیداس اور شکسپیر کے تقابل اور توازن کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جاسکے۔ البتہ ان چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے جس میں دونوں ایک دوسرے کے مماثل یا مقابل ہیں۔

اس بات کے واضح کرنے سے قبل یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہی کہ شکسپیر نے وہ زمانہ پایا تھا جس میں انگلستان کی مدنی حالت بہت پست تھی اور وہ قریب قریب نیم وحشی حالت میں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں روحانیت ترقی پذیر تھی مگر ساتھ ہی خوں ریزی اور وحشت انگیزی بھی عمومیت رکھتی تھی۔ اور بقول ڈاکٹر رومین رولینڈ (Romain Rolland) وہ عہد الزبتھ میں انگلستان کے شائستہ جانوروں میں سب سے زیادہ ممتاز جانور تھا۔" اس کے برخلاف کالیداس کے عہد میں ہندی تہذیب وتمدن بہت اعلیٰ تھا۔

ہندوستانیوں کے خیالات میں رنگینی اور جذبات میں روحانیت بیدار ہو چکی تھی۔ شکسپیر کے ڈراموں میں اگر قتل وخوں ریزی کی چیخ و پکار ہے۔ دہشت انگیز اور وحشت خیز کارنامے دلوں کو دہلاتے اور سہماتے ہیں تو کالیداس کے ناٹکوں میں لطیف و نازک احساسات کیف پرور اور وجد آفریں ہیں۔ اس سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک ظالم اور وحشی طبقے (امرا اور خطاب یافتہ گروہ) کا علمبردار تھا تو دوسرا اس علم دوست قوم کا جس میں شاعرانہ احساسات کی فراوانی تھی۔ ہندوستانی شاعر کی زبان (سنسکرت) وسیع شستہ اور منجھی ہوئی تھی۔ اس میں یہ جوہر موجود تھا کہ نازک سے نازک استعارات وتشبیہات بآسانی ادا کی جاسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنے لطیف اور پاکیزہ جذبات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ماہر موسیقی ترنم کے دریا بہاتا چلا جارہا ہے۔ بلاشبہ انگریزی شاعر نے بھی خوب لطیف اور نازک احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ پاکیزہ اور نغمہ ریز زبان لکھی ہے۔ لیکن اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس کے ترنم میں وحشیانہ درشتگی اپنا رنگ بھرے بغیر نہ رہ سکی شکسپیر کی خونینہ داستانیں (جو اس وجہ سے ختم ہو جاتی ہیں کہ اسٹیج پر کوئی ذی روح پیکر باقی نہیں رہتا) ممکن ہے کہ کالیداس اور اس کے معاصرین کے نزدیک شاعر کے وحشیانہ اور بربرانہ خیالات کا انعکاس ہوں۔

اور بھی دقیق نکتے قابل ذکر ہیں۔ مگر بخوف طوالت ان پر سکوت ہی اولیٰ معلوم ہوتا ہے۔ اتنا کہنا کافی ہو گا کہ شکسپیر خدا۔ کے وجود کا قائل

نہ تھا۔ یعنی دہریہ تھا۔ اس کے نزدیک "کسی آئندہ زندگی میں بہبودی کی توقع فضول ہے۔ عقبٰے کے متعلق جو کچھ بھی سوچا جائے لغو ہے" اس کے جتنے تاثرات ہیں وہ سب وقتی اور ہنگامی ہیں۔ اس کی یہ سب صفات کالیداس کے بالکل برعکس ہیں۔ بعض حضرات انگریزی شاعر کے طمطراق سے دھوکا کھاجاتے ہیں اور اسے کالیداس پر فضیلت دیدیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے اندازے کا نصف بھی وزنی نہیں۔

شکسپیر صرف انسانوں ہی میں جذبات واحساسات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ لیکن کالیداس کی ہمہ گیر نظر کائنات کے ذرّے ذرّے کو خوشی وغم سے ویسا ہی متاثر دیکھتی ہے جیسے کہ انسان کو! اس کا سحر کار قلم ہر منظر کی ایسی جیتی جاگتی تصویر کھینچتا ہے کہ ہر حاضر وغائب۔ مرئی وغیر مرئی۔ کرب والم سے بےچین یا بہجت وانبساط سے یکساں سرشار نظر آتا ہے۔ ذرا شکنتلا کے منظر چہارم کو پڑھیئے۔ شکنتلا کی کنوا رشی کے آشرم سے رخصتی کا جو دردناک منظر کھینچا ہے وہ اس کے کمال مرقع نگاری پر بخوبی دال ہے۔ اس کی دو دلی سہیلیاں اور کنوا رشی تو ممکن ہے کہ مقتضائے بشری سے مضطرب اور بےچین ہوں۔ لیکن ذرا کالیداس کے اشہب قلم کی جولانی اور تخیل کی گلکاری ملاحظہ فرمایئے کہ ہر شجر وحجر۔ ہر برگ وبار اور ہر پالتو جانور کی صورت حال سے غمگینی اور حسرت برستی ہے۔ اس کی جدائی میں ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بہت سی دیبیوں اور پریوں کے رسکنے کی آوازیں بھی آتی ہیں۔

عشق و محبت کے تاثرات، صنف نازک کے انداز اور ان کے حسن و جمال کی دلفریبیاں دونوں کے نزدیک یکساں ہیں۔ کالیداس نے اپنے آرٹ کی بنیاد صنف نازک کے تذکرے پر رکھی ہے۔ اور اُنھیں کے گلزار حسن سے اُس کے گلدستوں کی زینت ہے۔ یہی بات شکسپیر کی تصانیف میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر کم تر درجہ میں۔ دونوں دو مختلف النوع شاہدِ رعنا کے مسحور ہوتے ہیں۔ ایک کا معشوق بھولا بھالا ہے اور دوسرے کا اس کے برعکس بہت چالاک اور ساحر ہے۔ ایک مالویکا اور شکنتلا کے معاملات اور داردات عشق و محبت کی تصویر کھینچتا ہے تو دوسرا قلو بطرہ اور میرانڈا کے افسانوں کی مصوری کرتا ہے۔ بہر حال دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی دل ایسا نہیں جس پر عشق و محبت کے چرکے نہ ہوں۔ وارداتِ عشق و محبت کے بغیر انسانی زندگی میں رنگینی و دلچسپی کا برقرار رہنا محال ہے۔ شکنتلا یا میرانڈا کی شادکامی کا راز یہ نہیں کہ وہ صاحب دولت و ثروت یا صاحب اقتدار تھیں۔ بلکہ ان کی فائز المرامی کا راز صرف ان کا جذبہ جانبازی اور سرفروشی ہے۔ یہ حقیقت دونوں بلند پرواز طائروں پر منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیائے محبت میں کامیابی صرف انھیں لوگوں کے قدم چومتی ہے جو اپنی ہستی کو فراموش کر دیں۔ محبت خزینہ قدرت کا بے بہا عطیہ ہے۔ جو قیود مکان و زمان سے پاک ہے۔ جب ایک مرتبہ اس کے شرارے نمودار ہو جاتے ہیں تو ان کا بجھانا محال ہو جاتا ہے۔ نہ تو انسانی اثرات اس کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ نہ آفات روزگار اس میں خلل انداز

ہو سکتے ہیں۔

جیولیٹ (Julliet) یا جیسکا (Jessica) اروسی یا
یا مالویکا کسی کے حسن بیان اور طرزِ ادا کی طلسم کاری پر غور فرمائیے اور پھر دیکھئے کہ دونوں صاحبان کمال نے آتش افروز کے شراروں کی جو مصوّری اور نقاشی کی ہے۔ وہ کہاں تک ناقابل تقلید ہے۔ سب سے زیادہ قابل غور یہ بات ہے کہ ان زندہ جاوید ہستیوں کے قلوب میں آتش محبت ہر جگہ، ہر آن ایک ہی شان سے شعلہ فشاں نظر آتی ہیں۔ اس کی تڑپ اور سوزش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی حسن والفت کے ہنگاموں عاشق ومعشوق کے ناز ونیاز کی تصویروں میں ان کے موقلم نے جس لطافت اور پاکیزگی سے رنگ بھرا ہے۔ اسے دیکھ کر اہل نظر جھومتے اور وجد کرتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں لیکن دنیا ان کے کمال کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہی رہی۔ الغرض دونوں کی باریک بیں نظریں فطرت انسانی کے سربستہ رموز کو کمال طباعی سے اجاگر کرتی ہیں اور دونوں صاحبان فن ایک ہی شان استادی سے اپنے اپنے خیال کے مطابق نقاشی کرتے ہیں۔ لیکن ڈرامائی دنیا میں کردار نگاری کا تقابل کرنے پر یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ ہمارا ہندی دوست نفسیات دانی اور انسانی قلوب کی رمز شناسی اور طرز ادا کی نزاکت میں اپنے انگریزی حریف سے کہیں بالا ہے۔ نالہ ہو یا آہ، تبسم ہو قہقہہ شرم ہو یا حجاب غرضیکہ دلی کیفیات کو اس اچھوتے انداز سے بیان کرتا ہے کہ ہر جگہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔

دل کی اثر پذیری کا یہ حال ہے" اُس کی زبان اپنے دل کی زبان ہے"۔
اس کی غامص نظر دل کے جن پنہاں گوشوں تک پہونچتی ہے اور جن لطیف
اور نازک نکات کو بے نقاب کرتی ہے۔ انھیں شکسپیر کی بیچیں نظر مشاہدہ
نہیں کرتی۔ اس کی غواص طبیعت بحر فطرت انسانی کی جن تہوں سے
موتی رول رول کر لاتی ہے وہاں شکسپیر کی تلوں پسند فطرت کی رسائی
نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نفسیات کا مطالعہ
دونوں ہی نے نہایت غور و خوض سے کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر
کالیداس نسوانی جذبات کے مشاہدہ میں ماہر ہے تو شکسپیر مردانہ جذبات
و احساسات کی تلاش میں زیادہ طباعی دکھاتا ہے۔ کالیداس نسوانی احساسات
کا اندازہ نسوانی دل میں بیٹھ کر کرتا ہے۔ برخلاف اس کے شکسپیر عورتوں کے
محسوسات کا نظارہ بھی نگاہ خصم سے کرتا ہے۔

دونوں صاحبان کمال کے ادبی کارناموں کے مطالعہ میں بات
حیرت انگیز نظر آتی ہے وہ یہ نہیں کہ صنف نازک اور فلسفہ حسن و محبت
کو دونوں ایک ہی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ بلکہ انداز بیان اور حسن ادا
میں بھی دونوں ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ اور جس
طرح وہ فطرت انسانی کی تحلیل ایک ہی زاویہ نگاہ سے کرتے
ہیں۔ اسی طرح فطرت کی سادگی اور مناظر قدرت کی
رعنائیاں بھی ان کی دلچسپیوں کے یکساں سرچشمے ہیں جب
وہ فضائے خوشگوار میں پہونچتے ہیں۔ حسن و

محبت کے افسانے پریوں اور جادوگری کے قصے ان کے گوش گذار ہوتے ہیں۔ چاندنی رات کا جوبن دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے .... دونوں بیخود و سرشار ہو جاتے ہیں..... اس سے بھی آگے .... حسن گل اور نغمہ و سرود دونوں کے بحر تخیل میں خوشگوار تموج اور دلفریب تلاطم پیدا کر دیتے ہیں اور اس کے رنگا رنگ مونی ہمارے دیدہ و دل کو لبھانے لگتے ہیں۔

بہت سے انگریز نقاد جو شکسپیر کی فضیلت کو نمایاں کرنے میں بہت زیادہ مبالغہ کرتے ہیں۔ وہ دوسرے صاحبان کمال کو شکسپیر کے آگے ہیچ پوچ بتاتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے (ان کے عقیدہ کے مطابق) کہ اگر شکسپیر آفتاب ہے تو دیگر تمام فضلائے باکمال ستارے یا ٹمٹماتے ہوئے دیئے۔ میں نہایت آزادی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے دعوے کی بنیاد کھوکھلی ہے اس کا تمام تر دارو مدار ان کی تنگ نظری اور قومی تعصب پر ہے۔ البتہ جو فراخ دل اور انصاف پسند مفکرین ہیں وہ میری رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔ میرے مرحوم دوست تھومس وائٹ ٹیکر (Thomas White Taker) جنھوں نے شکسپیر کی تصانیف کا خاص طور سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی رائے ہے کہ (Aeschylus) کی (Prometheus Bound) یوروپین ادب میں سب سے ممتاز تصنیف ہے۔ اور سون برن (Swinburne) کی بھی یہی رائے ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ گذرا کہ (Havelock Ellis) نے مجھ سے تسلیم

کیاکہ وہ شکسپیر کی خزینہ داستانوں کے شور و گرج سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے۔ پروفیسر (Emile Legonis) نے مجھ سے اقرار کیاکہ شکسپیر کی طربیہ داستانوں میں زیادہ تر مخصوص ماحول اور عارضی حوادث ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح کسی ماہر فن مصور کے البم میں ہر تصویر یکساں نہیں ہوتی اسی طرح دنیا کے باکمال ادیبوں کے ادبی کارناموں کو بھی رطب و یابس سے پاک تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں آپ کو بہت کم ایسے حصّے ملیں گے جن میں شہرت دوام کی اہلیت موجود ہے۔ بلاشبہ شکسپیر کے ادبی کارناموں میں بھی بہت سے اجزا غیر فانی ہیں۔ لیکن یہ کہناکہ اس کی جملہ تصانیف ایک ہی پلہ کی ہیں اور سب ہی کو بقائے دوام حاصل ہے۔ حقیقت سے بعید ہے۔

تقریباً نصف درجن ڈرامے اور چند سانیٹ (Sonnets) شکسپیر کی ایسی ہیں جن کو میں بذات خود پسند کرتا ہوں۔ قطع نظر چند مستثنیات کے میں تاجر وینس (Merchant of Venice) کو بمشکل پڑھ سکتا ہوں..... شاید یہ میری غلطی ہے!! شکسپیر نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ محض فنی نقطہ نظر سے لکھا ہے اور وہ صرف فن کار ہو کر رہ گیا ہے۔ حقیقت سے دور جا پڑا ہے میرا تو خیال ہے کہ ڈکنس کے ایک صفحے میں جس قدر (Humanity) موجود ہے وہ شکسپیر کے کسی ایک پورے ڈرامے پر بھاری ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ بات بادی النظر میں عجیب معلوم ہو۔ لیکن کیا کیا جائے حقیقت کچھ ایسی ہی ہے!

کالیداس بھی خامیوں سے مبرا نہیں ہے۔ رگھو ونشا[۵۱] (Race of Raghu) میں گو اس نے اپنی جدت طرازی اور رنگین بیانی سے نفس مضمون میں جان ڈال دی ہے۔ لیکن بنظر مطالعہ کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوشامدی درباری چاپلوسی میں مصروف ہے رتو سنہار میں (Cycle of Seasons) ہندوستانی آب وہوا کی دلفریبیوں کو نہایت خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ شاعری کا کوئی عمدہ نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔

میگھ دوت (Cloud Messenger) یا قاصد ابر کی بجائے خود اپنی ایک نمایاں حیثیت ہے۔ یہ ایک بہت دلپذیر اور حسین شاہکار ہے۔ اس میں پھول کی سی شگفتگی۔ بہار کی سی رنگینی۔ ساون کی رات کی سی مستی ہے۔ والمیکا اگنی متر اگرچہ سماجی نقطۂ نظر سے نہایت اہم تصنیف ہے لیکن شاعرانہ زاویہ نگاہ سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں دونوں میں کون برتر ہے؟ میرے نزدیک یہ سوال نہایت غیر دانشمندانہ

نوٹ :۔ رگھو ونشا، رتو سنہار، میگھ دوت، والمیکا اگنی متر یہ سب کالیداس کی چند رزمیہ اور بزمیہ نظمیں ہیں۔ رگھو ونشا میں اجودھیا کے خاندان شاہی کا تذکرہ ہے۔ اسی میں رامچندر جی کی بن باسی اور راون سے جنگ کے بعد ان کی واپسی کا متحرک اور عبرت آموز بیان ہے۔ والمیکا اگنی متر میں شنگاہ خاندان کے بانی پشی متر کے بیٹے اگنی متر اور اس کی بیوی کی کنیزہ مالویکا کے تذکرہ عشق و محبت پر مشتمل ہے۔

ہے۔ ان کے علم وفضل کا امتیازی درجہ اس طرح قائم کرنا جس طرح اسکول کے بچوں کا درجہ امتحان میں قائم کیا جاتا ہے عقل کی کوتاہی کی دلیل ہے۔ تاہم اگر مجھے کسی جواب کے لئے مجبور ہی کیا جائے تو میں شکسپیر کو بتھوون (Beethoven) اور کالیداس کو مزارٹ (Mazaret) کا جانشین قرار دوں گا۔

موجِ نسیم

از

سید عزیز الحسن ضیاؔ تلمیذ عالیجناب نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیلؔ مدظلہ

بعد مرے بشوق دل یوں تو مری گلی میں آ
وعدے کی لاج ہے اگر آ مری زندگی میں آ

ہائے کدھر وہ چھپ گیا جس نے مجھے بتا دیا
کعبہ کے راستے سے جا اور مری گلی میں آ

حسن صبیح کی بہار یونہی دکھا تو بار بار
اے مرے ماہ گلعذار! پھر کبھی چاندنی میں آ

غیر جو ماریں لاکھ سر اُن کا نہ ہو سکے گذر
شہر سے کوسوں دور پر رات کی خامشی میں آ

دل ہے فراق میں کباب، بادِ خزاں کا ہے عذاب
ابرِ بہار انقلاب! گلشن زندگی میں آ

وعدۂ یار گلبدن، دل کو مرے بنا چمن
رنگ شگفتگی کا بن، اور مری کلی میں آ

قصائد مومن

از جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مددگار طبقہ فوقانیہ کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد

اصناف سخن میں قصیدہ ایک ایسی صنف ہے جس پر طبع آزمائی کرتے وقت شاعر کو اپنی علمی قابلیت، زور قلم اور زور طبیعت کو پوری طور پر صرف کرنا پڑتا ہے. علوئے مضامین، بلندی تخیل، شکوہ الفاظ بندشوں اور ترکیبوں کی چستی کا خاص طور پر خیال کرنا پڑتا ہے. شاعر کو اپنی بلند خیالی اور نازک خیالی کے ظاہر کرنے کا موقعہ جس قدر اس صنف میں ملتا ہے دیگر اصناف سخن میں نہیں ملتا.

شعر حقیقی معنوں میں شعر اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب محاکات اور تخیل دونوں بہتر ہوں جس طرح ایک شاعر کی قابلیت بلندی خیال سے ظاہر ہوتی ہے اسی طرح انداز بیان کی خوبی، طرز ادا کی دلفریبی نیز اس تخیل کے اعتبار سے موزوں اور مناسب زبان برتنا بھی شاعر کے کمال کو ظاہر کرتا ہے. ایک شاعر کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے تخیل کے اظہار اور بیان کے لئے وہی الفاظ استعمال کرے اور وہی زبان برتے جو اس کے لئے موزوں ہو. اگر صرف تخیل بلند ہو اور زبان میں یہ قدرت نہ ہو کہ اس مضمون عالی کی متحمل ہو یا زبان مغلق اور تخیل عامیانہ ہو تو شعر میں بجائے خوبی کے عیب اور نقص رہے گا. اور یہ چیز شاعر کے کمال شاعری کی منافی

ہوگی۔ شاعر کو ان دونوں امور کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ غزل اور مثنوی کی زبان سلیس اور رواں ہوتی ہے۔ اُس میں اغلاق اور دشواریٔ زبان غیر مستحسن قرار دی گئی ہے۔ اس لئے شاعر اپنے خیالات کو اسی قدر پرواز دے سکتا ہے جس کی حامل یہ سلیس اور رواں زبان ہوسکتی ہے۔ وہ صورت اختیار کرنی پڑتی ہے کہ جس میں تخیل بھی سوقیانہ نہ ہونے پائے اور سلاست اور روانی کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ برخلاف قصیدے کے۔ اس میں شاعر کو اپنے خیالات کی بلند پروازی دکھانے کا پورا پورا موقعہ ملتا ہے۔ شاندار سے شاندار الفاظ لانے کا شاعر مجاز ہوتا ہے۔ اور زبان کو دقیق بنانے کا اُس کو اختیار رہتا ہے۔ معمولی استعداد والا شخص یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ قصیدہ گوئی کی جانب متوجہ ہو اور اُس کے جملہ شرائط اور لوازمات کی تکمیل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک قصیدہ کی شہنشاہی بہت کم لوگوں کو میسر آئی۔ معدودے چند ہستیاں ایسی گذری ہیں جنھیں اس میدان میں اپنے زورِ طبع کے دکھانے اور خیالات کو جولانی دینے کا موقعہ ملا۔ مومن کا شمار بھی اِن معدودے چند ہستیوں میں ہے۔

عام طور پر قصیدے میں یا کسی کی مدح کی جاتی ہے یا ذم۔ اور قصیدہ گوئی کا مقصد بھی یہی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ کا میدان اِس قدر تنگ نہیں ہے۔ اِسے اور وسعت دی جاسکتی ہے۔ حمد ونعت اور منقبت کے موقعہ پر بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اس کے ذریعہ معاش ومعاد کی تعلیم بھی دی جاسکتی ہے۔ قصیدہ گوئی کو کسب معاش کا سبب

اور انعام واکرام حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا شاعر کی تنگ نظری اور پست حوصلگی کی دلیل ہے۔ قصیدہ کو بے جا خوشامد سے بھر دینا خود دار شاعر کا شیوہ نہیں کسی خاص متنفس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُس کو اُس کے اصلی مرتبے سے بالاتر اور برتر کر دینا یا کسی کی تذلیل و تحقیر کے لئے اُس کو اس کے اصلی درجے سے گرا کر قعر مذلت میں ڈال دینا قصیدہ گوئی کا مقصد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن افسوس شعراء نے زیادہ تر انھیں مواقع کو اس کا مصرف گردانا۔

ادب اردو میں مومن سے زیادہ سودا اور ذوق کے قصائد کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اور دونوں کو قصیدہ گوئی کا امام کہا جاتا ہے لیکن ان دونوں کے قصائد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قصائد سے اکثر یہی کام لیا ہے۔ بخلاف اس کے مومن کے قصائد میں فضول خوشامد اور بے جا چاپلوسی نہ ملے گی۔ قصائد کسی کی ہجو کا پہلو نہ لئے ہوں گے۔ اُن کے قصائد میں حمد ہو گی یا نعت و منقبت۔ دو قصائد امرار کی شان میں بھی لکھے ہیں۔ لیکن اُن میں خوشامد اور چاپلوسی کا عنصر غالب نہ ملے گا۔

مومن مدح گری کو گداگری سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنا زور طبع کسی رئیس کی مدح میں نہیں صرف کیا کسی صلے کی خواہش یا انعام کی امید پر کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ کل نو قصیدے لکھے ہیں۔ ایک حمد میں ہے اور ایک نعت میں ہے۔ چار قصیدے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی منقبت میں اور ایک قصیدہ سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی منقبت میں لکھا ہے۔ ایک قصیدہ

نواب محمد وزیر خاں والیٔ ریاست ٹونک کی شان میں اور ایک قصیدہ راجہ جیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کی شان میں لکھا۔ لیکن ان دونوں قصائد کے متعلق یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ محض روغن قاز ملنے اور انعام واکرام حاصل کرنے کی غرض سے لکھے گئے۔ نواب محمد وزیر خاں کے پاس جو قصیدہ بھیجا وہ محض معذرت کے طور پر تھا۔ اور راجہ اجیت سنگھ کی شان میں جو قصیدہ لکھا وہ محض اعتراف احسان کے طور پر۔ کیونکہ راجہ صاحب مومن کے محسن تھے۔ مومن کی شہرت سُن کر خود راجہ صاحب نے انھیں بلایا تھا اور رخصت کے وقت ہتھنی کسوا کر اُنھیں اُس پر بٹھا کر عزت اور شان کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ اِن دونو قصیدوں کے علاوہ انھوں نے عمر بھر کسی رئیس کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ اس میں شک نہیں کہ مومن کے قصائد بہت کم ہیں مگر جس قدر بھی ہیں ادب اُردو کے لئے سرمایہ ناز ہیں۔ اُن میں علاوہ قصیدہ کے عام محاسن کے ایسی ایسی جزئی اور امتیازی خوبیاں موجود ہیں جن کے تنہا مالک مومن تھے۔

اساتذہ نے قصیدہ کی تقسیم چار حصوں میں کی ہے تشبیب۔ گریز۔ مُدعا۔ خاتمہ۔ اور اُن میں سے ہر ایک کے لئے مختلف محاسن اور معائب قرار دیئے ہیں۔ اُن کا خیال رکھنا قصیدہ گو کے لئے بہت ضروری ہے۔ مثلاً تشبیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کے اشعار کی تعداد زیادہ نہ ہو اشعار طرب انگیز اور ولولہ خیز ہوں جن کو سن کر طبیعت میں سرور و انبساط پیدا ہو تاکہ بعد میں آنے والے اشعار کا اثر قلب پر اچھی طرح ہو۔ یہ اشعار بہاریہ بھی

ہو سکتے ہیں اور عاشقانہ بھی۔ لیکن ان کا رنگ بالکل غزل کا جیسا نہ ہونا چاہیئے
خصوصاً جب قصیدہ کسی مقدس ہستی کی شان میں لکھا جائے۔ اس وقت عاشقانہ
اور رندانہ اشعار سے تعظیماً احتراز کرنا چاہیئے۔ تشبیب کے بعد گریز کا موقعہ
آتا ہے یعنی عاشقانہ اور بہاریہ اشعار کہتے کہتے شاعر اصلی مدعا کی طرف
رجوع ہوتا ہے۔ دونو غیر مربوط مضامین ہوتے ہیں۔ اب شاعر کا کمال
یہ ہے کہ بلطائف الحیل دونو میں ایسا ربط اور اتصال پیدا کرے کہ پیوند
کی بدنمائی ظاہر نہ ہو۔ دونو میں گہرا تعلق اور لگاؤ نظر آئے۔ گریز کے بعد
مدعا کا نمبر ہے۔ قصیدہ کی بنیاد اگر مدح اور منقبت پر ہو تو حفظ مراتب کا
خیال رکھنا، خصوصی اور امتیازی اوصاف کا ذکر کرنا شاعر کے لئے
ضروری ہے۔ مثلاً سلاطین کے لئے عدل وانصاف جیسے اوصاف کا
لانا، وزراء کے لئے بلاغت اور ذہانت کا ظاہر کرنا، قضاۃ کے لئے انصاف
ورحم وغیرہ کا ذکر کرنا سپہ سالاروں کی شان میں شجاعت وطاقت وغیرہ
کا بیان کرنا، انبیاء واولیاء کے لئے عصمت وعفت اعجاز وکرامت وغیرہ کا
لانا غرض ہر ایک کے لئے اُس کے حالات سے مناسب اوصاف کا
بیان ضروری ہے۔

اوصاف بیان کرتے وقت شاعر کو غیر معمولی مبالغہ سے کام نہ لینا
چاہیئے۔ خاتمہ پر اپنی ذاتی اغراض ومقاصد کا ذکر نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ دعائیہ
اشعار پر قصیدہ کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اگر قصیدہ کی بنیاد فضائل ومناقب کے
سلب پر قائم کی جائے جس کو بالفاظ دیگر ہجو کہا جاسکتا ہے تو ان میں بھی چند

امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً اختلاف مراتب کا خیال رکھنا، ہمیشہ سچ اور اصلی عیوب کا ذکر کرنا، شریف اور بلند مرتبہ اشخاص کے لئے تصریح کے بجائے تعریض سے کام لینا، بیان کا مہذب بنانا فحش اور لغو سے اجتناب کرنا، تعداد اشعار کم رکھنا وغیرہ وغیرہ زبان کے اعتبار سے بھی قصیدہ میں علاوہ اصناف سخن کے عام محاسن کے چند امور کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اور اُن کا التزام قصیدہ گو کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ قصیدے میں الفاظ با وقار اور شاندار ہونے چاہئیں انداز بیان میں وضاحت اور متانت ہونی چاہئے۔ پختگی اور روانی ہونی چاہئے۔ علوئے مضامین اور بلند پروازی موجود ہونی چاہئے۔ بندشیں اور ترکیبیں چست ہونا چاہئے استعارات اور تشبیہات میں ندرت ہونی چاہئے۔ قصائد مومن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں تقریبًا تمام محاسن موجود ہیں بلکہ بعض ایسی خوبیاں ہیں جن کو اُن کی امتیازی خصوصیات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ علمی اصطلاحات کو لاکر قصیدہ کی شان شکوہ کے دوبالا کردینے میں جس قدر کمال مومن کو حاصل تھا دوسرے کو حاصل نہ تھا۔ عربی الفاظ اور عبارات کو جس حُسن و خوبی سے مومن استعمال کرتے تھے اور کوئی مشکل ہی سے استعمال کرسکتا تھا۔ قصائد میں تعلی سے کام لینا مومن ہی کا حق تھا۔ تلمیحات کی جو کثرت ان کے یہاں نظر آئے گی دوسری جگہ شاید ہی نظر آئے تشبیب میں جو انوکھا پن مومن پیدا کرتے تھے دوسرے مشکل سے پیدا کر سکتے تھے۔ البتہ مومن کے قصائد میں جو نقص نکل سکتا ہے وہ یہ ہے

کہ گریز نسبتاً کمزور ضرور ہے حقیقت یہ ہے کہ مومن کے قصائد کی بلندی ان کی علمیت اور زور طبیعت کی دلیل ہے۔ اُن کے قصائد نہ صرف ان کے معاصرین کے ہم پایہ ہیں بلکہ اغلاق میں اُن کے قصائد کو اگر قصائد خاقانی سے تشبیہ دی جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ روانی اور پختگی میں ان کے قصائد کو سلمان ساوجی کے قصائد کا جیسا کہا جائے تو کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ زور اور شکوہ میں ان کے قصائد کو عرفی کے قصائد سے نسبت دی جائے تو غلط نہ ہوگا۔

متقدمین میں سودا کو مومن پر شرف حاصل ہے مگر اولیت کا۔ متاخرین میں ذوق کا درجہ مومن سے ارفع ہے مگر صرف روانی اور پختگی میں مومن کو بہ حیثیت مجموعی ان دونوں کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ثبوت کے لئے قصائد مومن سے مختلف اشعار نقل کئے جاتے ہیں، جس سے ناظرین کو حسن و قبح کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا اور یہ بھی معلوم ہوجائیگا کہ قصائد میں ان کا کیا مرتبہ ہے۔

تشبیب

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس
کہ جیسے صبح شب ہجر نالہائے خروس

نوائے طوطی شکرفشاں کی لذت سے
سماع و رقص میں اہل مذاق جوں طاؤس[۱]

غبار صحن کیمیائے عیش و نشاط
بہار لالہ و گل سیمیائے[۲] عرض شموس[۳]

ہجوم سبزہ نے کی بسکہ رنگ آمیزی
زمیں پہ چادر مہتاب بن گئی ہے سندوس[۴]

۱؎ شعبدہ بازی۔ ۲؎ پیش کرنا ۳؎ جمع شمس بمعنی سورج۔ ۴؎ سبز چادر۔

زہے فریب صفا خاک بیز ہے گل چیں — پڑے جو وسعت گلزار میں گلوں کے عکوس
ہوا سے بسکہ گل شمع بھی ہے عطر آگیں — عدیل طبلۂ عطار بن گئے فانوس
ہوائے جنبش اوراق سے ہیں عطر فروش — لعات[1] ورد کہ ہیں ثبت صفحۂ قاموس[2]

گریز

غریق آب خجالت ہوا کے فیض ہی ہوں — کہ گل ہوا ہے میرا غنچہ دل مایوس
ہوا ہے کونسی ایسی مگر مدینے کی — دم مسیح کو ہی جس کی حسرت پابوس
شرف مدینے کو جس سے ہی ہو نہ ہو وہ ہے — جسے بتاتے ہیں محبوب حضرت قدوس

مدعا

وہ کون احمد مرسل شفیع ہر دو سرا — جو خلق کا سبب اور باعث معاد نفوس
جہاں مطاع شہنشاہ آفتاب نشاں — فلک سریر قمر طلعت و ملک ناموس
کرم میں دوں اُسے نیساں سے کس طرح تشبیہ — کروں میں جان کے کیونکر ترقی معکوس
ہمیشہ عفو تیرا طالب گنہگاراں — ہمیشہ رحم تیرا دردمند کا جاسوس
تیری غلامی کی دولت سے خاک پائے بلال — سفیدۂ رخ فغفور چین و خسرو روس
خمیدہ کس لئے نہ آسماں بنے تھے بھلا — نہ تھا ازل سے جو مد نظر تیرا پابوس

خاتمہ

خدا کے واسطے گرم دعا ہو بس مومن — کہ منتظر ہے ازل سے اجابت قدوس

---

[1] گل سرخ۔ [2] لغت کی ایک کتاب ہے۔

ہے جب تلک گل و برِ قیمت نہال و شجر | ہو جب تلک دلِ لالہ میں داغ حسرت بوس
مدام پھولے پھلے دوستوں کا نخل مراد | رہیں داغ عدو کا رہے دلِ مایوس

متذکرہ بالا قصیدہ نعتیہ ہے۔ اب مدحیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ والیٔ ریاست ٹونک کی شان میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

مدح

اے فلک دل کو داغ کرتی ہے | زر خورشید کی درخشانی
جانِ مومن پہ گونہ گونہ ستم | کافرا اتنی بھی نامسلمانی
تجھے معلوم ہے کہ ہے وہ کون | کھول دوں تجھ پہ رازِ پنہانی
مدح خواں شہ وزیر لقب | ختم جس پر ہوئی سخندانی
پایہ سنج کمالِ اہل کمال | فارق قلزمی و عمانی
کیا کہوں اس کے دستِ ہمت کی | ہیں گہر باری و درافشانی
کردے سارے جہاں کو سیراب | بحر ہمت کی اس کے طغیانی
بے سخاوت اسے قرار کہاں | کہ ہے عادت طبیعت ثانی
گرگ نے دورِ عدل میں اس کے | سیکھ لی راہ و رسم چوپانی
خنجر جاں شگاف ہیں اُس کے | ابروئے یار کی سی برانی
اے سخن سنج نکتہ داں تیری | کس زباں سے کروں ثناخوانی
مجھ سے ناکس کی ہمنشینی کا | تجھ سے داور کو شوق پنہانی

ملہ شدتِ غم۔

بعد یک چند گر خدا چاہے	میں ہوں اور تیرے در کی دربانی

وقار الفاظ راجہ اجیت سنگھ کی شان میں کہتے ہیں۔

اس کے اویم حشمت و مائدہ جلال پر | خستہ ذباب کی طنین طنطنہ سکندری
جوش طراوت مشام وجہ عطاس عزوجاہ | لطف نسیم مشک بیز خلق شمیم عنبری
اطلس چرخ زیر گرد جوش ہوائے رشک سے | آتش سینہ نجوم خجلت آب پیکری

انداز بیان کی متانت اور شکوہ

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

اے مسیحا دم رواں پرور | زندگی بخش دین پیغمبر
مسند آرائے محفل تقدیس | اولیں جانشین پیغمبر
ذرۂ خاک در کی تابش سے | جل گیا مہر آتشیں پیکر
تو وہ سلطاں کہ بارگہ کا تیری | پست کا شانہ ہے فلک منظر

پختگی اور زور

یہ اسی قصیدہ کے اشعار ہیں جو راجہ اجیت سنگھ کی شان میں لکھا گیا ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری | کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری
چشم ستارہ سحر لون زحل سے سرمہ سا | دشنہ ترک چرخ سے تیز نگاہ مشتری
خط بیاض صبح وہ شعلہ دم اژدر سفید | عکس سے جس کے آب ہو آئینہ سکندری
صبح کی جیب بہار ہو ساقی غنچہ لب ہو پاس | مے سے عذار لالہ رنگ لب سے مذاق شکری

بلند پروازی

یہ اشعار بھی متذکرہ بالا قصیدہ کے ہیں۔

غم نہ سما سکا مرا بسکہ جہان تنگ میں — چرخ میں یہ محدبی آگئی از مقعری
وہم بردن شدن خیال قید سے چھوٹنا محال — یاں سے گریز کیا مجال بندگراں یہ بیدری
چھوٹ گئے تو راہ بند جائے بجائے لامکاں — کوئی عجب طلسم ہو گنبد چرخ چنبری
نالہ سے میرے گرم وخشک زہرۂ ماہ کا مزاج — گریہ سے میرے مرتر طبع بروج آذری

بندشوں اور ترکیبوں کی چستی

یہ قصیدہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے۔

وہ شوخ برق عنا خاک میں ملا دیوے — اگر ہو حسرت دنبالہ گردئی محمل
امام اہل یقین شہریار کشور عدل — امین لشکر دیں ومبارز مقتل
وہ شمع انجمن ناز ہائے حوصلہ سوز — جو سمجھے خواری مشتاق رونق محفل
شہ سریر خلافت مہ سپہر کمال — محیط ابر نوال وسحاب دریا دل

تشبیہات واستعارات کی ندرت

یہ قصیدہ سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے۔

دیکھتا ہے تیرے ابرو کی طرف یوں عید مہ — جس طرح سوے ہلال رمضان بادہ گسار
دست یاقوت فشاں دھوئے لب جو وہ اگر — کوہ شیلان[1] بنے خاک قضائے گلزار

---

[1] ایک پہاڑ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں سے یاقوت بہت نکلتا ہے۔ اسے شیلان بھی کہتے ہیں۔

اس کی تلوار کی آہن کا گر آئینہ بنے
زرد تر چہرۂ عاشق سے ہو رنگ رخ یاؔ

راکب جزم تیرا ناقہ صالح نہ رہاں
رائض عزم ترا دوش ملائک پہ سوا

اصطلاحات علمیہ

یہ قصیدہ بھی نعتیہ ہے۔

مزاج دہر میں یہ اعتدال آیا ہے
کہ جس نبات کو دیکھو وہ صالح الکیموس

عجب نہیں کہ بباں مگس عسل اُگلے
گر اندنوں ہو کوئی مبتلائے ایلاؤس[1]

بعید کچھ نہیں شادابی زمانہ سے
زیادہ تر کرے سیلان خون گل شاموس[2]

یقین کہ زہرہ وخورشید میں مقابلہ ہو
پڑھوں جو میں پے دوری بدر لیطوس[3]

عربی الفاظ وعبارات

قصیدہ حمد باری عزاسمہ میں ہے۔

الحمد لواہب العطایا
اس شور نے کیا مزا چکھایا

الشکر لصانع البریہ
جس نے ہمیں آدمی بنایا

لاعلم لنا ہے یاد ہر چند
سب کچھ مجھے عجز نے بھلایا

اللہ دکھاوے اپنا دیدار
اِکشِفُ بجمالک الغطایا

تعلی

یہ اس قصیدے کے اشعار ہیں جو والی ریاست ٹونک کی شان میں لکھا ہے

وہ خردمند ہوں کہے ہے جسے
عقل اول حکیم لاثانی

---

[1] ایک مرض ہے جس میں براز ذریعہ قے خارج ہوتا ہے۔ [2] سنگ جراحت۔ [3] ایک عا ہے جو دو شخصوں میں جدائی کے لئے پڑھی جاتی ہے اور اصطلاح نجوم میں دو ستاروں کے درمیان چھ بروج کے فاصلے کو کہتے ہیں۔

ہوں وہ نباض جس کے ناخن ہیں — حرکات عروق شریانی
سامنے میری تیز زبانی کے — نطق الکن حدیث سحبانی
میرے ربط کلام کو پہنچے — نثر سعدی نہ نظم سلمانی
انوری کے بیان میں ہی کہاں — میری تقریر کی تابانی
میری قسمت سے خاک ہند کو ہے — رونق سرمہ صفاہانی

تلمیحات

یہ قصیدہ سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے۔

پاکدامن ہو تو بدگو کے نہ دم میں آنا — سنتے ہیں لوط کے مہمان کہیں افتاے سدوم[1]
پاکبازی کی طمع ہم سے گنہگاروں سے — کیا ہوئے عشق میں اے زہرہ جبیں وہ معصوم[2]
سبزہ زندگی نے تیری قتل کیا ہے ظالم — یاد آتا ہے مجھے حال امام مسموم[3]
مدد غیب پہ کی لشکر مغلوب سے صلح — کہ مسلمان نہ ہوں معتقد طالع شوم[4]

[1] قوم لوط کا قاضی تھا۔ اشارہ ہے اس واقعہ کی جانب جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت لوط کے یہاں دو فرشتے بصورت انسان آئے۔ ان کی قوم نے ایذا رسانی کا قصد کیا جس کی وجہ سے اس قوم پر عذاب خداوندی نازل ہوا۔ [2] مراد ہاروت و ماروت ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ زہرہ پر عاشق تھے۔ [3] اشارہ ہے شہادت حضرت امام حسن رض کی طرف۔

[4] اشارہ ہے اس واقعہ کی جانب جبکہ ۴۱ھ میں سیدنا حضرت امام حسن رض نے بنو امیہ سے صلح کی تھی اور خلافت سے دست بردار ہوئے تھے۔

یادِ اقبال

از

جناب مولوی ولی محمد خانصاحب مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے — خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں — موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

"میں موت سے نہیں ڈرتا میں ایک مسلمان ہوں اور خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتا ہوں" یہ ہیں آخری الفاظ اس مفکر اعظم کے جس نے دنیائے شاعری و فلسفہ میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح اپنی پوری قیامت خیزیوں کے ساتھ نمودار ہوئی جبکہ علامہ سر محمد اقبال اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ دنیائے علم و ادب مدتوں اس ناقابل تلافی نقصان پر روتی رہے گی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۸۷۷ء کا مبارک سال تھا جبکہ علامہ اقبال منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ کون جانتا تھا کہ سیالکوٹ کی مٹی سے بنا ہوا یہ انسان اپنے فلسفیانہ عظمت و جبروت سے تمام عالم میں تہلکہ مچا دے گا کسے خبر تھی کہ اقبال کے بھیس میں قدسیوں اور روحانیوں کے ہاتھ کارفرما ہوں گے۔ کیا معلوم تھا کہ قدرت اس بچہ سے "بانگ درا" کا کام لے گی اور دور ماندہ و خود فراموش "اہل قافلہ" کو یہ مجسمہ خلوص و

صداقت ہلا ہلا کر بیدار کرے گا۔

ابتدائی تعلیم مقامی کالج میں ختم کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی تکمیل لاہور میں کی جاتی ہے۔ طبیعت کو فلسفہ اور ادب سے غیر معمولی مناسبت تھی۔ انگریزی اور عربی (بی۔ اے) میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ ام۔ اے، میں فلسفہ لیا اور اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے۔ تمغے ملے۔ انعامات ملے۔ وظائف ملے۔ لیکن ابھی طبیعت مطمئن نہ ہو سکی۔ حصول علم کی آگ روز بروز بھڑکتی گئی۔ طبیعت مسلسل ھل من مزید کی صدائیں بلند کرتی تھی۔ خدا کی قدرت اس وارفتۂ شاہد حقیقت کو اساتذہ بھی ایسے ملے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کارساز حقیقی نے انھیں صرف علامہ اقبال کی تعلیم و تربیت کے لئے پیدا کیا تھا۔ علامہ جلیل القدر مولٰنا میر حسن المتوفی بہ ۱۹۲۹ء نے اپنے اس ہونہار شاگرد میں صحیح علمی و ادبی مذاق پیدا کر دیا۔ فلسفہ کی سنگلاخ گھاٹیوں میں پروفیسر آرنلڈ نے رہبری کی شعر و شاعری کی دلکش وادیوں میں داغ مرحوم نے ہمنوائی کی۔ طبیعت میں بلا کی ہمہ گیری تھی جس سمت قدم اُٹھایا کامیاب نکل آئے۔

ام۔ اے کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں فلسفہ اور سیاست مدن کے لکچرر مقرر ہوئے بعدہ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہ نیک، سعادت مند، ذہین اور محنتی طالب علم اب ایک شفیق، بے تکلف اور مہربان استاد کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اسی زمانہ میں اردو زبان میں ایک کتاب علم الاقتصاد سیاست مدن پر لکھی۔

فطری تحقیق و تجسس نے نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ آخر کار شراب حقیقت کے اس بلانوش نے ۱۹۰۵ء میں مغربی میخانوں پر دھاوا بول دیا۔ کیمرج میں فلسفہ کی ڈگری، جرمنی میں ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی امتیازی ڈگری اور لندن میں بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ تک قائم مقام پروفیسر عربی رہے ۱۹۰۸ء میں وطن واپس ہوئے تو یہ کہتے ہوئے۔

قدح خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر نہ دارد

وطن واپس ہونے کے بعد آپ کا معاشی مشغلہ بیرسٹری رہا۔ لیکن ملک و ملت کی خدمت سے کبھی غافل نہ رہے ۱۹۲۲ء میں آپ کی علمی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے گورنمنٹ نے آپ کو "سر" کا خطاب دیا۔

اخلاق

اقبال ایک زبردست محب وطن اور متبحر عالم تھے۔ اعتقادات کے لحاظ سے پکے مسلمان اور باخبر صوفی۔ اولیا کرام و بزرگان دین سے خاص عقیدت تھی۔ طبیعت میں انتہائی سادگی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے سے اسی خلوص سے ملتے اور اُس کے حسب قابلیت گفتگو کرتے۔ بلا کے خود دار تھے۔ دنیوی دولت و عظمت کی خاطر کسی آستانہ پر کبھی ناصیہ فرسائی نہیں کی۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے۔ دنیوی نام و نمود اور جاہ و جلال سے کوسوں دور تھے۔ "کہ عنقا را بلند است آشیانہ" کے مصداق نظریں ان ناسوتی مناظر سے پرے بہت دور تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کی دوامی شہرت کا باعث ان کی شاعری ان کی تصنیفات اور وہ پیامات ہیں جس کا اعلان

وہ ہمیشہ ملک و ملت کے سامنے کرتے رہے۔

اقبال کی شاعری اقبال کی شاعری کا پہلا دور ان کی وطن پرستی کو منعکس کرتا ہے۔ اس دور کی نظموں میں نالۂ یتیم، تصویر درد، ہمالہ فریاد اُمت اور دوسری قومی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں وہ ایک وطن پرست شاعر کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ "وطنیت" کے سامنے اختلاف مذہب کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ اتحاد و یگانگت کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اپنے درد آگین راگوں سے بچہ بچہ کے دل میں وطن کی محبت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد جنگ بلقان کے ہیبت ناک نتائج، مسلمانوں کی ہولناک پریشانیاں۔ اسلام کی عام دردناک حالت سے ان کی مذہبی جذبات کو ہیجان میں لاتی ہے۔ اب یہ خاص طور پر مسلمان کو مخاطب کرتے ہیں۔ اس کی عظمت رفتہ کو یاد دلاتے ہیں۔ اسلاف کے کارنامے سنا کر گرماتے ہیں۔ موجودہ پستیوں کو بیان کرکے دلوں کو برماتے ہیں۔ توحید کے گیت گائے جاتے ہیں رسول اکرم کی مقدس تعلیم کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ سرفروشانِ اسلام کی زندگیوں کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں اور اپنی پوری قوت اس شیر خفتہ کو بیدار کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ شکوہ و جواب شکوہ، خضرِ راہ، شمع و شاعر، طلوع اسلام۔ خطاب بہ مسلم۔ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

وہ دنیا دار مذہبی پیشواؤں کی ریا پسندی سے اظہار نفرت کرتے ہوئے دنیائے عشق و محبت میں گم ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب!

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب!

اقبال کی تعلیم و فلسفہ زندگی

اقبال کے نزدیک زندگی ایک حرکتِ مسلسل کا نام ہے۔ جمود اور قنوطیت ان کے نزدیک موت کے مترادف ہیں۔ طلبا ر علیگڑھ کالج سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں۔

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

اپنی معرکۃ الآرا نظم "خضر راہ" میں فرماتے ہیں۔

تو اسے پیمانۂ امروز فردا سے نہ ناپ جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

ہمیشہ خود اعتمادی۔ بلند خیالی اور عالی ہمتی کی تعلیم دیتے ہیں۔ رجائیت ایک ایک شعر سے ٹپکتی ہے اور پورا کلام آیۂ لا تقنطوا کی تفسیر نظر آتا ہے۔

کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار | ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا | خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے | کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم | جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے | دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے | یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر | از نبی تعلیم لا تحزن بگیر
زندگی را یاس خواب آور بود | ایں دلیلِ سستیٔ عنصر بود

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

اس ملہم باللہ شاعر کا ایک ایک شعر جذبات و معانی کا مخزن ہے۔ کلام کے اثر کا یہ عالم ہے کہ انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں اقبال اپنی نظم پڑھتے سامعین کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا۔

"گیسوئے اردو" کو "منت پذیر شانہ" دیکھ کر اقبال نے فارسی زبان کو اپنے خیالات و حسیات کی ترجمانی کے لئے منتخب کیا۔ اس زبان میں ایسے

ایسے جواہر ریزے اور نکات بیان کئے ہیں کہ جگہ جگہ مولنا روم کی روح رقص کناں نظر آتی ہے۔

اقبال کی تصنیفات

(۱) بانگ درا۔ اردو نظموں کا مجموعہ ہے جس میں علاوہ قومی نظموں کے انگریزی طرز پہ لکھی ہوئی نیچرل نظمیں موجود ہیں۔ اور اس میں اقبال اثر فلسفہ اور حب لوطنی میں غالب اور حالی کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) بال جبریل۔ اردو کلام کا دوسرا مجموعہ جس میں صوفیانہ رنگ غالب ہے۔

(۳) ضرب کلیم۔ اس کو بال جبریل کا تتمہ کہا جائے تو بجا ہے۔ اردو کلام کا یہ آخری مجموعہ ہے جس میں صوفیانہ۔ معاشرتی اور ادبی اور سیاسی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

(۴) فلسفہ عجم۔ (۵) اسرار خودی۔ مشہور مثنوی کا موضوع (Theme) فلسفہ خودی ہے۔ (۶) رموز بیخودی (۷) پیام مشرق۔ المانی شاعر گوئٹے کے پیام مغرب کے جواب میں پیش کی گئی۔

غرض کہ ہر تصنیف بجائے خود الہام کی حیثیت رکھتی ہے اور بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے کس حد تک اقبال کو سمجھا ہے اور کہاں تک اس کی تعلیم پر عمل کر رہے ہیں۔ شاعر تو اپنا فرض ادا کر چکا۔ نہایت خوش اسلوبی سے اس نے اپنے وظیفۂ زندگی (Function of Life) کی

تکمیل کی اور فنا کی پراسرار منزل میں گم ہوگیا۔ لیکن کیا ہمارا کام صرف اسکی موت پر رونا اور مرثیہ خوانی کرنا ہے۔ اقبال تو یہ کہتا ہوا رخصت ہوگیا کہ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

لیکن ہمیں کیا کرنا ہے کبھی اس پر بھی کچھ غور کیا جائے گا ؟

فہرست جلسہ تقسیم انعامات بابت ۴۶ـ ف

انٹر جونیر

۱۔ وشنو پت
ا۔ شعبۂ سائنس میں اول رہے۔
ب۔ کیمیا میں اول رہے (نشانات مساوی نشانات کرشن شاستری)
ج۔ طبیعیات ؍؍

۲۔ محمد علی خاں بھوپالی
ا۔ شعبۂ فنون میں اول رہے۔
ب۔ فارسی ؍؍ ؍؍
ج۔ دینیات میں اول رہے (نشانات مساوی اقبال پاشا)
د۔ بہترین مقرر اقامت خانہ کلیہ۔

۳۔ گووندر اؤ این
ا۔ ریاضی میں اول رہے۔
ب۔ جان بھگتل انگلش میڈل

۴۔ رام کرشن شاستری کیمیا میں اول رہے (نشانات مساوی وشنو پت)

۵۔ عوض بن محمد
ا۔ عربی میں اول رہے۔
ب۔ جنرل مانیٹر اقامت خانہ کلیہ۔

۶۔ محمد اکرام الدین اُردو میں اول رہے۔

۷۔ عاقل علی خاں
ا۔ تاریخ ہند میں اول رہے
ب۔ تاریخ انگلستان میں اول رہے۔

۸۔ عبدالرزاق موسیٰ معاشیات میں اول رہے۔

۹۔ اقبال پاشا دینیات " دنشانات مساوی محمد علی خاں)

۱۰۔ رگھوناتھ مادھوراؤیم اخلاقیات "

۱۱۔ رام گوپال سنسکرت "

۱۲۔ نیلکنٹھ ریاضی "

۱۳۔ کتمارام مانیٹر ہندو اقامت خانہ

۱۴۔ محمد نصیرالدین گیمس کپتان اقامت خانہ کلیہ

طبقہ فوقانیہ

۱۔ سرینواس کے
- ا۔ جماعت میں اول رہے
- ب۔ انگریزی "
- ج۔ تاریخ "
- د۔ ریاضی اختیاری "
- ہ مولوی عبدالحق مڈل میٹریکولیشن میں اول کے لئے

۲۔ محمد صادق بدیع الدین
- ا۔ جامعہ سائنس میں اول رہے۔
- ب۔ اردو میں اول رہے۔
- ج۔ شرف الدین سائنس مڈل

۳۔ عبداللہ بھائی عربی میں اول رہے۔

۴۔ ایوب احمد کرمانی
- ا۔ فارسی میں اول
- ب۔ طیب کرکٹ کپ
- ج۔ کاما کرکٹ مڈل

۵۔ اننت کاشی ناتھ
- ا۔ جامعہ میں سنسکرت میں اول رہے
- ب۔ دھرمپال سنسکرت مڈل

۶۔ فقیر چند — ریاضی میں اول رہے

۷۔ اختر عباس — دینیات ،،

۸۔ گووندراؤ ایس — اخلاقیات ،،

۹۔ مرزا اشرف علی بیگ — انگریزی میں ،،

۱۰۔ پربھکرویش پانڈے
- ا۔ مرہٹی ،،
- ب۔ دھاڑوار کر مرہٹی مڈل

جماعت نہم

۱۔	قاضی محمد جان	جماعت میں اول رہے۔	
۲۔	خواجہ عبدالفتاح	ابتدائی ریاضی میں اول رہے	
۳۔	ڈگمبرو امن	ابتدائی سائنس	،،
۴۔	سید اختر الزماں	تاریخ و جغرافیہ	،،
۵۔	میر محسن علی	دینیات ،،	،،
۶۔	رائے موہن پال سائے	اخلاقیات ،،	،،

۷۔ خلیل احمد { ا۔ انگریزی میں اول رہے / ب۔ تمغہ نیک سیرت

۸۔ ابو محمد سعید الدین اردو میں اول رہے۔

جماعت ہشتم

۱۔ عبدالحمید { ا۔ جماعت میں اول رہے / ب۔ اردو میں اول رہے

۲۔ گووند راؤ وامن انگریزی میں اول رہے

۳۔ رامچندر دیانند ریاضی ابتدائی میں اول رہے

۴۔ محمد عبدالہادی ابتدائی سائنس "

۵۔ وامن لکشمن تاریخ و جغرافیہ "

۶۔ غلام محی الدین دینیات "

۷۔ پرھلاد شنکر اخلاقیات میں رہے

۸۔ وحید الدین تمغہ نیک سیرت اقامت خانہ فوقانیہ

۹۔ عبدالعظیم انعام اقامت خانہ جامع مسجد۔

طبقہ ایچ۔ ایس۔ ایل۔ سی

جماعت دہم

۱۔ مرلی دھر [ا۔ جماعت میں اول رہے

	نام مذکور	ب۔ انگریزی میں اول رہے ج۔ ریاضی اختیاری "
۲۔	واشدیو سرینواس	ا۔ ریاضی ابتدائی " ب۔ رامچندر ریاضی مڈل
۳۔	منوہر نگیش	ا۔ ابتدائی ریاضی میں اول رہے ب۔ تاریخ و جغرافیہ "
۴۔	محبوب علی خاں	اردو ورناکیولر "
۵۔	اننت رینگڈاس	ا۔ مرہٹی " ب۔ کروے مڈل
۶۔	رشید احمد	عربی میں اول رہے
۷۔	عبدالرحیم	فارسی "
۸۔	راجارام ایم	ا۔ سنسکرت " ب۔ دھرمپال سنسکرت مڈل
۹۔	منوہر کے	اردو اختیاری میں اول رہے

جماعت نہم

۱۔	ترمبک راؤ	ا۔ جماعت میں اول رہے ب۔ ابتدائی ریاضی " ج۔ تمغہ نیک سیرت

۲۔ بشیر احمد	الف۔ انگریزی میں اول رہے۔	
	ب۔ تاریخ و جغرافیہ	؍؍
۳۔ گلزار سنگھ	ابتدائی ریاضی	؍؍
۴۔ ہنمنتھ ایس	اردو ورناکیولر	؍؍
۵۔ وامن ایس	مرہٹی ورناکیولر	؍؍

جماعت ہشتم

۱۔ واشدیو مکند راؤ	الف۔ جماعت میں اول رہے	
	ب۔ سائنس	؍؍
	ج۔ تاریخ و جغرافیہ	؍؍
۲۔ سدا سیو راؤ	ابتدائی ریاضی	؍؍
۳۔ خواجہ محی الدین	اردو ورناکیولر	؍؍
۴۔ کملاکر	مرہٹی ورناکیولر	؍؍
۵۔ گووندداس ایس	انگریزی میں اول رہے	

بہترین کھیل

۱۔ مرزا عبداللہ بیگ	ہاکی مڈل
۲۔ غلام احمد بنگالی	فٹ بال مڈل
۳۔ خواجہ مرزا حسن	کرکٹ مڈل

۴۔	افتخار احمد	والی بال ٹدل
۵۔	خواجہ معین الدین احمد	بہترین رضا کار اور کارکن
۶۔	صفی اللہ احمد	بہترین اسکاوٹ

طبقہ وسطانیہ

جماعت ہفتم

۱۔	رام راوٗ این	ا۔ ابتدائی ریاضی میں اول رہے ب۔ مرہٹی میں اول رہے
۲۔	محمد ضیاء الدین	ا۔ جنرل پروفشنسی ب۔ دینیات میں اول رہے
۳۔	عبدالوحید	ا۔ انگریزی میں اول رہے ب۔ اُردو ،،
۴۔	عبدالستار	تاریخ وجغرافیہ ،،
۵۔	سکھارام	اخلاقیات ،،

جماعت ششم

۱۔	سید عبداللہ	ا۔ جنرل پروفشنسی ب۔ تاریخ وجغرافیہ میں اول رہے ج۔ دینیات میں ،،

۲۔ موسیٰ خاں	ریاضی میں اول رہے
۳۔ امین اللہ	انگریزی "
۴۔ گنپت کے	مرہٹی "
۵۔ عبدالقادر	اُردو "
۶۔ ہری مہادیو	اخلاقیات "

جماعت پنجم

۱۔ رامچندر	۱۔ جنرل پروفشنسی ۲۔ ریاضی میں اول رہے۔
۲۔ علی محمد	دینیات "
۳۔ عبدالرزاق	انگریزی "
۴۔ فاروق علی	تاریخ وجغرافیہ "
۵۔ احمدالدین	اُردو "
۶۔ گووند	اخلاقیات "

جماعت چہارم

۱۔ شبیر علی	ا۔ جنرل پروفشنسی ب۔ ارتھمیٹک میں اول رہے
۲۔ منوہر	انگریزی "

۳۔ مقصود النبی { ا۔ اردو میں اول رہے / ب۔ دینیات " }

۴۔ دتاتریہ — مرہٹی "

۵۔ وسنتھ { ا۔ تاریخ وجغرافیہ " / ب۔ اخلاقیات " }

جماعت سوم

۱۔ سورج مل { ا۔ جنرل پروفشنسی / ب۔ تاریخ وجغرافیہ میں اول رہے۔ / ج۔ مرہٹی " }

۲۔ سروپ چند — انگریزی میں "

۳۔ کاشی ناتھ۔ — ارتھمیٹک "

۴۔ قیصر بھائی — اردو "

۵۔ امباداس — مرہٹی "

۶۔ عبدالکریم — دینیات "

۷۔ محمد بھائی۔ — اخلاقیات "

انعامات حمد ودعا خوانی

۱۔ عبدالرؤف — متعلم جماعت پنجم

۲۔ بھنوداس "

تمغہ جات باغبانی

۱۔ محمد سعید — صمد احمد تمغہ باغبانی

۲۔ سید جلال حسین — منظہر علی "

۳۔ اظہر حسین — " "

جلد ١٠ بابت امرداد ۔ شہریور ۔ مہر ۔ آبان سنہ ٤٧ ف نمبر ٤ و ٥

نورس

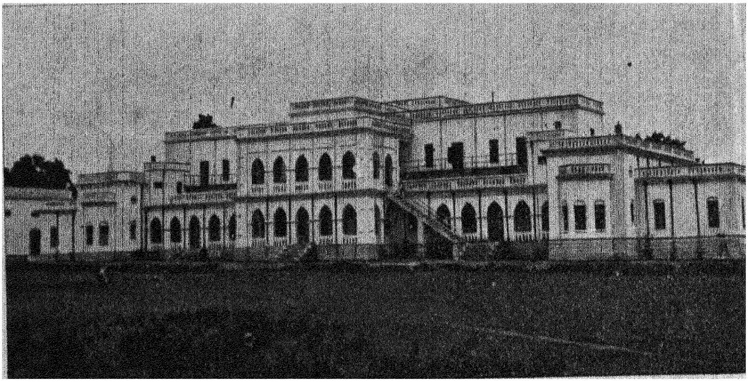

مجلس نورس

صدر :— جناب مولوی الحاج سید محی الدین صاحب، بی۔اے، بار ایٹ۔لا،
پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد .

نائب صدر و مدیر مسئول :— جناب مولوی غلام طیب صاحب، بی۔اے، ایل۔ٹی،
لکچرار اردو عثمانیہ کالج اورنگ آباد .

نمائندہ کالج و نائب مدیر :۔ مرزا متین احمد بیگ صاحب، متعلم سال دوم انٹرمیڈیٹ .

نمائندہ فوقانیہ :— صفی اللہ صاحب ، متعلم جماعت میٹرک .

فہرست مضامین

نشان سلسلہ	مضمون	نام مضمون نگار	نمبر صفحہ
(۱)	شذرات واخبار کلیہ	ادارت نورس	۱
(۲)	خطبہ تقسیم اسناد جامعہ ڈھاکہ	رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر	۱۸
(۳)	شکوۂ مزدور	محمد علی خاں صاحب متعلم فورتھ فارم	۳۱
(۴)	برکھا رت	جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب لکچرار تاریخ	۳۳
(۵)	غزل	جناب سید صادق صاحب سروش مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۴۴
(۶)	عورت کا درجہ ہندو سماج میں (ترجمہ)	محمد حامد صاحب متعلم سال اول	۴۵
(۷)	غزل	جناب مولوی عبد الرب صاحب کوکب	۴۹
(۸)	سر جگدیش چندر بوس آنجہانی	مسٹر گنپت رائے صاحب مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۵۰
(۹)	چاندنی رات	اختر الزماں صاحب ناصر متعلم سال اول	۵۷
(۱۰)	پیغام عمل	سید ایوب احمد صاحب کرمانی صدر انجمن اتحاد طلبا	۶۰
(۱۱)	غزل	محمد ہاشم صاحب محشر متعلم جماعت دہم الگزینڈرا ہائی اسکول [illegible]	۶۴
(۱۲)	آہ - اقبال	محمد باقر امام صاحب متعلم سال اول	۶۵
(۱۳)	ایک نوجوان درکار ہے	محبوب الٰہی خاں صاحب سحر متعلم سال اول	۶۶
(۱۴)	بلندی چاہتے ہو تو بلند خیال بنو	محمد قادر صاحب متعلم جماعت دہم	۶۸
(۱۵)	غزل	مرزا متین احمد بیگ صاحب سروش متعلم سال دوم نائب مدیر نورس	۷۱
(۱۶)	ڈورا (ترجمہ)	" " " " " " " "	۷۲
(۱۷)	آل انڈیا جوتا کانفرنس	توفیق محمد خاں صاحب متعلم سال دوم	۷۹
(۱۸)	رباعیات	محمد یوسف صاحب ناظم متعلم سال اول	۸۴
(۱۹)	نوحۂ غم	جناب مولوی مظہر الدین صاحب صدیقی مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد	۸۵
(۲۰)	کیمیا کی تاریخ	محمد عبد الحمید صاحب متعلم سال اول	۸۹
(۲۱)	انتظام قدرت	محبوب الٰہی خاں صاحب سحر متعلم سال اول	۹۶
(۲۲)	اردو کا پہلا ملک الشعرا	محمد اکرام الدین صاحب متعلم سال دوم	۱۰۰
(۲۳)	فضائل حضرت پیر دستگیر رحمۃ اللہ علیہ	جناب مولوی محمد ابو الحسن صاحب فاروقی ایم اے صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ میڈک	۱۰۷
(۲۴)	تاریخ ہند کا ایک ورق	بھاسکر راؤ صاحب دیشپانڈے متعلم سال دوم	۱۲۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

شذرات و اخبار کلیہ

سالگرہ ہمایونی

سلطنت آصفیہ کی درخشاں تاریخ کے سرسری مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس سلطنت کا قیام ایسے عہد میں ہوا جبکہ سارا ملک بد امنی اور انتشار کا آماجگاہ بنا ہوا تھا مغلیہ حکومت جس نے ایک عرصے تک اس ملک کی پاسبانی کی اور اس کے علوم و فنون کو بام عروج تک پہنچایا اپنی باری پوری کر چکی تھی دہلی میں گون گیرے امرا کا راج تھا۔ حضرت آصف جاہ اوّل نے جب دیکھا کہ یہ پرانی دیوار اڑواڑیں لگانے سے بھی کھڑی نہیں رہ سکتی تو دکن کی خود مختاری کا اعلان فرما کر اورنگ آباد میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ بنیاد خدمت خلق۔ دین داری۔ اور رواداری کے مسالے سے تیار کی گئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قیام کے بعد امتداد زمانے سے اس کے استحکام میں اضافہ ہوتا گیا۔ زمانہ بدلا۔ نئے نئے خیالات پھیلے۔ ہندوستان کی فضا بارہا مکدر ہوئی۔ بگڑی سنبھلی۔ لیکن اس سلطنت کی روایات میں فرق نہ آیا۔ آج بھی یہاں شانتی کا راج ہے۔ اور ہر مذہب و ملت کے پیرووں میں وہی اتحاد اور یکجہتی نظر آتی ہے۔ جو دور مغلیہ کا طرۂ امتیاز تھا۔

خانوادہ آصفی کے ہر شہریار نے خدمت خلق اور رعایا پروری کو اپنا مسلک بنایا۔ اور نازک موقعوں پر رعایا کی قیادت اور رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں رعایا اور آقا کے تعلقات خلوص اور عقیدت پر مبنی ہیں۔ زمانہ کی نیرنگیوں کا اثر ان پر نہیں ہوسکتا اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کی سالگرہ کا جشن اس ملک میں خاص مسرت وعقیدت سے منایا جاتا ہے۔ گزشتہ ۲۷ سال کا زمانہ حیدرآباد کا دورِ نشاط ہے جس میں اس ملک نے علوم و فنون، نظم و نسق اور رفاہی اصلاحات میں غیر معمولی ترقیاں کیں دورِ عثمانی کی آب و تاب نے ایک عالم کو ششدر کر دیا۔ اعلیٰ حضرت کی علم نوازی، پاکیزہ سیرت، قائدانہ تدبر اور رعایا پروری کی جھلکیاں حکومت کی ہر اسکیم میں نظر آتی ہیں۔ اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے فروغ ملک کے لئے جس اعلیٰ تدبر اور پیش بینی سے ہر موقع پر کام فرمایا وہ آپ اپنی مثال ہے۔

ہمارے آقائے ولی نعمت کا دورِ حکومت علمی ترقیوں کے لئے خاص طور پر نمایاں ہے تحصیل علم کے لئے جو آسانیاں حیدرآباد میں میسر ہیں وہ دوسری جگہ نہیں نظر آتیں۔ ہمارے کالج کے طلبا سالگرہ کا جشن خاص عقیدت سے مناتے ہیں۔

بروز شنبہ بتاریخ یکم رجب ۱۳۵۳ھ ہجری مطابق ۱۲ مہر ۱۳۴۴ف موافق ۲۷ اگست ۱۹۳۵ء بعد نماز عصر جملہ طلبا و اراکین اسٹاف کالج کے میدان میں جمع ہوئے۔ اسکاؤٹ ٹروپ نے پرچم آصفی کی سلامی دی۔ اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کی عمر و اقبال کی ترقی کے لئے دعائیں کی گئیں۔ طلبا میں شیرینی تقسیم ہوئی۔ شب میں چاروں اقامت خانوں کے طلبا اقامت خانہ فوقانیہ میں جمع ہوئے۔ مولوی شرف الدین صاحب مودب اقامت خانہ نے ایک تقریری مقابلہ مقرر کیا تھا۔ موضوع "اعلیٰ حضرت کا عہد ہمایوں" تھا۔ جلسہ جناب صدر صاحب کلیہ کی صدارت میں شروع ہوا۔ تقریری مقابلہ پرلطف رہا۔ توفیق محمد خاں صاحب اول اور مرزا منشی احمد بیگ صاحب دوم رہے۔ جناب صدر

نے برکات عثمانی پر ایک بلیغ تقریر فرمائی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر موسیقی ہوتی رہی آخر میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی سلامتی۔ درازی عمر اور ترقی اقبال کی دعا پر جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ یہ چوّنوی سالگرہ تھی۔ خدا کرے یہ جشن تادیر ہر سال ہوتا رہے اور اس موقع پر رعایا اپنی مسرت اور عقیدت کی نذریں چڑھاتی رہے۔ ۵

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

پرنسس نیلوفر شہزادی فرحت بیگم صاحبہ دام اقبالہا کا ورود مسعود

یہ امر عقیدت مندان خانوادہ آصفی کے لئے باعث فخر ہے کہ اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کی رعایا پروری اور علم نوازی کی جھلکیاں مخدرات شاہی میں نظر آتی ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ سماج میں نئے نئے رجحانات کار فرما ہیں۔ ملک کے ہر طبقہ میں بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ ایسے زمانے میں خاندان شاہی کے محترم اراکین کا سماجی اور علمی کاموں میں حصہ لینا ملک کے لئے فال نیک ہے۔ علیا حضرت شاہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کو حیدرآباد کی تحریک خواتین سے خاص دلچسپی ہے۔ اورنگ آباد میں مسز برکت رائے کی کوششوں سے انجمن خواتین ہند کی شاخ قائم ہوئی۔ چنانچہ اسی کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے علیا حضرت شاہزادی صاحبہ تشریف لائیں۔ اور انجمن خواتین میں ایک نئی روح پھونک دی۔ علیا حضرت نے بروز شنبہ بتاریخ ۲۸ رمہر ۱۳۵۴ف مطابق ۳ ستمبر ۱۹۴۴ء بوقت ۴ ساعت شام چند خواتین کی معیت میں ہمارے کالج کا معائنہ فرمایا۔ اس عزت افزائی کے لئے ہم سب بے انتہا ممنون ہیں۔

علیا حضرت کی موٹر قریب ۴ بجے کالج کے سامنے آئی۔ اسکاوٹ بینڈ نے استقبال کیا۔ کالج کے طلبا دورویہ ایستادہ تھے۔ اور "عثمان زندہ باد" "سلطنت آصفی

زندہ باد کے پر جوش نعرے لگا رہے تھے۔ موٹر کالج کے پچھلے حصے میں سیڑھیوں کے پاس رُکی۔ اسکاوٹ ٹروپ نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔

علیا حضرت کالج کی بالائی عمارت میں تشریف لائیں۔ محمد ایوب احمد کرمانی متعلم سال دوم نے انجمن اتحاد طلبا کی جانب سے پھولوں کا ہار پیش کیا۔ علیا حضرت شاہزادی صاحبہ نے کالج کی جماعتوں کو دیکھا جہاں لکچر ہو رہے تھے۔ پھر بالائی برآمدے سے ماس ڈرل ملاحظہ فرمائی۔ اس کے بعد جناب صدر صاحب کے ساتھ کالج کے زیرین حصے میں تشریف فرما ہوئیں اور فوقانیہ جماعتوں کا معائنہ فرماتے ہوئے کالج ہال میں داخل ہوئیں جہاں اسٹاف اور طلبہ نے آپ کا استقبال کیا۔ جناب صدر کی درخواست پر علیا حضرت نے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت قبول فرمائی۔ کرسی صدارت پر متمکن ہونے کے بعد جناب صدر نے زرین ہار پہنایا۔ اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا۔ علیا حضرت نے طلبا کو انعامات تقسیم فرمائے اور جلسہ برخاست ہوا۔ شاہزادی صاحبہ نے کالج کے کاموں پر اظہار خوشنودی فرمایا جناب صدر کو مبارک باد دی۔ اور وعدہ کیا کہ وہ تنگی وقت کی وجہ سے اچھی طرح کالج کو نہ دیکھ سکیں اس لئے ایکبار وہ تفصیلی طور پر معائنہ فرمائیں گی طلبا نے شہزادی صاحبہ کا موٹر گھیر لیا۔ اور تعطیل کے لئے استدعا کی شاہزادی صاحبہ نے ارشاد فرمایا کہ تین دن کی تعطیل دی جائے۔ طلبا نے نعرہائے مسرت کے ساتھ علیا حضرت شاہزادی صاحبہ دام اقبالہا کو خدا حافظ کہا۔

جناب ناظم صاحب تعلیمات کا معائنہ

جناب ناظم صاحب تعلیمات انجمن خواتین اورنگ آباد کے سالانہ جلسہ کی شرکت کے لئے ۲۳ رمہر ۴۵ف کو اورنگ آباد تشریف لائے۔ ۲۵ رمہر مطابق ۱۳ راگست ۱۹۳۶ء کو صاحب ممدوح نے کالج اور اقامت خانوں کا معائنہ فرمایا۔ پانچ بجے شام میں ماس ڈرل اور مختلف کھیلوں کے مقابلے جمخانہ میں ملاحظہ فرمائے۔

لیگ ٹورنامنٹ کے تقسیم انعامات کے جلسے کی صدارت فرمائی۔ اور اپنی صدارتی تقریر میں ورزشی کھیلوں کی اہمیت واضح کی۔ اور فرمایا کہ طلبا کی جسمانی تنومندی اور صحت اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ ان کی تعلیم۔

تعطیل گرما کے بعد کالج کا افتتاح

دو مہینے کی خاموشی کے بعد کالج پھر آباد ہو گیا۔ اور تعلیمی کاروبار شروع ہو گیا۔ بہت سے طلبا کامیاب ہو کر کالج سے رخصت ہوئے۔ کچھ بالاتر جماعتوں کی تعلیم کے لئے ہندوستان کی جامعات میں گئے۔ کچھ تلاش روزگار میں لگے۔ خدا کرے سب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔ ناکام طلبا کو مستعدی کا سبق ملا۔ خدا کرے اس سے ان میں نیا استقلال پیدا ہوا اور یہ ناکامی کامیابی کا پیش خیمہ بنے۔ فیاض ازل نے ترقی کی استعداد ہر ذی روح کو ودیعت فرمائی ہے انسان میں یہ استعداد بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس سے کام لینا یا نہ لینا انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ذیل میں کالج کے نتائج کی فہرست دی جاتی ہے۔

امتحان انٹرمیڈیٹ۔ شعبہ فنون

شریک ۲۶ کامیاب ۱۴ درجہ دوم ۴ درجہ سوم ۱۰ نتیجہ ۵۴ فیصدی

امتحان انٹرمیڈیٹ شعبہ سائنس

شریک ۲۰ کامیاب ۱۰ 〃 〃 ۵ 〃 〃 ۵ 〃 ۵۰ فیصدی

کل شریک ۴۶ 〃 ۲۴ نتیجہ ۵۲ فیصدی

امتحان انٹرمیڈیٹ گروپ

〃 ۳ 〃 ۳ نتیجہ ۱۰۰ فیصدی

امتحان میٹرک

شریک ۸۶ کامیاب ۲۵ درجہ دوم ۸ درجہ سوم ۱۷ نتیجہ ۲۹ فیصدی

زندہ باد کے پرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ موٹر کالج کے پچھلے حصے میں سیڑھیوں کے پاس رُکی۔ اسکاوٹ ٹروپ نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔

علیا حضرت کالج کی بالائی عمارت میں تشریف لائیں۔ محمد ایوب احمد کرمانی متعلم سال دوم نے انجمن اتحاد طلبا کی جانب سے پھولوں کا ہار پیش کیا۔ علیا حضرت شاہزادی صاحبہ نے کالج کی جماعتوں کو دیکھا جہاں لکچر ہو رہے تھے۔ پھر بالائی برآمدے سے ماس ڈرل ملاحظہ فرمائی۔ اس کے بعد جناب صدر صاحب کے ساتھ کالج کے زیرین حصے میں تشریف فرما ہوئیں اور فوقانیہ جماعتوں کا معائنہ فرماتے ہوئے کالج ہال میں داخل ہوئیں جہاں اسٹاف اور طلبہ نے آپ کا استقبال کیا۔ جناب صدر کی درخواست پر علیا حضرت نے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت قبول فرمائی۔ کرسی صدارت پر متمکن ہونے کے بعد جناب صدر نے زرین ہار پہنایا۔ اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا۔ علیا حضرت نے طلبا کو انعامات تقسیم فرمائے اور جلسہ برخاست ہوا۔ شاہزادی صاحبہ نے کالج کے کاموں پر اظہار خوشنودی فرمایا جناب صدر کو مبارکباد دی۔ اور وعدہ کیا کہ وہ تنگی وقت کی وجہ سے اچھی طرح کالج کو نہ دیکھ سکیں اس لئے ایک بار وہ تفصیلی طور پر معائنہ فرمائیں گی طلبا نے شہزادی صاحبہ کا موٹر گھیر لیا۔ اور تعطیل کے لئے استدعا کی شاہزادی صاحبہ نے ارشاد فرمایا کہ تین دن کی تعطیل دی جائے۔ طلبا نے نعرہائے مسرت کے ساتھ علیا حضرت شاہزادی صاحبہ دام اقبالہا کو خدا حافظ کہا۔

جناب ناظم صاحب تعلیمات کا معائنہ

جناب ناظم صاحب تعلیمات انجمن خواتین اورنگ آباد کے سالانہ جلسہ کی شرکت کے لئے ۲۳؍ مہر ۴۶ف کو اورنگ آباد تشریف لائے۔ ۲۵؍ مہر مطابق ۳۱؍ اگست ۳۶ء کو صاحب ممدوح نے کالج اور اقامت خانوں کا معائنہ فرمایا۔ پانچ بجے شام میں ماس ڈرل اور مختلف کھیلوں کے مقابلے جمخانہ میں ملاحظہ فرمائے

لیگ ٹورنامنٹ کے تقسیم انعامات کے جلسے کی صدارت فرمائی۔ اور اپنی صدارتی تقریر میں ورزشی کھیلوں کی اہمیت واضح کی۔ اور فرمایا کہ طلبا کی جسمانی تنومندی اور صحت اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ ان کی تعلیم۔

تعطیل گرما کے بعد کالج کا افتتاح

دو مہینے کی خاموشی کے بعد کالج پھر آباد ہوگیا۔ اور تعلیمی کاروبار شروع ہوگیا۔ بہت سے طلبا کامیاب ہوکر کالج سے رخصت ہوئے۔ کچھ بالاتر جماعتوں کی تعلیم کے لئے ہندوستان کی جامعات میں گئے۔ کچھ تلاش روزگار میں لگے۔ خدا کرے سب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔ ناکام طلبا کو مستعدی کا سبق ملا۔ خدا کرے اس سے ان میں نیا استقلال پیدا ہو اور یہ ناکامی کامیابی کا پیش خیمہ بنے۔ فیاض ازل نے ترقی کی استعداد ہر ذی روح کو ودیعت فرمائی ہے انسان میں یہ استعداد بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس سے کام لینا یا نہ لینا انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ذیل میں کالج کے نتائج کی فہرست دی جاتی ہے۔

امتحان انٹرمیڈیٹ۔ شعبہ فنون

شریک ۲۶ کامیاب ۱۴ درجہ دوم ۴ درجہ سوم ۱۰ نتیجہ ۵۴ فیصدی

امتحان انٹرمیڈیٹ شعبہ سائنس

شریک ۲۰ کامیاب ۱۰ " " ۵ " " ۵ " " ۵۰ فیصدی

کل شریک ۴۶ " ۲۴ نتیجہ ۵۲ فیصدی

امتحان انٹرمیڈیٹ گروپ

" ۳ " ۳ نتیجہ ۱۰۰ فیصدی

امتحان میٹرک

شریک ۸۶ کامیاب ۲۵ درجہ دوم ۸ درجہ سوم ۱۷ نتیجہ ۲۹ فیصدی

گروپ شریک ۷ کامیاب ۳ نتیجہ ۴۳ فیصدی

نوٹ:- امتحان عثمانیہ میٹرک کے سلسلے میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مضمون انگریزی میں عام طور پر امیدوار ناکام رہے ۔ بسمت اورنگ آباد کے تمام مدارس فوقانیہ کا نتیجہ اس مضمون کی اوسط کامیابی کی وجہ سے خراب رہا بعض مدارس میں کامیاب طلبا کی تعداد ۲ اور ۱ ہے ۔ اس امر کی تحقیق کہ آیا سمت اورنگ آباد کے امیدوار انگریزی میں خاص طور پر کمزور تھے اور دوسرے صوبوں میں ایسا نہ تھا یا ان کے جوابی پرچوں کی جانچ میں کسی خاص معیار کو پیش نظر رکھا گیا ۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگی ۔

امتحان ایچ ۔ ایس ۔ ایل ۔ سی

شریک ۳۳ کامیاب ۲۰ درجہ دوم ۱۵ درجہ سوم ۵ نتیجہ ۶۱ فیصدی

داخلہ سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی طلبا جوق درجوق اس کثرت سے آئے کہ مجبوراً ایک ہفتہ کے بعد ہی داخلہ بند کر دینا پڑا ۔ اقامت خانے بھی بہت جلد معمور ہو گئے اور اکثر طلبا کو مایوس ہونا پڑا ۔ البتہ نتیجہ میٹرک کی خرابی کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ سال اول میں داخلوں کی تعداد نسبتاً کم رہی کالج میں طلبا کی تعداد طبقہ واری ذیل میں دی جاتی ہے ۔

طبقہ کالج	۱۳۰
طبقہ فوقانیہ	۶۱۹
طبقہ وسطانیہ	۶۰۲
میزان کل	۱۳۵۱

پرائمری کی جماعت چہارم (الف) اور (ب) برخاست کر دی گئی ۔ اب اس کالج میں پرائمری کی جماعتیں نہیں ہیں ۔

اقامت خانوں کے طلبا کی تعداد

اقامت خانہ کالج	۳۲
,, ,, فوقانیہ	۵۵
,, ,, جامع مسجد	۳۹
,, ,, صرافہ	۴۰
جملہ	۱۶۶

قدیم طلبا خدا کا شکر ہے کہ ہمارے کالج کے قدیم طلبا نے جامعہ عثمانیہ کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور اس طرح قدیم روایات کو قائم رکھا۔

بھجنگ راؤ و یشپانڈے۔ ایم ایس سی (طبیعیات) میں درجہ اول میں کامیاب ہوئے اور جامعہ میں اول رہے۔ عبدالولی نے ایم ایس سی (کیمیا) درجہ دوم میں پاس کیا۔ اور اپنے مضمون میں جامعہ میں اول رہے۔ ظہیر الدین بی اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ عربی اور دینیات لازمی میں اول رہے۔

ہمارے کالج کے ایک قدیم طالب علم اشفاق احمد صاحب جو ایک عرصے تک مجلہ جامعہ کے مدیر بھی رہے "علامہ اقبال" کے ریسرچ اسکالر مقرر ہوئے ہیں وہ اس شاعر اعظم پر مقالہ لکھیں گے۔ صاحب موصوف نے کام شروع کر دیا ہے ہمیں توقع ہے کہ جس طرح اسی کالج کے ایک سپوت نے سودا پر ایک بےنظیر مقالہ لکھا تھا اس طرح یہ مقالہ بھی جامع اور بلند پایہ ہوگا۔

نتائج امتحانات اساتذہ طالبعلمی معلمی کا جزو اعظم ہے۔ اچھا طالب علم ہی اچھا اُستاد بن سکتا ہے۔ ہمارے کالج کے اساتذہ نے بھی سال حال میں مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کی، جن کی فہرست

حسب ذیل ہے۔

جناب مولوی انیس الحق صاحب نے لیڈس سے ایم۔ایڈ کا امتحان کامیاب کیا۔ جناب مولوی عبدالحمید صاحب سٹر کاسے اور مسٹر کلکرنی ڈپلوما آف ایجوکیشن کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ مولوی حمید الدین صاحب نے سی۔ ٹی کی سند حاصل کی۔ مسٹر مونگیکر اور مولوی غلام جیلانی صاحب میٹرک ٹریننگ کے امتحان سے عہدہ برآ ہوئے

اراکین اسٹاف کے تبادلے

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے اسٹاف کے دو نہایت سرگرم کارکن ہم سے جُدا ہوگئے ان میں سے پہلے مولوی منظر علی خاں صاحب ہیں جن کا تبادلہ بہ ترقی گلبرگہ کالج میں بحیثیت مددگار لکچرر انگریزی بجائداد (۱۵۰) عمل میں آیا ہے۔ ہمیں آپ سے مفارقت کا قلق ہے۔ لیکن ساتھ ہی آپ کی ترقی پر مسرت بھی محسوس کرتے ہیں، ہم صاحب معز کی خدمت میں اس ترقی پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

ہمارے دوسرے بزرگ مولوی چراغ علی صاحب ہیں۔ جو مولوی عبدالرشید صاحب کے معاوضے میں بہ سلسلہ عمل تعیناتی شاخ وسطانیہ میں اول مددگار تھے۔ عمل تعیناتی برخاست ہونے کی وجہ سے مولوی عبدالرشید صاحب جو نظامت تعلیمات میں مددگار تھے اپنی اصل جائداد اول مددگاری کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد رسماً تاصاً پر واپس ہوئے۔ اور مولوی چراغ علی صاحب کو نظامت تعلیمات کی صیغہ داری پر واپس جانا پڑا۔ آپ ایک کامیاب معلّم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت تجربہ کار اسپورٹسمین بھی تھے۔ گیمس سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ آپ نہایت پرجوش اور ملنسار تھے۔ آپ کا دائرہ احباب بہت وسیع تھا۔ جو آپ کے خلوص کا ثبوت ہے۔ آپ کی اسپورٹسمین شپ سے دوسرے لوگ بہت متاثر ہوتے تھے۔ آپ طلباء سے غایت

درجہ مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔ جیسے باپ اپنے بچوں سے کرتا ہے۔ آپ کی ذات کا یہ اثر تھا کہ طلبا میں علمی ذوق اور اسپورٹس کا شوق پیدا ہوگیا خدا کرے آپ بہت جلد اورنگ آباد واپس آئیں۔ اور آپ کے نہ ہونے سے حلقۂ احباب میں جو جگہ خالی ہوگئی ہے وہ پُر ہو جائے۔

انجمن اتحاد طلبہ سال حال طلبا کے اتحاد و اتفاق کے لئے انجمن اتحاد طلبا قائم کی گئی ہے۔ اس کا منشا یہ بھی ہے کہ ان میں تقریر و مباحثہ کا ملکہ پیدا ہو۔ اور طلبا کو اچھے مقرروں اور علما کی تقاریر اور صحبت سے استفادہ کرنے کا موقع وقتاً فوقتاً ملتا رہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ارباب انجمن نہایت مستعدی اور انہماک سے مصروف کار ہیں۔ سال رواں کے لئے انجمن کے عہدیداروں کا انتخاب حسب ذیل اراکین پر مشتمل ہوا۔

۱۔	مسٹر ایوب احمد کرمانی متعلم سال دوم	صدر
۲۔	مسٹر رگھوناتھ راؤ متعلم سکستھ فارم	نائب صدر
۳۔	مسٹر سید صفی اللہ احمد متعلم دہم	معتمد
۴۔	مسٹر محمد ہاشم "	خازن

ہر جماعت سے انجمن اتحاد کی رکنیت کے لئے ایک ایک طالب علم کا انتخاب ہوا جو حسب ذیل ہے۔

محمد عبدالعزیز صدیقی	نمائندہ سال دوم	محمد علی	نمائندہ جماعت دہم
گلاب خاں قیصر	نمائندہ سال اول	گنگادھر	نمائندہ سکستھ فارم
سید سعید مرزا	نمائندہ جماعت نہم	رنچھوڑ داس	نمائندہ فورتھ فارم
سید محمد عبداللہ قمر	نمائندہ جماعت ہشتم		

ان کے علاوہ صدر انجمن کی درخواست پر دو طلبا کی رکنیت کا اور اضافہ کیا گیا۔

(۱) اکرام الدین متعلم سال دوم (۲) محمد حسین متعلم دہم

جلسۂ تعزیت اقبال مرحوم

۱۱۔ شہر یور ۱۳۴۷ف مطابق ۱۷۔ جولائی ۱۹۳۸ء کو انجمن اتحاد طلبا کی جانب سے کالج ہال میں ایک تعزیتی جلسہ بسلسلۂ وفات حسرت آیات شاعر اعظم اقبال مرحوم و مغفور کیا گیا۔ سب سے پہلے سید صفی اللہ صاحب معتمد انجمن ہذا نے اقبال مرحوم کے ادبی کمال پر تقریر کی اور آپ کو بہترین ادیب بتلایا جس نے رسم و راہ قدیم سے الگ ہو کر ملک و ملت کو پیغام عمل اور پیام بیداری دیا۔ اس کے بعد جناب مولوی غلام طیب صاحب نے نہایت عالمانہ خطبہ دیا۔ آپ کا انداز بیان حکیمانہ تھا۔ آپ نے شاعر اعظم کی کتاب حیات کے ہر باب پر کمال بالغ نظری سے روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا "اقبال سب سے بڑا فن کار مکمل شاعر اور کامل انسان تھا"۔ آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اقبال کا پیام بھی وہی ہے جو قدیم اساتذہ باکمال کا تھا۔ عمر بھر اقبال نے اسی بات کی تلقین کی ہے کہ تمام دنیا سے بے نیاز ہو کر "اسی ایک در محبوب پر جبہہ سائی کی جائے۔ یہ ہماری کوتاہ فہمی ہے کہ ہم کوتہ اندیشوں کی بدحواسانہ چیخ اور پکار سے مرعوب ہو کر اپنے مایۂ ناز اساتذہ فن پر نکتہ چینی کو باعث فخر سمجھنے لگتے ہیں"۔ آپ نے سلسلۂ کلام ختم کرتے ہوئے طلبا سے اقبال کو سمجھنے اور ان کی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کی اپیل کی۔ یہی وہ مداوا ہے اس جراحت کا جو انھیں اقبال کی جدائی سے پہونچی ہے اگر وہ اسے درحقیقت محسوس کرتے ہیں۔ تیسرے مقرر جناب مولوی ولی محمد خاں صاحب تھے جنھوں نے اقبال بہ حیثیت انسان ہونے کے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "وہ ماسوا سے اپنی ذات کو بہت دور رکھتے تھے"۔ آپ نے فرمایا کہ "یہ فخر ہمیں اور صرف ہمیں بجا طور پر حاصل ہے کہ اقبال نے دامن علم کو ہمہ قسم کی آلودگیوں سے پاک و صاف رکھا"۔ ہم کو اقبال بننے کے لئے اقبال جیسی قلندرانہ شان پیدا کرنی چاہیئے۔

اخیر میں مولوی سید سکندر علی صاحب وجد بی اے۔ ایچ سی۔ ایس قدیم متعلم عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے اپنا مرثیہ اقبال سُنایا۔ اس سے سامعین بہت متاثر ہوئے۔ سب سے آخر میں سامعین عالی جناب صدر کلیہ کی پر مغز تقریر سے مستفید ہوئے۔ آپ نے فرمایا اقبال کا دردمند دل مدت العمر ملت اسلامیہ کے زوال پر خون کے آنسو بہاتا رہا اور اسے ایک مرتبہ پھر اوج ثریا پر متمکن دیکھنے کے لئے تڑپا کیا۔

مولوی عبدالحق صاحب کی اعزازی ڈگری پر ھدیہ تبریک

اس کے بعد ہمارے کلیہ کے ہر دلعزیز پروفیسر محمد ابراہیم صاحب نے جناب مولوی عبدالحق صاحب سابق پرنسپل کلیہ ہذا معتمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد و پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ کے کارناموں پر نہایت بلیغ اور جامع خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی زندگی اُردو کی خدمت کے لئے وقف کردی ہے۔ آپ کی خانگی زندگی اور پبلک لائف میں کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ اُردو زبان پر آپ کا بہت بڑا احسان ہے۔ آخر میں جناب صدر کلیہ نے وہ ریزولیشن پڑھا جس میں مولوی صاحب کو الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ۔ کی اعزازی ڈگری ملنے پر مبارکباد پیش کی گئی تھی۔

جناب مولوی عبدالحق صاحب کا خط

انجمن اتحاد طلبا کی طرف سے جو تہنیت نامہ مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اس کا جواب صاحب موصوف نے عنایت فرمایا ہے۔ آپ کا خط درج ذیل ہے۔

شفیقی و مکرمی زاد لطفہٗ۔ تسلیم۔

آپ کا عنایت نامہ معہ تہنیت نامہ انجمن اتحاد طلبہ کلیہ اورنگ آباد پہونچا۔

جس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ براہ کرم میرا دلی شکریہ اپنے اساتذہ اور طلبار کو پہونچا دیجئے۔ میں ان کی اس عنایت اور یادآوری کا بہت ممنون ہوں ۔ میں جانے سے پہلے ضرور اورنگ آباد آؤں گا۔ آپ سے اور آپ کے اساتذہ سے مل کر مجھے حقیقی مسرت ہوگی۔ کیونکہ مجھے اورنگ آباد سے اب بھی وہی تعلق ہے جو کبھی پہلے تھا"

نواب زین یار جنگ بہادر ناظرین کو یاد ہوگا کہ جب ہز ایکسیلینسی نواب سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم مملکت آصفیہ کالج میں رونق افروز ہوئے تو اس وقت ممدوح الشان نے کالج کے لئے ایک بڑے ہال کی درخواست کو شرف منظوری بخشا تھا۔ چنانچہ اسی ہال کے لئے جگہ کا انتخاب کرنے کے لئے نواب زین یار جنگ بہادر چیف آرکیٹکٹ ممالک محروسہ سرکار عالی ۲۸۔ شہریور ۱۳۴۲ف مطابق ۳۔ اگست ۱۹۳۳ء کو کالج میں تشریف لائے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انھیں دنوں مولوی سید عارف الدین صاحب ناظم تعمیرات سمت اورنگ آباد بھی یہاں دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ ان دونوں حضرات نے جناب صدر صاحب کلیہ کی معیت میں کالج کے سامنے کا ضلع منتخب فرمایا۔ خدا کرے جلد یہ عمارت تیار ہو جائے اس سے کالج کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہو جائے گی ۔

مراجعت انیس قارئین کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ مولوی سید انیس الحق صاحب جن کی آمد کا اتنے دنوں سے انتظار ہو رہا تھا۔ ۱۰۔ مہر ۱۳۴۵ف مطابق ۱۶۔ اگست ۱۹۳۶ء کو انگلستان سے ۲ سال کے قیام کے بعد واپس آگئے ہیں۔ آپ نے لیڈز یونیورسٹی سے ایم ایڈ کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا ہے۔ اچھوت اقوام کی تعلیم پہ آپ نے جو مقالہ لکھا تھا اُس نے ممتحنین پر آپ کی قابلیت کا

بہت اچھا اثر ڈالا۔ چنانچہ مراجعت سے قبل سر جارج اینڈرسن نے آپ کو خاص طور پر مدعو کیا۔ آپ کے پروفیسر صاحبان آپ کی فرض شناسی اور علمیت کے معترف ہی نہیں بلکہ مداح ہیں آپ نہایت خلیق اور مخلص انسان ہیں۔ طلبا سے نہایت شفقت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ اسٹاف کلب کی جانب سے آپ کی تشریف آوری کی خوشی میں ایک ڈنر ہوا جس کے بعد جناب معتمد صاحب نے صاحب موصوف کے محاسن بیان فرمائے۔ انیس الحق صاحب کو کالج سے جو خاص اُنس ہے اُس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسٹاف کلب کی پرانی سرگرمیاں اور موجودہ جھگڑے آپ کی ہر دلعزیزی کے ثبوت ہیں۔

۱۵ اعہر ۱۳۴۷ف مطابق ۲۱۔ اگست کو کالج ہال میں انجمن اتحاد طلبہ کی طرف سے بصدارت جناب صدر صاحب کلیہ ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں مولوی انیس الحق صاحب نے انگلستان کے دلچسپ حالات بیان فرمائے۔ آپ نے وہاں کے طلبا کے ضبط و تنظیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ وہاں کے طلبہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہیں۔ اخیر میں صاحب کلیہ نے طلبا سے اپیل کی کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور اپنی ذات کو اس قابل بنائیں کہ دوسرا ان پر اعتراض نہ کر سکے وہ اس امر کی نوبت ہی نہ آنے دیں کہ ان کی تادیب یا چشم نمائی کی ضرورت ہو۔

لیگ ٹورنامنٹ

خدا کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ جو تین سال قبل شروع کیا گیا تھا ہر آئینہ کامیاب ثابت ہوا۔ طلبہ جس ذوق سے تعلیم میں دلچسپی لیتے ہیں اسی شوق سے کھیلوں میں بھی نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ امسال لیگ ٹورنامنٹ میں لڑکوں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ طبقہ کالج اور عثمانیہ میٹرک کے میچز خاص طور پر بہت ہی پُر جوش ہوئے۔ فٹ بال اور ہاکی میچز ختم ہو چکے ہیں۔ ہاکی میں کالج سکشن

کی ٹیم اور فٹ بال میں عثمانیہ میٹرک کی ٹیم اول آئی اور انعام کی مستحق ٹھیری۔ کرکٹ اور والی بال کا تصفیہ ابھی نہیں ہوا ہے کھیل ہو رہے ہیں۔

کاشانۂ ادب اسی سلسلہ میں انجمن کاشانۂ ادب کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا مقصد ٹھوس اور خاموش علمی و ادبی خدمت انجام دینا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ طلبا میں صحیح ادبی ذوق پیدا کیا جائے۔ اور ان کے مذاق کی صحیح رہ نمائی کی جائے۔ یہ انجمن ان کی خفتہ قوتوں کو بیدار اور پنہاں ودیعتوں کو بروئے کار لانے میں لگی ہوئی ہے۔ اس انجمن کے صدر مولوی ولی محمد خاں صاحب خاص طور پر مستحق ستایش ہیں۔ جو اس کے روح رواں ہیں۔

سال رواں کے لئے انجمن ہذا کے عہدیداران حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولوی ولی محمد خاں صاحب۔ بی اے۔ (علیگ) مددگار کالج — صدر

(۲) مرزا متین احمد بیگ سروش متعلم سال دوم — معتمد

(۳) خواجہ معین الدین چشتی متعلم جماعت دہم — منتظم

ان کے علاوہ طلبا کی ایک جماعت بطور مستقل قلمی معاونین کاشانہ منتخب کی گئی۔ جو کاشانہ کے منتخبہ عنوانات پر مضامین تیار کیا کرے گی۔

یوم طلبا بتاریخ ۲۷۔ مہر ۴۷ ف بمقام چادر منڈی تھیٹر نوجوانانِ اورنگ آباد نے "یوم طلبا" منایا۔ حاضرین میں طلبا اور اہالیان اورنگ آباد کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ جلسہ کی صدارت عالی جناب سید محی الدین صاحب صدر کلیہ اورنگ آباد نے کی۔ ابتدا میں سوامی رامانند جی نے طلبا کو مخاطب کر کے کہا کہ انسان کی عظمت کا دارو مدار باطنی صفائی پر ہے۔ ان کو چاہیئے کہ پہلے اپنے من کی لڑائی جیتیں اور خدائی شعور کو جو ہر ذی حیات میں ودیعت ہے۔ اجاگر کریں۔ اس کے بغیر نہ انسان میں یقین پیدا ہو سکتا ہے نہ جرأت۔ شخصیت کا تحقق ہی انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ

ہے۔ معرفت نفس کے بغیر انسان اپنی زندگی کا راستہ نہیں معلوم کر سکتا۔

سوامی جی کی تقریر کے بعد سید صفی اللہ۔ رگھوناتھ۔ ڈی ہنمنت راؤ۔ وٹھل راؤ۔ دیشپانڈے نے اپنی تقریروں میں طالبعلمانہ زندگی کے مقصد اعلیٰ یعنی تلاش صداقت کو واضح کیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ طلبا میں اپنے سماجی اور انفرادی فرائض کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ ان کی تقریریں نہایت ولولہ انگیز تھیں۔ یہ ایک فال نیک ہے۔ خدا کرے جوش اور امنگ کے ساتھ ان میں عالمگیر شعور بھی پیدا ہو جائے۔

مولوی غلام طیب صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ سماجی اصلاح کے لئے سب طبقے متحد ہو گئے ہیں۔ سنیاسی۔ جوگی۔ صوفی۔ مولوی۔ تاجر پیشہ ور سب اس معاملہ میں متحد الخیال ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے مستقبل کا دار و مدار نوجوانوں کے طرز عمل پر ہے۔ دنیا میں ہر جگہ ان کی نوجوانی کو قومی قوت سمجھا جاتا ہے۔ آج کل نئے نئے خیالات ہندوستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ طلبار کو چاہیئے کہ وہ سمجھ سے کام لیں اور ذہنی حملوں کا شکار نہ بنیں۔ مشرقی روایات کا قائم رکھنا ان کا فرض ہے۔ اس کے بغیر وہ دنیا میں نیکنام اور باعزت نہیں بن سکتے وہ طالب علمی کے زمانہ میں لیڈر اور کمانڈر بننے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ یہ سمجھیں کہ وہ ایک زیر تعلیم سپاہی ہیں۔ ضبط کے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ نوجوانوں میں ضبط کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان میں ہر جگہ جو کچھ کیا جا رہا ہے سب انھیں کے لئے ہے۔ اور ہماری حکومت کو بھی ان کی موجودہ ضروریات کا پورا احساس ہے۔

مولوی محمد ابراہیم صاحب نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ اورنگ آباد میں سماجی اتحاد ہے۔ اور پرسکون فضا میں معلمین نہایت ذمہ داری سے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ صاحب موصوف نے جسمانی تنومندی اور صحت پر

زور دیتے ہوئے کہا کہ اس کے بغیر قومی ترقی محال ہے۔

مسٹر کردے نے اپنی مختصر تقریر میں یہ یقین دلایا کہ اتحاد و اتفاق کی روایت کو قائم رکھنے کی ہر طرح کوشش کی جائے گی۔ ہم سب کو اس کا احساس ہے کہ آج کل بات بات میں فرقہ وارانہ آویزش ہو جاتی ہے۔ انشاء اللہ اورنگ آباد میں اس کی نوبت کبھی نہ آئے گی۔

آخر میں صدر جلسہ جناب مولوی سید محی الدین صاحب نے ایک پر جوش اور ولولہ انگیز تقریر کی جس سے خلوص ٹپک رہا تھا۔ صاحب موصوف نے فرمایا کہ انسانیت کے لئے مذہب ضروری ہے۔ خدا کو ماننا۔ اس سے ڈرنا اور طالب امداد ہونا اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ ہر مذہب یہی تعلیم دیتا ہے۔ سب مذاہب ایک ہیں۔ فرق صرف شریعت کا ہے۔ طلبا کو چاہیئے کہ اپنے اخلاق کی تہذیب کریں اپنے نفس میں اخلاقی شعور کو اجاگر کریں۔ فرض شناسی انسانیت کے لئے لازمی ہے ہر نوجوان کو اپنے دیس کا سچا سپاہی ہونا چاہئے۔ اور اپنے بڑوں کے احکام کی تعمیل کرنی چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر وہ آئندہ زندگی میں اچھے لیڈر اور کمانڈر نہیں بن سکتا۔

ارشادات خسروی

۱۳۔ رجب ۵۷ھ مطابق ۳ آبان ۴۲ف کو اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی نے بلدہ حیدرآباد میں جوبلی پویلین کے افتتاح کے موقعے پر نوجوانان ملک کو مخاطب فرماتے ہوئے گرانقدر نصیحتیں فرمائیں۔ اس سلسلہ میں ملک کے اکثر اداروں نے جلسے منعقد کئے چنانچہ ۱۵۔ آبان ۴۷ف کو انجمن اتحاد طلبہ کلیہ اورنگ آباد نے بھی ایک جلسہ منعقد کیا جس کی غایت یہ تھی کہ طلبا ان حکیمانہ نصائح کے لئے بارگاہ خسروی میں نذر امتنان و تشکر پیش کریں۔ ایوب احمد صاحب صدر انجمن صفی اللہ صاحب معتمد انجمن مسٹر گنیش راؤ تھتے۔ مولوی سید احمد صاحب۔ مولوی غلام طیب صاحب۔ مولوی

محمد ابراہیم صاحب اور جناب پرنسپل صاحب نے ارشادات گرامی کی اہمیت کو واضح کیا۔ اور نوجوانوں کو یہ سمجھایا کہ وہ زمانہ کی نزاکت کو سمجھیں اور اپنے آقائے ولی نعمت کے ارشادات کو مشعل راہ بنائیں۔

انتقال پر ملال ڈاکٹر گنگا دھر سیمنت

یہ رسالہ مطبع کو بھیجا ہی جا رہا تھا کہ دفعتاً موت نے اورنگ آباد کے ہر دلعزیز ڈاکٹر اور اسٹاف کالج کے رکن ڈاکٹر سیمنت کی دنیاوی حیات کا خاتمہ کر دیا۔ اس سانحہ نے اورنگ آباد میں ہر طرف صفِ ماتم بچھادی ہے۔

ڈاکٹر سیمنت بروز چہارشنبہ درد شکم میں مبتلا ہوئے اور تیسری آذر ۱۳۵۴ف بروز شنبہ شب میں آپ نے دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ ڈاکٹر سیمنت ہر مذہب و ملت کے افراد میں ہر دلعزیز تھے۔ اپنی مختصر زندگی (ابھی ان کی عمر ۴۳ سال تھی) میں اورنگ آباد کی طبی خدمت کی اور سماجی اور رفاہی کاموں میں ہمیشہ ذوق و شوق سے حصہ لیا۔ ان کا شگفتہ چہرہ۔ جھکی ہوئی گردن۔ پریم کے رس سے بھری ہوئی آنکھیں۔ دل کو موہ لینے والی آواز برسوں یاد آئے گی۔ یہ مجسمۂ شرافت کبھی کسی سے نہ لڑا اور نہ سخت کلامی کی۔ یہ دکھیوں کا ہمدرد۔ طالب علموں کا دوست اور غریبوں کا سیوک۔ پریم کی دنیا کا باسی تھا اور خلق کی خدمت کرتے ہوئے جان دی۔ اس کی سیرت پریم کی رینی میں رنگ گئی تھی پریم کا جس اس کے نام کو عرصۂ دراز تک زندہ رکھے گا۔

خطبہ تقسیم اسناد جامعہ ڈھاکہ

از

رائٹ آنریبل سراکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر پی۔سی۔ڈی۔سی۔ایل۔ایل۔ڈی

خواتین وحضرات۔

جامعہ ڈھاکہ میں اس سال کا خطبہ تقسیم اسناد پڑھنے کی دعوت کو بہ خاص مسرت کے ساتھ قبول کیا ہے۔ جیسا کہ شاید آپ کو معلوم ہوگا میں آپ کے کورٹ کا دوامی رکن ہوں۔ اور اس طرح آپ کی جامعہ کے بالکل ابتدائی زمانہ سے مجھے اُس کی ترقی میں ذاتی طور پر دلچسپی لینے کا قابل فخر موقع حاصل ہوتا رہا ہے۔ علاوہ بریں اس جامعہ اور حیدرآباد کی جامعہ عثمانیہ کے درمیان جو رابطہ قائم رہا ہے اُس کی نوعیت ہمیشہ نہایت دوستانہ اور خوشگوار رہی ہے۔ تمام ہندوستانی جامعات میں آپ نے سب سے پہلے ہماری جامعہ کی اسناد کو تسلیم کیا۔ خود ہماری جامعہ میں اعلیٰ سائنس کے مطالعہ کا انتظام ہونے تک آپ نے ہمارے سائنس کے طیلسانین کو اُن سہولتوں سے مستفید ہونے کی اجازت دی جو آپ کی جامعہ میں مہیا ہیں اور اس فیاضی سے جو علمی زندگی کی بہترین روایات کی ایک نمایاں خصوصیت ہے آپ نے ہم کو ایسا زیر بار احسان کیا ہے جسے ہم فراموش نہ کریں گے۔

جامعہ ڈھاکہ خوش قسمت ہے کہ اسے اس ملک کے علمی گہواروں میں ایک نادر حیثیت حاصل ہے۔ آپ کی جامعہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی کوششوں کا جس کی عہد آفریں رپورٹ کے بار احسان سے ہندوستان کے ماہرین تعلیم ابھی تک سبکدوش نہیں ہو سکے ہیں۔ گویا پہلا پھل ہے۔ نیز آپ کو نہایت سازگار سرپرستی میں کام

شروع کرنے کا قابل فخر موقع ملا۔ اس لئے کہ آپ اپنے پہلے وائس چانسلر سر فلپ ہارٹوک کی بصیرت افروز رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکے۔

آپ کی جامعہ نہ صرف اُن حالات کے لحاظ سے جو اُس کو عالم وجود میں لائے نیز اپنے پہلے وائس چانسلر کی شخصیت کے باعث خوش قسمت رہی۔ بلکہ ہندوستانی تہذیب کے ایک ممتاز مرکز سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اسے مزید شرف حاصل ہوگیا ہے، شہر ڈھاکہ ایک ایسی جامعہ کا مرکز بننے کے لئے بہت موزوں تھا۔ جو ہندوستان اور بہترین دنیا کی تہذیب کے بہترین اور دیرپا عناصر کے اتحاد کی نمائندہ ہے۔

اس تمام نواح میں جس کا صدر مقام ڈھاکہ ہے جو آثار قدیمہ ابھی تک پائے جاتے ہیں وہ اس خطہ کی ایک عظیم الشان اور متنوع تاریخ پر شاہد ہیں۔ آپ کے شہر کا نام ہی بعض کی رائے میں ہندو دیوی ڈھکیشوری سے نسبت رکھتا ہے جس کا مندر یہاں موجود ہے۔ حوادث زمانہ سے بچے ہوئے آثار نے جو آپ کے ضلع میں واقع ہیں مشہور و معروف جھاسا پال اور چندر پال کے ناموں کو زندہ رکھا ہے اور اگر مقامی روایات پر بھروسہ کیا جائے تو بکرم پور نامی گاؤں راجہ بکرماجیت اعظم کی قدیم شہرت کی یاد دلاتا ہے۔

مسلمانوں نے ہندو اور بدھ مت کی روایتی تہذیب کی اس قدیم بنیاد میں اپنی تہذیب کا اضافہ کیا ہے۔ میر جملہ (جن کا تعلق دکن کی تاریخ سے بھی ہے) اور ملکہ نور جہاں کے بھتیجے شایستہ خاں جیسے نامور صوبہ دار یہاں اپنے شاندار دربار کرتے تھے اور انھوں نے عالیشان عمارات عامہ تعمیر کر کے آپ کے شہر کو آراستہ کر دیا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ آج تک شایستہ خاں کے اُس مشہور طرز تعمیر کی روایات یہاں باقی ہیں جو ان کے نام سے منسوب ہیں۔

ہندو اور مسلم عہد کے بعد اب برطانوی دور نے بھی آپ کے شہر کی زندگی اور خوشحالی میں اضافہ کیا ہے اور انگریزوں کی آمد کے بعد سے آپ کی معاشی زندگی کی امداد کے لئے بہت سے صنعتی کاروبار پیدا ہو گئے ہیں جن میں سن کا عظیم الشان کاروبار شامل ہے۔

پس اس طرح ان چار بڑے چشموں یعنی ہندو اور بدھ مت اور مسلم اور عیسائی تہذیب سے سیراب ہو کر جو سب مل کر ہماری مشترکہ تہذیب کے وسیع دریا کو رنگ اور روانی بخشتے ہیں، آپ کا عظیم الشان شہر ایک ایسے دارالعلوم کے لئے جیسی کہ آپ کی جامعہ ہے بہت ہی موزوں ہے جو ہر قسم کے علوم کو خواہ وہ جدید ہوں یا قدیم، خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی اپنے مخصوص دائرہ عمل کے اندر رکھتی ہے۔

جدید حالات کے دباؤ میں ہم بعض اوقات اس کام کو بھول جاتے ہیں جو اب بھی درحقیقت ہر جامعہ کا بنیادی اور اولین کام ہے۔ قدیم زمانہ میں خود ہمارے ملک نیز مغربی ممالک میں جامعہ اُن لوگوں کے اجتماع کی جگہ ہوتی تھی جو علم حاصل کرنے کا شوق رکھتے تھے۔ اور اس لئے ایسے مشاہیر کے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے جو اُن کو تعلیم دے سکیں اس قدیم نصب العین کو مشرق میں اور مغرب کے بعض حصوں میں بھی لوگ رفتہ رفتہ بھولنے لگے اور جامعہ کو محض ایک امتحان لینے والا ادارہ سمجھا جانے لگا جس کا کام نیم احتسابی فرائض کا انجام دینا رہ گیا۔ ہندوستان کی چند جامعات میں آپ کی جامعہ نے سب سے پہلے اس غلط تصور کے خلاف اقدام کیا آپ نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ اُن فرائض کی تکمیل کے لئے جو واقعتاً ایک جامعہ کو انجام دینے چاہئیں چند امور ضروری ہیں۔ اول یہ کہ طلباء کو اپنے استادوں کے قریب رہنا چاہیئے۔ اس لئے جامعہ ڈھاکہ کو اقامتی جامعہ بنایا گیا۔ دوسرے یہ کہ طلباء کے لئے اپنے استادوں کا تقرب ضروری ہے اسی لئے ڈھاکہ میں اتالیقی طریقہ

تعلیم قائم کیا گیا۔ تیسرے یہ کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ علم کو ترقی دینا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اس غرض سے آپ نے اس جامعہ میں تحقیقاتی اور اچھی کاموں کی مستحکم روایات قائم کردیں۔ آخراً جامعہ کو ذہنی سرگرمی کا مرکز ہونا چاہیئے اس لئے آپ نے ایک عظیم الشان کتب خانہ کے قیام و تحفظ کی جانب تن دہی کے ساتھ اپنی توجہ صرف کی لیکن ہم صرف اپنے ہی ذاتی مفاد کے لئے زندہ نہیں ہیں ہم سب پر جو جامعہ ڈھاکہ کے شعبہ جات کے رکن ہیں یا طیلسانین یا انڈر گریجویٹ ہیں نہ صرف انفرادی طور پر شہری ہونے کی حیثیت سے بلکہ ایک بڑے علمی ادارہ کے ارکان ہونے کی حیثیت سے بھی اپنی مادر وطن کے چند فرائض عائد ہوتے ہیں۔

ایک مسئلہ ایسا ہے جو اپنی نزاکت اور نیز اپنی قومی اہمیت کے اعتبار سے سب سے پہلے ہماری توجہ کا طالب ہے۔ میرا اشارہ اُن اختلافات کی طرف ہے جو ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے درمیان پیدا ہوتے دکھائی دے رہے ہیں میں اپنی حد تک یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ ان اختلافات کا کوئی ایسا دیرپا حل پیدا نہیں ہوسکتا جو ایک مشترکہ قومیت اور ایک مشترک میراث کے لئے قومی جدوجہد کی بنیاد پر باہمی احترام اور مفاہمت پیدا کردے۔ شاید ہم لوگوں کے ذہنوں پر مذہبیت اس قدر حاوی ہے کہ ہم دنیوی مسائل کو مذہبیت سے اس طرح قطعی طور پر جدا نہیں کرسکتے جس طرح کہ ترکی جیسے ممالک نے کردیا۔ ہماری روزانہ زندگی کی تمام تفصیلات میں مذہب داخل و شامل رہتا ہے لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ مذہب کا یہ دخل ہم سے ہمدردی اور رواداری کی وہ صفات چھین لے جس کی ہر مذہب تعلیم دیتا ہے۔ ہمارے زمانہ کے ممتاز فلسفی مسٹر برٹرانڈ رسل نے یہ بتایا ہے کہ ہمارے اجتماعی جذبات میں جماعتی منافرت اور جماعتی رقابت کا جذبہ سب سے زیادہ شدید ہے اور ہندوستان کی دونوں اقوام کے درمیان اس قسم کی منافرت و رقابت کے پیدا کرنے والے اسباب

جو کچھ بھی ہوں خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا تمدنی محض یہ واقعہ کہ یہ رقابت و منافرت مذہب پر مبنی کی گئی ہے ان اسباب کو زیادہ ناقابل فہم اور شاید سب سے زیادہ المناک بنا دیتا ہے۔ تاہم اس جامعہ میں اور اس قسم کی تمام جامعات میں جن کو اس مخصوص فضا کی سعادتیں حاصل ہوتی ہیں جو ایک دارالعلوم پر محیط ہوا کرتی ہے ہم رواداری اور ہمدردی کی قدر و قیمت کا احساس اور حسد و نفرت کے زہریلے اثرات کا علم خود بھی حاصل کر سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی کرا سکتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ نے ڈھاکہ میں ان اسباق کو سیکھنے اور بجائے خود ایک مثال بن جانے کی بہت کوشش کی ہے اور آپ کا یہ طرز عمل بالکل قدرتی ہے اس لئے کہ آپ نے نہ صرف مسلمانوں کی تعلیم کو ترقی دی ہے بلکہ آپ نے کچھ اور آگے بڑھ کر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کے اسباب بھی مہیا کر دئے ہیں۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ رقیبانہ جذبات کی تلخی نے اُن لوگوں کو بھی میرا اشارہ دونوں قوموں کے افراد کی طرف ہے، جو قوم پرستی اور اتحاد کے کبھی بڑے علمبردار تھے اب اپنی مایوسی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور اس حالت میں جبکہ نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے تمام ذرائع اپنے صحیح مقصد سے ہٹا کر منافرت کے ذلیل جذبات کے پیدا کرنے اور اُن کی تشہیر کرنے میں استعمال کئے جا رہے ہیں اگر ہم کو مادر وطن کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ وفادار رہنا ہے تو ایک ایسی اسپرٹ کے پھیلنے کی ضرورت ہے جیسی کہ آپ کی اسپرٹ ہے۔ اس ملک نے جس کی خاک سے ہم سب پیدا ہوئے ہیں کسی ایک مخصوص نسل، اعتقاد یا تہذیب سے زندگی کی نمود حاصل نہیں کی۔ اُس کی تاریخ کی صفحات پر نہ صرف کسی ایک قسم کے بلکہ اُن تمام مختلف اقوام کے کارنامے بخط جلی منقوش ہیں جن کی اُس نے پرورش کی ہے اور جنھوں نے اپنے بہترین قوے کو اُس کی زیب و زینت میں صرف کیا ہے۔ ہم نے اپنے ماضی سے تزک و احتشام کی ایک وراثت پائی ہے اور اگر

آپ ایک طرف اُس شان وشوکت اور نفاست کو دیکھیں جس کے مظہر ایلورا کی سنگ تراشی اور ایجنٹا کی رنگین تصویریں ہیں اور دوسری طرف اُس حسن و رعنائی پر نظر کریں جو تاج محل کے خدوخال میں ایک مقدس یادگار کی طرح محفوظ ہے تو آپ صرف اس ایک واقعہ سے کہ یہ دونوں ایک ہی ملک میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں ایک دیرپا فیضان حاصل کرسکتے ہیں۔ درحقیقت ہم اپنی زندگی اپنے رسم ورواج اپنی گفتار و تخیل میں اُن مختلف تہذیبوں کو سمو دیتے ہیں جن سے یہ یادگاریں پیدا ہوتی ہیں۔ تو پھر کیا یہ ایک افسوسناک واقعہ نہیں ہے کہ وہی عناصر جن سے اتحاد کے جذبات کو پیدا ہونا چاہیئے اور جن کو قومی شعور کے نشوونما کا معاون ہونا چاہیئے آج افتراق اور جدائی کے جذبہ کو قوی بنانے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ مثلاً اردو اور ہندوستانی کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ اس زبان کی اصل اُن کوششوں کی یادگار ہے جو ہندو اور مسلمانوں نے ایک مشترک زبان کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے آشنا ہونے کے لئے کی تھیں۔ مگر آج وہی زبان صرف ایک فرقہ کی مخصوص زبان قرار دی جا رہی ہے اور دوسری مختلف بولیوں کے رقیبانہ دعاوی نے ایسے مباحث پیش کردئے ہیں جن میں بال کی کھال نکالی جا رہی ہے۔ ہماری زبان کی فرہنگ اور ان بولیوں کی فرہنگوں میں دور دراز زبانوں کے نامانوس الفاظ شامل کئے جا رہے ہیں تاکہ مماثلت کے بجائے اختلافات کو زیادہ نمایاں کیا جائے۔ ہماری مشترکہ تقاریب بھی جن میں ایک قوم کی خوشی اور غمی میں دوسری قوم شریک ہوا کرتی ہے اب روز بروز فرقہ واری تصادم کے مواقع بنائے جا رہے ہیں اور اسی کے ساتھ ایسی تحریکات بھی جاری ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اُن مواقع کا بھی مقاطعہ کیا جائے جہاں دونوں اقوام باہم گھلتی ہیں اور جہاں ان کی دونوں تہذیبیں گھل مل جاتی ہیں۔

آپ کو اس اجتماعی زندگی میں جو آپ کی جامعہ کی ایک مستحسن خصوصیت ہے

ایسے مواقع حاصل ہیں جو افسوس کہ بہت کم دوسرے ہندوستانی طلبار کو نصیب ہوتے ہیں۔ کہ آپ اُن تعلقات کی قوت محسوس کر سکیں جو ہم سب کو ایک ہی قومیت میں منسلک کرتے ہیں جس طرح ایک وسیع تر مطمح نظر اور قومی شعور ہم کو ایسے محدود تصور یا طبقہ واری مطالبات کے جال سے نجات دلا سکتا ہے جو ہمارے راستہ میں مزاحم ہوں اسی طرح ایک طریقہ جس سے ہم سب وسعت نظر کے ساتھ کوشش کرکے ایک وسیع قومی محاذ کے قیام میں مدد کر سکتے ہیں یہ بھی ہے کہ ہم اپنے کو تمام طبقہ واری یا "فرقہ واری" جدوجہد سے بے تعلق کرلیں۔ مثلاً ہم کو عہد کرلینا چاہیئے کہ ہم کسی ایسے ادارہ سے سروکار نہ رکھیں گے جو خالص طبقہ واری یا فرقہ واری کوششوں کا مظہر ہو۔ دوسرا طریقہ۔ اگر میں ان الفاظ میں اپنے خیالات کی توضیح کرسکوں۔ یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کی کتابوں کو "غیر فرقہ داری" بنا دیں۔ انقلاب فرانس کے بعد "عہد شاہی" کے زمانہ میں ڈیکازنے فرانس کی ضرورتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "قوم کو شاہانہ اقتدار عطا کرو اور شاہی کو قومیت کا نمائندہ بنا دو"۔ اسی طرح ہم کو چاہیئے کہ اپنی تاریخوں کو جن میں اس فوری اصلاح کی ضرورت ہے غیر فرقہ واری بنا دیں۔ آپ یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ حیدرآباد کے سررشتہ تعلیمات نے حال ہی میں مدارس کے نصاب کی پہلی تاریخی کتاب جو اسی اصول پر مرتب کی گئی ہو تیار کرکے پیش کردی ہے اور ہماری نوجوان نسلوں کے دوسرے تعلیمی مدارس کے لئے بھی سررشتہ مذکور اس کتاب کے سلسلہ میں اور بھی اسی قسم کی نصابی کتابیں جلد تیار کرنے والا ہے۔ ایک تیسرا طریقہ۔ جو شاید زیادہ ریاضت اور فرصت چاہتا ہے مگر کچھ کم موثر نہیں ہے یہ ہے کہ سائنس یا تصوف کا مطالعہ کیا جائے۔ اول الذکر استدلال اور انضباط کا ذخیرہ ہے اور مؤخر الذکر روحانیت اور مذہب کے باطنی مفہوم کا خزینہ ہے۔ اہل سائنس اور ارباب تصوف کی نظر میں تمام کائنات

یا کل بنی نوع انسان ایک ہیں معتقدات کے اختلافات اصل سائنس کی نظر میں محض ایک خارجی اہمیت رکھتے ہیں اور ارباب تصوف کے نزدیک وہ سچی روحانی بصیرت کے فقدان پر دلالت کرتے ہیں۔

ایک اور اہمیت اور نزاکت رکھنے والا مسئلہ ہندوستان کے افلاس کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو اور نیز اُن متعدد تحریکات کے معاشی مقاصد کو جو بظاہر فرقہ داری تحریکات معلوم ہوتے ہیں۔ اگر مناسب اہمیت دی جائے تو اس سے نہ صرف معاشی جھگڑوں اور خالص فرقہ داری جھگڑوں میں فرق کیا جا سکے گا بلکہ اُن معاشی اور فرقہ داری مسائل کو بھی جن سے ہم دوچار ہیں ان کی اپنی مناسب جگہ پر رکھ دیا سکے گا اگر ہماری جامعات اور ان کے تحقیقاتی شعبہ جات حیات عامہ اور فلاح قوم کے نقطہ نظر سے یہ اور ایسے ہی دوسرے مسائل اور ان کی حقیقی اہمیت کو جانچیں گے تو وہ اس تحقیق کا ایک ایسا حساب گھر بن جائیں گے۔ جہاں تجربہ اور معلومات کو یکجا کیا جا سکتا ہے اور ان کی چھان بین کی جا سکتی ہے نیز باہمی موافقت کی ایسی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں جو بحیثیت ایک قوم کے ہماری ترقی پذیر زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ امر کہ اس قسم کی ہم آہنگی ضروری ہے ہر ایسے شخص پر عیاں ہے جو آج ہندوستان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ تعمیر ملت کے کام کا ایک بڑا میدان پہلی دفعہ ہندوستانیوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ پس ہم کو چاہئے کہ ہم اُن ذمہ داریوں کے پورے احساس کے ساتھ جو ہمارے سامنے ہیں آپس میں متحد ہو کر کام شروع کریں۔

ہم آہنگی کے بہت سے کاموں میں سے ایک کام جو ہم کو کرنا ہے وہ ہماری تعلیمات کی جدید تشکیل و تعمیر ہے تاکہ ہم زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنا ساز و سامان اس طرح درست کر سکیں کہ وہ ہماری قوم کی زندگی اور ضروریات کے موافق ہو جائے۔ اس

موضوع پر تقریباً ۱۳ سال پہلے جبکہ مجھے آج کی طرح جامعہ پنجاب میں خطبہ تقسیم اسناد پڑھنے کی عزت حاصل ہوئی تھی میں نے چند تجاویز پیش کی تھیں۔ کیا میں حالیہ مباحث کے مدنظر اُس خطبہ کے چند اقتباسات پیش کر کے آپ کا تھوڑا اور وقت لے سکتا ہوں؟

اُس وقت میں نے اس امر پر زور دیا تھا کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ بجائے تین مختلف مدارج کے یعنی ابتدائی ثانوی اور جامعاتی جن میں اس وقت تعلیم منقسم ہے اور جن میں ہر درجہ کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ کے بلند تر درجہ کے لئے طالبعلم کو تیار کیا جائے "تعلیم عامہ کے تین مستقل حصے کر دیئے جائیں اور ہر حصہ اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہو، جس کا ایک معینہ مقصد ہو اور جس کے اندر اُس مقصد کے حصول کی پوری صلاحیت پیدا کر دی جائے"۔

اس طرح

"تعلیم کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ اہم منزل میں جس کو میں اصل تعلیم کے نام سے پکارنا پسند کرتا ہوں تمام ایسے مضامین شامل ہونے چاہئیں جو بنیادی اہمیت رکھتے ہوں، یعنی وہ مضامین جن کی تعلیم سلطنت کے ہر شہری کے لئے ضروری ہوتی ہے خواہ وہ کوئی بھی کاروبار، پیشہ یا تجارت اختیار کرے اور جو اُس شہری میں۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ زیادہ کارکردگی اور بہتر شہریت پیدا کر سکیں"۔ یہ نصاب اگر موزوں اساتذہ، مناسب درسی کتب اور مدارس میں کتب خانوں کا انتظام ہو تو مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر زیادہ تر موجودہ مڈل اسکول کے نصاب اور کسی قدر ہائی اسکول کے نصاب پر بھی مشتمل ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ

"یہ مدارس محض ایسے مدارس نہ ہوں جہاں صرف نصاب کی کتابیں پڑھا دی جاتی ہیں بلکہ اُن کا ایک عملی پہلو بھی ہو مثلاً زراعت، باغبانی، گھریلو صنعتیں، (اگر مدارس اضلاع میں ہوں) فنون اور پیشے (اگر مدارس شہر میں ہوں)، جو تجربہ ہم حیدرآباد

میں اس اصول پر کر رہے ہیں اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لڑکا جو کسی کاروبار کے لئے دستکاری سیکھنے میں اپنے وقت کا ایک حصّہ صرف کرتا ہے وہ اُسی مدت کے اندر جو معمولی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے مقرر ہے کس قدر زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ اس طرح ترتیب دئیے ہوئے لازمی درجہ تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد لڑکا یا تو زراعت یا کسی ایسی تجارت کو اختیار کرنے کی غرض سے (جس کے لئے یہ ابتدائی تعلیم اُس کی فنی تعلیم سمجھی جا سکتی ہو) مدرسہ کو بالکل چھوڑ دے گا یا وہ کسی ہائی اسکول میں داخل ہو جائے گا۔ ان میں سے ہر مدرسہ کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ جہانتک ضرورت ہو ہمیشہ ورانہ تعلیم مکمل اور کافی طور پر دے اور ان مدارس میں انجنیری، طب، قانون اور دفاتر حکومت کے لئے تربیت دینے والے اور تجارت و کاروبار کے مدارس بھی شامل ہونگے مگر اُن کا نصاب تعلیم اتنا طویل اور گراں خرچ نہ ہوگا جتنا کہ موجودہ فنی مدارس کا ہے۔ یہ مدارس ملک کے اور خصوصاً دیہات کے لئے ایسے ڈاکٹر انجنیر و کلا، مزارعین اور تجار وغیرہ فراہم کریں گے جو اپنی خدمات کا زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کی توقع نہ رکھتے ہوں۔ جب طلبار ان مدارس سے باہر آئیں گے تو۔

"جامعہ اُن کو اپنی سپردگی میں لے گی مگر ایسے طلبار کو چھانٹ دے گی جن کی اہلیت ناکافی ثابت ہو یا جن کا جامعہ میں داخل ہونا نامناسب ہو"

اس کے یہ معنے ہیں کہ جامعہ

"منتخبہ طلباء کی صرف ایک متعدد تعداد کی براہ راست تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کرے گی۔ یہ تعداد نہ صرف بہ اعتبار اُس قابلیت کے جو طلبار یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کو اختیار کرنے کی رکھتے ہوں۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی محدود ہو گی کہ ملک کی تخمینی ضروریات کے لئے کتنے اشخاص کافی ہوں گے۔ اس طرح جامعہ کی وہ سرگرمیاں جس کو میں تحتانی سرگرمیاں کہتا ہوں۔ زیادہ آسان اور مختصر رہ جائیں گی اور اس

طرح اُس کو اعلیٰ تر سرگرمیوں کے لئے زیادہ آزادی مل جائے گی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس طرح جامعہ کو علمی تحقیقات اور کسی علم میں خصوصی مہارت کے لئے طلبا کو تیار کرنے، نیز ایسے تعلیمی اور متعلقہ مسائل کی تحقیقات کرنے، ان کو حل کرنے اور اُن پر غور وفکر کرنے کا زیادہ موقعہ ملے گا جو ہر متمدن ملک میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں اور بعض اوقات سیاسی مسائل کی طرح نازک صورت اختیار کر لیتے ہیں اور جن کو اُن اہل علم کی خاموش اور غیر جانب دار قوت فیصلہ ہی بہترین طریقہ پر حل کر سکتی ہے جو نسلی یا فرقہ داری یا دفتری یا سیاسی آلودگی کے شبہ سے پاک اور آزاد فضا میں کام کرتے ہوں۔

ان تجاویز کا جن میں ابتدائی مدارج ہی سے پیشہ ورانہ تعلیم کا رجحان شامل ہو اور جن کے مطابق حیدرآباد کا طریقۂ تعلیم از سرِ نو منظم کیا جا رہا ہے، آخر کار یہ نتیجہ نکلے گا کہ ہمارا نظام تعلیم ہمارے اصل ملک کی ضرورتوں کے مطابق ہو جائے گا اور اس طرح بیروزگاروں کی تعداد کو گھٹا دے گا جس کا بڑھنا اُس صورت میں بالکل قرین قیاس ہے جبکہ ہمارا طریقہ تعلیم ہماری معاشیات کے حقایق سے اتنا ہی بے تعلق رہے جتنا کہ آج ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ سوائے اُن پابندیوں کے جو مناسبت اور ضرورت کے لحاظ سے عاید کی جائیں اُن لوگوں کے راستہ میں کوئی رکاوٹ پیدا کی جائے جو ادبیات یا اُن آزاد علوم کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں جن سے بڑی حد تک انسانوں کے اندر تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ جدید طریقہ تعلیم جس چیز کا واقعی انسداد کرتا ہے وہ اُس افسوسناک صورت حال کی تکرار ہے جبکہ ایسے نوجوانوں کے جم غفیر کو جو جامعاتی تعلیم کے لئے بالکل نااہل ہوتے ہیں صرف اس امید میں یونیورسٹی میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ بلکہ اُن کو داخل ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ اُن کو کوئی ادنیٰ منشی کی جگہ یا چھوٹی سی نوکری مل جائے گی۔ آپ کی یونیورسٹی کی چہار دیواری سے یقیناً ایسے لوگ نکلیں گے جو مستقبل میں تعلیمی تشکیل کی مختلف شاخوں کے اندر نہ صرف علمی بلکہ رہنمایانہ حصہ

لیں گے اور یہی توقع اُن جامعات سے بھی کی جاسکتی ہے جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں کام کر رہی ہیں۔ پس زیادہ تر اب یہ آپ ہی کا کام ہے کہ آپ ہمارے مستقبل کے لئے تعلیمی نقشے بنائیں تاکہ تعلیم عامہ کو جہاں تک ممکن ہو آپ کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جاسکے۔

میں ابھی آپ سے اپنا یہ خیال عرض کر چکا ہوں کہ تاریخ کی کتابوں کو "غیر فرقہ دارانہ" بنانے کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت ظاہر ہے کہ جو خیال دل میں گزر رہا ہے اسے باواز بلند ادا کر رہا ہوں لیکن اسی سلسلہ تفکر میں میں ایک اور تجویز بھی پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں جسے آپ خواہ کسی قابل بھی سمجھیں۔ آپ میں سے بہت سے اصحاب نے بلاشبہ اُس تجویز کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہوگا جو مسٹر ا۔ کے جی ویلیز نے ایک ایسی عالمگیر قاموس العلوم تیار کرنے کی ضرورت کے متعلق پیش کی ہے جو علم کی تمام شاخوں کا ایسا لب لباب ہو جس میں تمام معلومات "تازہ ترین" رکھی جائیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک ایسی بلند حوصلہ تجویز ہمارے زمانہ میں عملی صورت اختیار کر سکے گی یا نہیں لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ اگر اس قسم کی کسی تجویز کو ہمارے ملک کے لئے ذرا چھوٹے پیمانہ پر عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ اپنے اندر ہمارے لئے حقیقی اور پائیدار افادیت رکھے گی ہندوستان کے جامعات کے تعاون کا یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی ایک ایسی ہندوستانی قاموس العلوم مرتب ہو جائے جس کی ترتیب کا مقصد تو وہی ہو گو اس کا طریقہ مسٹر ویلز کے مجوزہ اصول کے مطابق نہ ہو یا ایک اس قسم کی ایسی تالیف جس میں ہندوستان کے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع کی جائے اور عام فائدہ کے لئے پیش کیا جاسکے نہ صرف زیادہ اور صحیح تر معلومات ہی بہم پہنچائے گی بلکہ مجھے یقین ہے کہ قومی حیثیت سے ہمارے احساس وحدت کو، نیز ہماری اُن ذمہ داریوں کے احساس کو جو ملک کے متعلق اور ایک دوسرے کے متعلق ہم پر عاید ہوتی ہیں تقویت بخشے گی۔

اب ایک آخری لفظ اپنے اُن نوجوان دوستوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ خواہ وہ اس جامعہ کے گریجویٹ ہوں یا انڈر گریجویٹ۔ جن کو ابھی اپنی زندگی کا بڑا حصّہ دنیا میں بسر کرنا ہے۔ شاید تاریخ کے کسی دور میں، اس ملک کی کسی نسل کے سامنے اتنا بڑا کام اور اُس کی تکمیل کے ایسے مواقع موجود نہیں ہوئے جیسے کہ آج ہیں جس طرف بھی تم نظر ڈالو وہ مواقع موجود ہیں بشرطیکہ وہ مردانگی بھی موجود ہو جو اس کام کے کرنے کے لئے ضروری ہے۔ خدا کرے کہ تم، میرے نوجوان دوستو! اس کام کی وسعت کو سمجھ لو جو تمھارے کرنے کا کام ہے اور اُس مستقبل کا اندازہ بھی کر سکو جس کی تم نہ صرف اپنے لئے بلکہ بحیثیت مجموعی تمام قوم کے لئے تعمیر کر سکتے ہو۔

شکوۂ مزدور

از

محمد علی خاں صاحب متعلم فورتھ فارم عثمانیہ کالج اورنگ آباد

دل میں جو درد نہاں ہے وہ بتاتا ہوں میں
آج دل کھول کے افسانہ سناتا ہوں میں
دیکھ لو، خون جگر آج بہاتا ہوں میں
غم و اندوہ کا ایک باغ لگاتا ہوں میں
درد اٹھتا ہے کلیجہ کو مسلنے کے لئے
مضطرب اشک ہیں، آنکھوں سے ابلنے کے لئے

میرے ہی دستِ مشقت نے بنائی دنیا
میری ہی قوت بازو نے دکھائی دنیا
میں نے ہی دوش پہ ہمت کے اٹھائی دنیا
چمن حسن کے غنچوں سے سجائی دنیا
میرے ہی فیض سے تو سب کے یہ گھر بار ہوئے
گنج الفت سے میرے پھول بھی زردار ہوئے

سارے عالم کے لئے رنج اٹھائے میں نے
ان کی نزہت کے لئے باغ لگائے میں نے
ایک سے ایک حسیں شہر بسائے میں نے
قصر و ایواں تہہ افلاک بنائے میں نے
اے زمیں میں نے کیا روکش افلاک تجھے
مہر و مہ سے کہیں بالا کیا اے خاک تجھے

تجھ کو معلوم ہے کچھ کیا تھی حقیقت تیری
کوہ و صحرا میں تھی ہے یاد سکونت تیری
میری کوشش نے بدل دی ہے یہ حالت تیری
آج پہچانی نہیں جاتی ہے صورت تیری
کیوں نظر آتے نہیں آج ترے غار کہیں
ہیں کہیں قصر تو ہیں کوچہ و بازار کہیں

کہدے انصاف سے اعجاز دکھائے کس نے — دامن مصر پہ اہرام بنائے کس نے
صفحۂ روم پہ مینار اُٹھائے کس نے — اور پیرس میں یہ بازار سجائے کس نے
کس نے تعمیر کیا آگرہ کا تاج محل
کس کی محنت کے ثمر ہیں یہ ترے راج محل

میرے بازو کی جو قوت سے ہوں تعمیر مکاں — ملکیت غیر کی ہو جائیں خدا کی ہے یہ شاں
جھونپڑا بھی نہ میسر ہو بسے مجھے بھرا ماں — کوئی موسم ہو مگر میرے لئے ہے یکساں
سردی گرمی ہو کہ برسات خزاں ہو کہ بہار
ہے مرے واسطے بس سایۂ چرخ دوار

میری محنت سے جو تیار ہو زریں پوشاک — غیر بن جائیں پہنکر میرے حق میں ضحّاک
عقل ہے ان کی کدھر اور کہاں ہے ادراک — ظلم اور مجھ پہ روا رکھتے ہیں ظالم سفاک
اک لنگوٹی نہ ملے مجھ کو بصد رنج و محن
اور مر جاؤں تو چندے سے ملے گور و کفن

درد و غم۔ رنج و الم۔ آفت و شر میرے لئے — حسرت و یاس و قلق سوز جگر میرے لئے
جلنا کڑھنا ہے بس اک شام و سحر میرے لئے — نہ یہ دنیا ہے مری اور نہ زر میرے لئے
راحت و عیش کی منزل سے بہت دور ہوں میں
اور یہ سب اس لئے جائز ہے کہ مزدور ہوں میں

میرے افلاس کا معلوم ہے سب کو عالم — میرے مہمان ہیں رنج و غم و حرمان و الم
غیر آرام سے ہر چیز کو لے کر باہم — صبر کرنے کا سبق دیتے ہیں مجھ کو ہر دم
میری محنت کے نتیجہ پہ ہیں اتنے شیدا
یہ نہیں جانتے ہر چیز ہے مجھ سے پیدا

۳۳

پھر وہی برکھارت

از

جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب ایم۔اے لکچرر تاریخ کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد

دنیا نئے سانچے میں ڈھل گئی۔ ڈاکٹر شاخت رائش بینک کے پردھان نہ رہے، یاجوج وماجوج کی فوجوں کا ٹڈی دل سدِ سکندری پھاند ہینکو کے سرہانے پہنچ گیا، مغربی دنیا نے کروٹ لی اور بھانت بھانت کے آمرین و آذنین انسانی خون میں ہولی کھیلنے کے لئے پینترے کاٹنے لگے۔ تسخیر قدرت سے سرشار انسان یلغار کرتا ہوا فضا کی لطیف لہروں کے ذریعہ ہزاروں میلوں سے نغمہ آرہا ہوا۔ ریل گاڑیاں رفتار واسرع میں طیاروں کے دوش بدوش چلنے لگیں اور تو اور ہندوستانی مجالسِ آئینی میں ہریجنوں کے لئے نشستیں محفوظ ہوئیں حتیٰ کہ آسٹریلوی کرکٹ کا سینا پتی ڈان بڑیڈمین یارک شائر کے سورما ہٹن کے سامنے جھک گیا، المختصر طبع قدرت کی نرالی جولانیوں، انوکھے جوبن اور ابھرتے ہوئے ولولوں میں ایک ترنّم بروئے کار نظر آنے لگا۔ یوں کیوں نہ کہو کہ دھرتی نے نیا بھروپ بھرا۔ مگر اللہ رے پاس وضع! یہ نظامِ شمسی اپنی قدامت میں مگن ہے۔ وہی سردی، وہی بہار، وہی گرمی اور وہی برسات اور ہاں وہی خزاں۔ اس نظام کے توصد سے تو دنیا کا جی کچھ اچاٹ سا ہو چلا ہے۔ کاش بارش کے بعد تابستان کا آغاز ہو اور چلچلاتی دھوپوں کے بعد فوراً کڑکڑاتا جاڑا پڑے۔ آج رات میں پنکھا جھلا جا رہا ہو تو کل دن میں آگ تاپنی پڑے، جب ایسا ہوگا تب ہی کہیں انسان کی تغیر پسندی کی تمنائیں بر آئیں گی۔ ایک ہفتہ مہاتما سوریا کیلی فورنیا سے براجماں ہوں تو دوسرے اٹھواڑے آئرلینڈ سے آنکھ دکھائیں اور تیسرے عشرے پیٹھ گونیا مشرق کہلائے۔

اگر یہ بوقلمونیاں انسان کے قبضۂ قدرت میں آجائیں تو کیا آنند رہے۔ مزا تب آئے جب ٹمبکٹو میں عین چیت بیساکھ میں سائبریا کی برف بدوش صبائیں موسم بہار کا سہاگ گائیں۔

ابھی تو ہم اپنے تئیں بے بس پاکر اور صرف نظر بہ پر قناعت کرکے چپ ہو لیتے ہیں مگر یہ امر ممتنع نہیں کہ دو لاکھ سال بعد کوئی مارکونی یا ایڈیسن ایسا کر پائے۔ اچھا اگر ایسا انفاق سے ممکن ہوا بھی تو اس وقت کے آمرین کیا چندرما پر دھاوا بولتے وقت ایتھر کے بم برسائیں گے، مشکل سوال ہے۔ فی الواقع ہمارے لئے بڑی تشویش کا مقام ہے اور ہم کو ابھی سے سوچ لینا چاہیئے کہ اس وقت کیا ہوگا۔ کیا اس وقت جنگ چندرما کے کوہستانوں میں ہوگی یا قمر و ارض کی فضائے مابین میں وقوع میں آئے گی۔ ہرچہ بادا باد! خوب لطف رہے گا۔ اتنے بعید مستقبل پر تجسس کرنے میں ہمیں لذّت حاصل ہوتی ہے تو اس سے مستفید ہونے والے کتنے اونچے بھاگوں والے ہوں گے۔ مگر یہ کوئی رشک کی بات نہیں۔ آخر ہوں گے تو انسان اور ہماری ہی نسل سے کہلائیں گے۔

یہ ہمارا وہم تھا کہ شاید ان تغیرات و انقلابات پر تفحص کرنے سے موجودہ موسم متاثر ہو جائے گا اور تپشیا سے کچھ تو فرق نظر آئے گا مگر نہیں ہرگز نہیں کس قدر بھلائی کی بات ہو کہ رات بھر ترشح ہوا کرے، صبح ہوتے ہی کھل جائے، لوگ اپنے کام کاج سے لگ جائیں اور اس کشمکشِ روزگار میں کچھ کما کھائیں۔ کیسا اچھا ہو کہ ادھر مغرب کی اذان ہوئی اور مندر میں ناقوس بجا اور جھٹ پٹ لکّہ ہائے ابر سمٹ سمٹا فضا پر محیط ہو گئے، محنت کش لوگ خوب تان کر سوئے۔ پسینہ و تھکان سے نجات پائی اور رن بھر کے افادۂ مختتم کے لئے پابرکاب ہو گئے۔ اچھا یوں نہیں تو مقررہ وقت پر برس لیا کرے اور بقیہ وقت انسانوں کے تصرف میں رہے۔ یہ بھی نہ سہی، ہم سے

برستے وقت استمزاج تو کر لیا کرے۔ کچھ تو مفاہمت ہو۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ کسان کھیت میں شرابور ہو رہا ہے۔ مدرسے کے لڑکے جماعتیں بدلتے وقت کیچڑ میں لت پت ہوئے جاتے ہیں، دکاندار ہیں کہ گاہکوں کے لئے ترستے ہیں۔ ڈاک کے ہرکارے ہیں کہ چھتوں کی آڑ لئے کھڑے ہیں۔ یہ دیوار گری وہ مکان زمین پر آ رہا، دیکھتے دیکھتے دکان کا چبوترہ سڑک پر ملبہ بنا رکھا ہے۔ چندہ وصول کرنے والوں کے رجسٹر بھیگ رہے ہیں اور کیا کیا نہیں ہوتا۔ یہ تو کچھ ٹھیک نہیں۔ خیر ہمارا بدلہ آنے والی نسلیں لیں گی۔

شروع شروع میں جھما جھم بارش کیا لطف دیتی ہے، جی چاہنے لگتا ہے کہ فوراً اس پر سے بحیرۂ عرب کا کا ٹھیاواڑی نمک نچھاور کیا جائے۔ قوسِ قزح کی بلائیں لی جائیں، اور ننھی پھوار کی نظر اُتاری جائے۔ سبحان اللہ! ماشاء اللہ! برسات کی رسیلی سنوریا کا جوبن آنکھوں میں کُھپتا چلا جاتا ہے مگر جوں ہی دامن سحاب سمٹ کر نذرِ افق ہوا اور چرخ نیلوفری پر سے شاعری کا غلاف اترا تو وہ بے کیفی محصور کر لیتی ہے جسے خوجی نثر میں بھی بیان کرنا ممکن نہیں۔ پسینہ کا وہ عالم ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ انسان بے خیالی میں یہ چاہنے لگتا ہے کہ کھال کو اتار کر الگنی پر دھوپ کھانے کے لئے لٹکا دے۔ بمشقت ایمان، کسان مارے گرمی کے نتھنوں سے پھُوں کرنے لگتا ہے۔ شہریوں کا کیا پوچھنا! وہاں تو یہ سوال زیرِ بحث آ جاتا ہے کہ تنفس کا التواء ممکن ہے یا نہیں۔ پہلے جھکڑ سے تو گرد و غبار سہم سا جاتا ہے مگر اس کے بعد جو انتقام پر اترتا ہے تو اپنے جلو میں برسات کی نئی مخلوق کا لشکرِ جرار لئے ہوئے انسان آباد پر ایسا حملہ بولتا ہے کہ سیزر و سکندر کا دل دہل جائے۔

پسّو سے لے کر مینڈک تک برسات کی ایک ایسی صف آرا سپاہ ہے جس کی اجتماع آرائی مطالعہ چاہتی ہے۔ ان مینڈک میاں کو دیکھئے۔ اٹھتے بیٹھتے پاؤں کے نیچے سے پھسلے جاتے ہیں کبھی پھدک کر عین دسترخوان پر مہمان بن بیٹھتے ہیں اور

اس پر جناب کا حسن، چندے آفتاب، چندے ماہتاب، کیا سڈول جسم ہے اور کیا متناسب اعضا پائے ہیں۔ اس پر یہ گھورنا ملاحظہ ہو گویا مسولینی پیلازو وینیزیا میں فیچسٹ گرانڈ کونسل کے سامنے اظہار تبختر فرما رہے ہیں۔ فضا، کی پہلی ٹھنڈک کے کفارے میں یہ سب نخرے اور غمزے سہے جا سکتے ہیں مگر یہ شب بیداری تو جور و تعدی کے لگ بھگ پہنچ جاتی ہے۔ ایک ہی آواز میں تدھم، پنچم، ایک ہی الاپ میں شام کلیان، باگیسری، ویش و آسا کا جوار بھاٹا جمع ہے۔ پھیپھڑوں کے عضلات معلوم نہیں پلاٹینم کے بنے ہیں کہ پیہم تناؤ و کھنچاؤ سے جنبش تک نہیں ہوتی تعجب کا مقام۔ کہ تمام وہ اطبائے مشرق و مغرب جو دق و سل کے خلاف جہاد فرماتے پھر رہے ہیں مینڈک کے پھیپھڑوں سے انجکشن کا آمینو کیوں نہیں تیار کرتے؟ قیاس مقتضی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو رتی اس مائع کے خون میں داخل ہونے سے جملہ جراثیم دق وفات پا جائیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ شش میں انشقاق کی صورت بھی پیدا ہو گئی تو فوراً انی جھلی مرتب ہو جائے گی۔ آزماتے ہیں کوئی ہرج کی بات نہیں ڈاکٹر Voroloff وورولاف کے ادارۂ احیائے غدود کی خدمت میں بہ صد ادب پرارتھنا ہے۔ کہ غدود بوزنہ کے ہمراہ ایک معمل مینڈک کے پھیپھڑوں اور گلے کے مشتملات کے تجارب کے لئے تعمیر ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس نئی رسائن کو مستند طور پر آزمایا جا سکے۔ اگر ہمارے وید بجائے کشتۂ ابرک کے شش کا بھسم تیار کر کے کوے کے بھیجے میں محلول کریں اور اس جدید نوشدارو کا استعمال صرف سات دن کرائیں تو ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ Anti-Tuberculosis Fund میں ہاتھ بٹانے کی ضرورت نہ رہے گی بہتر ہے کہ جو رقم اس سلسلے میں جمع ہوئی ہیں ان سے سکھ براج کے برابر ناگپور کے اسمبلی ہال سے ملحقہ ایک جھیل محفوظہ سرکار مرکزی بنائی جائے۔ تاکہ مینڈکوں کے اس یوٹوپیا سے ناگپور کا مزاجی شور و غوغا متاثر ہو۔ اس میں سی پی کے

رہنماؤں سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا۔ ممکن ہے اکاون انچاس کی ٹکر سے یہ مسئلہ طے ہو جائے۔

مینڈک کی نوع تو ارتقائے حیات کا انمول جواہر پارہ ہے۔ کڑی سے کڑی ملا کر تدقیق کرتے چلے جائیے کیسا کیسا جیو دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے میں آتا ہے سانپ، بچھو، کنکھجورا، کھٹمل کیڑا، کیچوا، کمہار، گرگٹ، چھپکلی اور اسی قبیل کی دوسری رینگنے والی مخلوق اپنے اپنے امتیازاتِ خصوصی سے مالا مال ہے۔

ذرا اس کھٹمل کیڑے کو دیکھئے، ایک دریا کھیان کے لئے اچھا خاصہ موضوع ہے۔ کیا صبا پا ہیں، کمرے کا عرض ناپنے میں جنات کو جتنی دیر لگتی ہے اتنے عرصے میں آہوئے ختن کا شعر پہنچ جائے مگر آنکھ بچی تو آپ ان کو اپنے کوٹ کی آستین میں دیکھ لیجئے ازار بند سے منسلک پائیے، لحاف کے سنجاف میں سلا ہوا ملاحظہ فرمایئے اور جہاں آپ نے غفلت کی اور اُس سے معانقہ کا موقع ملا تو وہ قیامت ڈہاتا ہے کہ الامان والحفیظ، جب تک جناب کے معطیات یعنی بال و پر کو ایسے نہ چنا جائے۔ جیسے کسی ملک میں صیہونی چنے گئے ہیں تو جلن گھنٹوں تک ہائے وائے پکارتی رہتی ہے۔ اور اگر ستیہ گرہ کے دوران میں آپ نے ان سے سہوًا پائمالی روا رکھی تو پھر ایک آدھ ہفتے کے لئے اس عضوِ بدن کو جزو بیفک بنانا پڑتا ہے۔

ذرا اس عقرب کی چھوٹی سی جان پر نظر ڈالئے، کیا مرتکز غیض وغضب پایا ہے۔ ہر زاویہ میں بُغض و انتقام کے جذبات کارفرما ہیں۔ چند حضرات نے بعد از تشکیک و تحقیق یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فینیفسی زبان میں بچھو اور بغض للّہی کے لئے ایک ہی لفظ ہے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ افعی بھی اس وقت تک نہیں کاٹتا جب تک کہ اس کے لئے وجہِ آزار نہ ہو مگر اس آشر کو دیکھئے کہ اگر ڈنک مارنے کو انسان کی کھال نہیں جڑتی تو بے ضرر ہوا میں ڈنک کی پرکار سے دائرے کھینچنے لگتا ہے۔ برسات کی یہ مخلوق

تو آپ اپنی مثال ہے۔

گرانقدر ورا برسات کی اور نیرنگیاں ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے دامن میں کیسے کیسے موتی بھرے لاتی ہے۔ کھٹمل، مچھر، پسّو اور اسی خاندان کے کیسے کیسے سورما مسلح ہوکر فضا پر قبضہ جماتے ہیں۔ ذرا اس مختصر سپاہی پتنگے کو لیجئے (معلوم نہیں کیتھرائن آف برسیگنزا کے جہیز میں یہ بھی بمبئی کے ضمن میں آیا تھا) جناب تو نظر نا آشنا ہیں ادھر چراغ میں بتی پڑی اور لو چڑھی اور انہوں نے کاوے کاٹنے شروع کئے۔

خیر اس حد تک غنیمت تھا اور کوئی ہرج نہ تھا کہ آپ انسانوں کے درخشاں انکشاف کا اعتراف کرتے ہوئے شمع پر سے تصدق ہوں مگر یہ کہاں کا شعلۂ عشق ہے کہ غریب انسانوں کی گردن پر سوار ہوں اور اگر وہ بیزار ہو کر آپ سے انقطاعِ تعلق کا اظہار کرتے ہوئے ہاتھ ہلائیں تو لعابِ دہن کی پچکاری چھوڑتے جائیں۔ یہ باج تو شمع کو مبارک ہو مگر یہاں تو تھوڑی سی کھال اور کبھی کبھی چربی کی ایک تہ بھی ان چھالوں کی نذر کرنی پڑتی ہے۔

بھیّا مچھر کا کیا کہنا، ادھر پہلا پانی برسا اور اُدھر دنیائے پشّہ نے اپنی کمین گاہوں سے نکل، کیل کانٹے سے لیس ہو کر غریب منش پر دھاوا بول دیا۔ ادھر شام ہوئی اور انھوں نے زنّاٹا بھرا، آنِ واحد میں انسانی کھال کا ہر عریاں جزو آپ کی تیراندازی کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ ہزار روغن زیتون رگڑو، کھال کو مچھر پروف بناؤ، تلسی اگاؤ، مکان کو جھاڑنے جھٹکنے۔ فرش اور دیواریں چھیل ڈالو۔ سب ہیچ۔ ادھر لیلائے شب نے انسان کو اپنے آغوشِ خواب میں لینا چاہا ادھر اس لشکر بیکراں نے شبخون مارنا شروع کیا۔ طبلِ جنگ بھی بج رہا ہے اور تیر و تفنگ بھی چل رہے ہیں۔ اگر ایک لاکھ میں سے ایک کو فلٹ میسر آیا تو اس سے ننانوے ہزار نو سو ننانوے تو اس زد سے نہیں بچ سکتے۔ اور مچھر دان کتنوں کو جڑتا ہے جو اس قلعہ میں مصئون رہ کر شب باشی

کر سکیں اور اگر ان محصورین میں سے کسی نے سوتے میں خواب میں کسی سے جنگ کرتے ہوئے ہاتھ باہر نکالا تو اس پر وہ یورش ہوتی ہے کہ چند ساعتوں میں ہاتھ مفلوج ہونے لگتا ہے۔ ہماری بھی کیا بے بضاعتی و بے بسی ہے کہ اس ضعیف الجثہ ہستی کے حملوں کا اندفاع نہیں کر سکتے۔ یہ امر تسلیم کہ مختلف صوبہ داری حکومتوں نے مچھروں کی قدامت پرستی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور ان رگنت اداروں میں حب انسان کا بے پناہ جذبہ ابھر آیا ہے مگر بے سود و بے نتیجہ مچھروں کی دنیا میں خفیف سا ہیجان بھی برپا نہیں ہوا۔

مناسب ہوگا اگر لیگ آف نیشن۔ تعمیری تو نہیں خیر اپنے تخریبی لائحہ عمل میں مچھر کے خلاف جہاد کو شریک کرے۔ ممکن ہے پھر اس فوجِ طیران سے سمجھوتا ہو سکے اور اس سے لیگ کا وقار بھی مستحکم ہو جائے۔ یہ قرینِ استدلال ہے کہ معاشی مقاطعہ سے مچھر گھبرا جائیں گے اور اگر اس میں بھی ناکامی ہوئی تو بہترین حل یہی ہے کہ مرّیخ کو انسانی نوآبادی قرار دیا جائے اور اس دھرتی کو آمرین اور مچھروں کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ آپس میں لڑ بھڑ کر کچھ فیصلہ کر لیں گے۔ کوشش انسان پر فرض ہے۔ مَنْ جَدَّ وَجَدَ۔

ذرا کھٹمل کی دنیا کی بھی سیر ہو جائے۔ ابر آنا شرط ہے اور یہ مردم خوار آدم بو آدم بو پکارنے لگے۔ اب مچھر دان لگائیے، فلٹ کیجئے، گھر بھر میں فینائل بکھیر بیٹھئے سونے کے کمرے کو آپریشن ہال بنا لیجئے مگر اس سے استحفاظ ممکن نہیں۔ ادھر چراغ بڑھایا اور یہ ملعون چارپائی کی چولوں سے، دروازوں کی درزوں سے، چوکھٹوں کے آشیانوں سے، گدوں کی شکنوں سے، تکیوں کے غلافوں کی سیونوں کے پیچوں سے، آپ کی قمیص کے کالر کی تہ سے، ازار بند کی جھالر سے اور در وغ برگردنِ راوی فربہ اندا موں کے جلدی سلوٹوں سے ابل پڑتے

ہیں اور وہ خون چوستے ہیں کہ اگر کھٹمل خوردہ انسان تعمیری غذائیں استعمال نہ کریں تو ہر برسات میں کئی پونڈ گھٹ جائیں۔ ستم ظریفی دیکھئے۔ دانتوں کی آری چلائی، اپنی بساط بھر ایک گھونٹ بھرا اور چپکے سے کسی فصیل کی آڑ لے لی۔ انسان بلبلا کے اٹھا اور جب تک بتی سلگائے یہ مفرور ہو کر اپنے بُرج میں پہنچ گئے۔ ماشاء اللہ دوڑ بھی خوب پائی ہے اور جسم میں وہ روباہی لوچ ہے کہ چٹکی سے بتیس داؤں چل کر بچ نکلتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آخر شکار پنجے میں آیا مگر جب قتل کے ارادے سے چٹکی وا کرتے ہیں تو بجائے حریف کے صرف آکسیجن و نائٹروجن کاربن ڈائی اکسائڈ کے ضمن میں ایک بھینی بھینی سی شامہ آزما بو آتی ہے اور اگر برہمی کے عالم میں کسی انسان بھائی نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے اتحادِ عمل سے غنیم پر بشدت سے وار کیا بھی تو بارہا ایسا ہوا ہے کہ دونوں انگلیوں میں آپس ہی میں چل گئی اور دونوں میں سے ایک دوسری کے اسلحۂ پیشین یعنی ناخن سے مجروح ہو گئی۔ ورنہ سوزنی کا تاگا کھنچ آیا۔ اس سب پر طرفہ یہ کہ ظالم ایسے کثیر العیال ہوتے ہیں کہ ایک مہینہ اگر کہیں بس گئے تو ذریات کا شمار کرنے کے لئے تنقیح سازوں اور محاسبوں کی اچھی خاصی فوج رکھنی پڑے۔ ایک صاحب نے ایک مرتبہ تحریک کی تھی کہ چینیوں کو چاہیئے کہ وہ فاتح جاپانیوں کی فوج میں صرف دس کھٹمل چھوڑ دیں۔ جاپانی خود بخود زچ ہو کر اپنے قدیم و جدید مقبوضات حتیٰ کہ کوریا سے بھی دست بردار ہو جائیں گے اور تین تین ہفتے فارموسا کے قرنطینیہ میں بسر کر کے اور ڈس انفیکٹ ہو کر ٹوکیو کی جانب قدم اٹھائیں گے۔ ہم بھی اپنے تجربہ کی بنا پر اس تحریک کی صمیم قلب سے تائید کرتے ہیں۔

پسّو کو کون نہیں جانتا! کیا پٹے باز ہے۔ اپنا بلّم جسدِ انسانی پر آزما کر ایسا چھو ہوتا ہے گویا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ ادھر مظلوم کھال ہے کہ روئیں روئیں سے

ہیل سلاسی کی طرح صدائے مظلومیت بلند کر رہی ہے اور اس کے بعد یہ قزاق ایسی آڑ لیتا ہے کہ آپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ اپنے بستر کے جملہ سواد و نواح کا جائزہ لے ڈالئے اس کی کہیں ہوا نہیں ملتی اور اگر بڑی محنت و ریاضت کے بعد کامیابی ہوئی بھی اور دو انگشتی اتحادی جال میں یہ حریف پھنس بھی گیا تو کیا آپ کی تمام مجاہدانہ مساعی اس کی ارتھی اُٹھا سکتی ہیں؟ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ آپ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیجئے حتیٰ کہ آپ کے فرقِ مبارک سے عرقِ جہاد مترشح ہونے لگے اور سانس اکھڑنے تک کی نوبت آجائے اور آپ کا یہ ایمان ہو جائے کہ اس فرسا و دار اعصاب آزمائی کا خوشگوار نتیجہ پسو کے سانحہ ارتحال میں نظر آئے گا مگر یہ محض سراب ہی ہوگا۔ ادھر آپ نے از خود رفتہ انگلیوں کو ایک دوسرے کے چنگل سے چھڑایا، ادھر چھوٹے جانی نے چوکڑی بھری اور یہ جا وہ جا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے آپ ہیں کہ غواصِ بحرِ خجالت ہیں اور اپنی بے بسی پر ایمان لا رہے ہیں اور ادھر وہ آپ کی تحمیق و تضحیک میں مصروف ہے۔ جہاں ان پسوؤں کے مواسات نہایت وسیع ہیں۔

وہاں انسان کی مجبوری پر مرثیہ لکھئے۔ رات میں ململ کی بند کفنیاں تیار کر کے اس میں خود داخل ہو جاتے ہیں اور اندر سے گرہ دے لیتے ہیں۔ پسو خیر اس فصیلِ پارچہ میں شگاف تو پیدا نہیں کر سکتا مگر انسان کی بے بضاعتی پر ایک قہقہہ ضرور اُڑاتا ہے۔

کھٹمل کی برادری میں ایک کیڑا ہے جسے عوام کالانعام کھٹمل کی نانی کہتے ہیں مگر ہم لکھوں پڑھوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں یہی زیب دیتا ہے کہ اسے کھٹمل کی والدہ محترمہ کی امتہ المخدومہ کے اسم گرامی سے موسوم کریں۔ جنابہ کا ڈیل ڈول دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے یا وگیر کے پھندنے میں ایک گرہ دبی رکھی ہے مگر دامن میں وہ لونڈر لبا ہے کہ شال کی تو ہین نہیں اُٹھا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی کھٹملوں کی ایک رجمنٹ میمنہ میسرہ و قلب سنبھالے مارچ پاسٹ کر رہی ہے۔ جو اس نامعروف جیوکے ہتھکنڈوں سے

واقف نہیں وہ جان لیں کہ حضرتہ کے حلقوم مبارک میں اچھی خاصی آری نصب شدہ ہے۔ کھٹمل کا کاٹا گھنٹہ دو گھنٹے سہلانا پڑتا ہے۔ مگر آپ کے عطا کردہ بوسے سے تین چار دن تک کھال بے چین رہتی ہے اور مفتوح ہو کر فاتح کے سیاہ رنگ میں رنگی جاتی ہے۔

ہم ہر لمحہ اعلانِ تشکر و امتنان کرنے کے لئے تیار ہیں اگر کوئی محقق یہ بتادیں کہ وہ کون ذاتِ شریف ہیں جن کے تبسم سے انسانی جسم پر گٹھلیاں آجاتی ہیں اور بڑے مزے کی کھجلی ہوتی ہے۔ اگر مصلحت اجازت دے تو یہ جی چاہتا ہے کہ انسان ایک دو دن کی رخصت لے کر اس گرہ کے کھجانے میں لذت لیا کرے۔ میری یہ دلی آرزو ہے کہ جو صاحب اس ہستی کا انکشاف فرمائیں انہیں نوبل پرائز کا مستحق ٹھیرایا جائے۔ فی الواقع دنیا کے تمتعات میں انقلاب داخل ہو جائے گا۔

خیر یہ تو عصر برشکالی کے زعماء میں سے ہیں۔ قشونِ قاہرہ میں تو متعدد نسلیں شریک ہیں۔ اسفل بھنگے سے لے کر ارفع سنپرٹڈے تک سینکڑوں انواع ہیں جن کا مطالعہ ہم حیاتیات داں کے سپرد کئے دیتے ہیں۔

اور ذرا برسات پر ایک اور اعتبار سے نظر ڈالتے ہیں۔

اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستاں
زیب دیتا ہے اگر کہتے ہیں تجھے سارا جہاں

ہمارا ملک کیا ہے دنیا کے مختلف ممالک کا نچوڑ ہے ماؤنٹ ایورسٹ بھی یہیں جہاں انسان کی سانس جم جائے اور جیکب آباد بھی یہیں جہاں خون گیس بن کر اڑ جائے۔ زرد فام بے بینی لدّاخی یہیں اور جنوبی ہندوستان کا کالا معشوق بھی یہیں جس کے پسینے سے سیاہی تیار۔ ہاتھی، شیر، گینڈا اور مگرمچھ یہیں جن کا ذکر دوسرے ممالک کے قہوہ خانوں میں بڑی طرّم خانیوں سے کیا جاتا ہے۔ خطرہ جو آفریدی بھی یہیں اور بجلی کی چمک سے لحاف اوڑھنے والا...... بھی یہیں۔ کتا بھی یہیں اور

کونیں بھی یہیں۔ گولکنڈہ کا ہیرا بھی یہیں اور رانی گنج کا کوئلہ بھی یہیں الغرض یہ بھی یہیں اور وہ بھی یہیں۔ خیر یہ سب کچھ ہمارے لئے وجۂ امتیاز ہے مگر ایک افتخار سے ہم بہت لرزہ براندام رہتے ہیں کہ آسام کی پہاڑیوں میں چراپونجی بھی ہمارا ہی ہے جہاں تین سو انچ بارش سے ہم حوادث میں تیرنے لگتے ہیں تو جہاں کا مقیاس البرشکال چھ سو انچ کا تقرب ظاہر کرے وہاں ....

ارے بھائی خاموش، برساتی نظام کی شان میں حد ادب سے نہ بڑھ، ملے لو! خلیج بنگال کا قاصد کف بلب پہنچ گیا۔ خاموش خاموش!

غزل

از

جناب سید صادق صاحب سروش۔ بی۔ اے (علیگ) مددگار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

جو کچھ دے بھی دیا اس نے تو اپنی آرزو وہ بھی
کبھی کچھ مجھ سے چاہا بھی تو اپنی جستجو وہ بھی

قضا دیوانگی میں گو بختی ہے چار سو وہ بھی
اگر جاتا ہوں صحرا میں پکار اٹھتا ہی ہو وہ بھی

بلاؤں کا تماشا چاک چاک آرزو وہ بھی
ملا اک پھول سا دل اور محتاج رفو وہ بھی

مرض بڑھنے سے پہلے کاش مجھ کو موت آجاتی
عیادت کو تمہارے بدلے آئے تو عدو وہ بھی

بھلے کو میکدہ کا راز ساقی ہی فقط سمجھا
میں اپنی بیخودی میں کہہ گیا تھا موبمو وہ بھی

تکلف برطرف تو انکساری میں بھی یکتا ہے
بجائے آپ کے مجھ سے کہلوانا ہی تو وہ بھی

بلا نوشوں پہ اتنا آخری احسان بھی کردیں
چھڑکتے میرے مرقد پر شراب مشکبو وہ بھی

تمہارے سامنے میں زہر بھی کھالوں تو امرت ہے
اگر پی جاؤں میں آنسو تو بن جائے لہو وہ بھی

سروش اپنے مقدر پہ مجھے جب رشک آئیگا
کسی دن بے تکلف ہو کے کہدیں مجھ کو تو وہ بھی

عورت کا درجہ

ہندو سماج میں

(از لائن ماسٹرس)

مترجمہ

(محمد حامد متعلم ایف۔ ایس۔ سی۔ سال اول)

"زبانِ مُتہم اپنے پُرانے شعار کو اختیار کر رہی ہے"

حال ہی میں لندن میں ایک کتاب چھپی ہے جس نے بہت ہی کم عرصے میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی ہے As a Man's Hand اس کتاب کا نام ہے یہ مس ساؤتھ گیٹ Miss Southgate کی لکھی ہوئی ہے مصنفہ اس بات کا سنجیدگی سے اظہار کرتی ہے کہ وہ ہندوستان سے محبت کرتی ہے۔ میں اس کے اس طویل قصے پر کیونکر یقین لاؤں۔ اس نے غلط بیانی کی کوشش کی ہے کہ ہندو سماج میں عورتوں کے مجسمے خاص کر جنوبی ہند میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ بالکل صاف ہو۔

مس ساؤتھ گیٹ غلاظت پسندوں کی فوج کی قدیم رنگروٹ ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنا رکھا ہے کہ ہندو رسم و رواج کو بدنام کریں۔

جب ایسے مفسدہ پرداز اور کمینے پروپیگنڈہ کرنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے تو طبیعت کو انتہائی کراہت محسوس ہوتی ہے۔ اور روح کو بے حد تکلیف پہنچتی ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے رسم و رواج کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے متعلق الف کے نام ب بھی نہیں جانتے۔

میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ہندو خواتین ہماری مغربی بہنوں سے بلحاظ چند کہیں بہتر ہیں۔ ان کی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ ہیوس اور رسا ؤتھ گیٹ جیسی شہیر ہستیاں ان پر اظہار تاسف کریں۔

ہندو دستور ایسا نہیں ہے جس پر بے پروائی سے نکتہ چینی کی جا سکے۔ ان کی بنیادیں عقل سلیم اور نہایت ٹھوس منطقانہ دلائل پر قائم ہیں۔

"رائے زنی آسان ہے لیکن حقائق پر پردہ ڈالنا انتہائی دشوار ہے"

ہندو مذہب پر یہ الزام لگانا کہ اس نے عورتوں کی طرف سے غفلت برتی ہے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت ہے۔ کیونکہ صنف نازک کا مرتبہ ہندو مذہب میں ان قدیم روایات کا نتیجہ ہے۔ جو ایک ہزار برس پیشتر رائج تھیں۔ اور جن لوگوں نے اس کو اختیار کیا وہ بجائے بد تمیز، گنوار ہونے کے ذہین اور مہذب ہوئے۔

مسز سیسیل چیسٹرٹن Mrs. Cecil Chesterton ہفتہ وار ٹٹ بٹس Tit Bits کے لئے سلسلے وار دلچسپ مضامین لکھ رہی ہے جسکا عنوان Woman Adrift ہے۔ یہ ان لڑکیوں کے معیوب اور شرمناک قصوں کا مجموعہ ہے جن کی زندگی ایسی تباہ ہو چکی ہے کہ وہ اب سماجی زندگی سے بالکل علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ایسے ناخوشگوار واقعات کا ہندوستان میں ہونا ممکن نہیں۔

میکس مُلر Max Muller زیادہ غلطی پر نہ تھا جب اس نے ہندوستان کے ہندوؤں کو "فلسفیوں کے گروہ" کے نام سے ملقب کیا۔ ان کے سماجی طریقے صدیوں کے سوچ بچار اور تجربوں کے عالیشان نتائج ہیں۔ یہ پوری طرح سے کامل ہیں ہندوؤں کی ہر عادت اور ہر دستور قدرت سے اخذ کئے ہوئے اصولوں کے مطابق ہے۔ حیران کن سماجی معموں کو دیکھ کر جو عرصہ دراز پیشتر ہندو اساتذہ نے اس وقت حل کئے تھے جب اہل مغرب جنھوں نے آج کل یہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ

اہل مشرق کو پھر سے عقل سمجھا رہے ہیں۔ جہالت اور وہم پرستی کے عمیق غار میں پڑے ہوئے تھے۔

میں نہایت پر زور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہندو سماج میں شادی شاذ و نادر ہی ناکام رہتی ہے۔ مجھے بہت سی ہندو خواتین سے ملنے اور ان کے ساتھ سیر و تفریح کا موقع حاصل ہوا ہے۔ میں نے ان سب کو اپنی قسمت پر شاکر اور راضی بہ تقدیر پایا ہے۔ ان میں سے بہت سی ایسی بھی تھیں جن کی شادی کمسنی میں کردی گئی تھی یہ ایک ایسی رسم ہے جس کے خلاف نکتہ چیں، عیب جو، تنقید نگار نہایت بدحواسی کے عالم میں شور و غوغا مچا رہے ہیں۔

ہندو سماج میں شادی دیباچہ ہے محبت کا۔ رشتۂ ازدواج قائم ہوتے ہی لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان میں باہمی محبت پختہ ہو جاتی ہے۔ جو غیر فانی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تک میاں بیوی بات چیت نہیں کرنے پاتے ہیں (یہ رسم نہایت سرعت کے ساتھ غائب ہوتی جارہی ہے) اس قسم کی پابندی سے فریقین پر ایک اچھا اثر پڑتا ہے اور وہ حد فاصل جو بادی النظر میں دوری کا باعث معلوم ہوتی ہے باقی نہیں رہتی۔ وہ ایک دوسرے کی جانب زیادہ متوجہ ہو جاتے ہیں اور جب انہیں آزادانہ ملنے کا موقع ملتا ہے تو ان کی ذہنی اصلاح اس حد تک ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ آئندہ زندگی کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔ باوجود گھریلو جھگڑوں کے ان کی زندگی نہایت سادہ ہوتی ہے۔ اور زندگی کے نشیب و فراز میں ایک دوسرے کے وفادار اور مخلص رہتے ہیں۔ اگر یہ محبت نہیں ہے تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر اور کیا ہے۔

اپنے رفیق حیات کے حق انتخاب سے محروم کردینا کوئی بڑا نقصان نہیں ہے۔ ازدواجی یگانگت سے قبل جماعتوں کو نفع پہنچانے کیلئے اچھی رائیں دینا چاہئے۔ لڑکی کے سرپرست کو چاہئے کہ وہ اس کا خیال کریں۔

ہندوؤں میں منگنی کی رسم ناممکن الانفساخ ہے۔ یہ رسم "مقدس آگ" کے نزدیک ادا کی جاتی ہے جس کے لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدائی نظریں ان کی رسوم پر رہتی ہیں اور آئندہ زندگی میں بھی ان کی نگرانی کیا کرتی ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی اہمیت سے ذاتی خواہش کی بنا پر انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم اگر یہ طریقہ بُرا ہی ہے۔ جو کبھی یکساں نہیں رہتا۔ لڑکا اور لڑکی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنے کو بہتر بنائیں۔ اس سے ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ رشتہ پاک اور ناممکن الانفساخ ہے۔ خود ہمارے ملک میں ان کی ازدواجی شادمانی مختلف برائیوں کی وجہ سے جو ازدواجی زندگی میں ہر کاب ہوتی ہیں بہت کم ناخوشگوار ہو جاتی ہے۔

عورت کے اخلاقی خصوصیات کی پرورش اور حفاظت کرنے کے لئے ہندو دستور مدد کے قابل ہے۔ اس کی دلکش نزاکت، بے داغ پاک دامنی، اور بہادرانہ غرض اور ہمدردی، اس سے اس میں اخلاقی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ اصلی معصومیت اور پاک محبت۔ ہندوؤں میں معمولی درجہ کی عورت بھی پارسا اور پاک دامن۔ تربیت یافتہ اور مشفق متقی اور خوش مزاج ہوتی ہے وہ آدمی کی سب سے پہلی اور بزرگ تر رفیق ہوتی ہے رقیب یا مخالف نہیں۔ اس کا شوہر اس کے لئے تمام ضروریات زندگی فراہم کرتا ہے اور اس کے عوض میں وہ اس کے لئے اپنا سب کچھ ہر وقت اور ہر طرح قربان کرنے کو تیار رہتی ہے۔

ہاں جہاں تک بیواؤں کا تعلق ہے ہندو مذہب میں بہت زیادہ سختی کی گئی ہے لیکن اس میں بھی رسم و رواج کے اندر جو روح کام کرتی ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے حسن اخلاق کو قائم رکھنے کے لئے قومی زندگی کی حفاظت کی خاطر نسبتاً معمولی خوشیوں اور مسرتوں کو قربان کر دینا پڑتا ہے۔ اور ہندو بیوہ کو تجرد کی سخت ترین زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔

لیکن امتداد زمانہ نے اس طریقے میں ایک غیر اطمینان بخش تغیر پیدا کردیا ہے۔ بنیادی اصول کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ برائیاں پیدا ہوگئی ہیں +

غزل

(از جناب مولوی عبدالرب صاحب کوکب مددگار عثمانیہ کالج اورنگ آباد)

بہتے ہیں اشک تاباں یوں دیدۂ رواں سے
جیسے چمکتے تارے ٹوٹے ہوں آسماں سے

تقسیم ہو رہی ہے کچھ سوزشِ محبت
پروانے بن رہے ہیں میرے غمِ نہاں سے

کوسِ رحیل سنتے اے شوقِ مرگ کیوں کر
ہم آگے بڑھ گئے تھے آوازِ کارواں سے

کرتا ہوں میں تصور تو صورت آفریں کی
ڈالوں نگاہ اس پر لاؤں یہ دل کہاں سے

بنکر لہو نہ ٹپکیں زخمِ جگر سے اک دن
آنسو جو رُک گئے ہیں ضبطِ غم و فغاں سے

میخانے میں سنبھالا ہے بیخودی نے ہم کو
ہم بے نکلے ہوش ورنہ اڑنے کو تھے یہاں سے

کیوں چن رہی ہے بلبل فصلِ خزاں میں تنکے
بجلی نہ کوند جائے اپنے غلط گماں سے

اونچا سا کن فکاں نے اک آسماں بنایا
دو چار تنکے لائے تھے میرے آشیاں سے

اس کا وجود پاکر اپنا یقین کھویا
مجھکو ہے وہم اپنا خالی ہوں کب گماں سے

منزل کا کیا ٹھکانا اس دورِ آسماں میں
پہونچے وہیں ہم آخر چل نکلے تھے جہاں سے

بل ابروؤں پہ آئے کچھ اور بڑھ گیا حُسن
نکلے ہیں تیر سیدھے ٹوٹی ہوئی کماں سے

صوتِ نفس نہیں ہے بانگِ جرس سے کچھ کم
آواز آرہی ہے ہر لحظہ کارواں سے

سبزے سے لیکے گل تک سب یک بیک ہیں خاموش
سوسن نے یا الٰہی کیا کہہ دیا زباں سے

آوارہ کیوں پھروں میں چھوٹا سا گھر بنالوں
کچھ لامکاں سے مانگوں کچھ مانگ لوں مکاں سے

کوکب ہے حسن گو دھوم اور عشق ہے حقیقت
آزردہ ہوں یقیں سے آسودہ ہوں گماں سے

سر جگدیش چندر بوس

مسٹر گنپت رائے بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ مددگار کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد

سر جگدیش چندر بوس آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ سر جگدیش نے ۲۳۔ نومبر ۱۹۳۷ء کو کلکتہ سے ۲۰میل دور بمقام گری ڈیہہ قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اناسی سال کی تھی۔ سر جگدیش چندر بوس کی موت صرف بنگال ہی کا نہیں بلکہ سارے ہندوستان کا نقصان ہے۔ نیچرل سائنس اور نباتات کے اس ماہر نے اپنی زندگی میں ایک بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس لئے یہ ہستی دنیائے سائنس کی دوست تھی جس کے لٹ جانے سے دنیائے سائنس میں ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی جو جلد پُر نہ ہو سکے گی۔ سر جگدیش کا خاکی قالب کلکتہ لایا گیا اور نذر آتش کیا گیا۔ عناصر اربعہ بکھر گئے۔ آتش زندگی سرد پڑ گئی۔ خاک خاک میں مل گئی۔ پانی اور ہوا فضا میں غائب ہو گئے۔ کہتے ہیں آتما امر ہے۔ یہ نہ پیدا ہوتی ہے نہ مرتی ہے نہ جلتی ہے نہ کٹتی ہے۔ صرف انسانی جسم کو فنا ہے۔ آتما جسم کا پرانا چولا اتار کر نیا چولا پہن لیتی ہے۔ روح کو دائمی بقا ہے۔ اسرار حیات اور موت کا کس کو پتہ ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ سر جگدیش چندر بوس اپنے پیچھے ایک ایسی شہرت اور ایک ایسا زندہ کارنامہ چھوڑ جاتے ہیں جس کو دائمی بقا ہے گی۔ جب تک ہمارے دیس میں گنگا جمنا بہتی ہیں اس وقت تک سر جگدیش کا نام زندہ رہے گا۔

سر جگدیش نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے ایک سال بعد یعنی ۳۰۔ نومبر ۱۸۵۸ء کو ڈھاکہ ضلع کے بکرم پور قصبہ میں جنم لیا۔ ہندوستان کی تاریخ کا پرآشوب زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت کے بعد برٹش سرکار نے ہندوستان کی عنانِ حکومت

اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ ملکۂ وکٹوریہ کا عہد حکومت ہندوستان کی تاریخ میں نہایت پُرامن زمانہ گذرا ہے۔ اس وقت تک انگریزی حکومت کی جڑیں اس ملک میں مستحکم ہو چکی تھیں۔ فارسی کی جگہ انگریزی لے رہی تھی اور اعلیٰ و متوسط طبقہ کے نوجوان انگریزی اور علوم مغربی کی تعلیم کی جانب بہت سرعت کے ساتھ متوجہ ہو رہے تھے۔ آج جیسی کشمکش حیات سخت تو نہ تھی۔ لیکن علوم مغربی اور انگریزی کی تعلیم باعثِ افتخار سمجھی جاتی اور اعلیٰ عہدوں کے حصول کا ذریعہ۔ بنگالی نوجوان اس صف میں سب سے آگے تھے۔ سر جگدیش کے والد بھگوان چندر بوس ان دنوں فرید پور ضلع کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈپٹی کلکٹری ہندوستانیوں کے لئے سب سے بڑی خدمت تصور کی جاتی تھی۔ بنگالی مغربی تعلیم کے دلدادہ اور حامی تو تھے لیکن اُن میں قوم پرستی کا جذبہ زوروں پر تھا اس لئے نوجوانوں کو پہلے اپنی مادری زبان کی تعلیم اور قومی تربیت دی جاتی۔ سر جگدیش کی ابتدائی تعلیم بھی قصبہ کے مدرسہ میں ہی ہوئی۔ مادری زبان کی تعلیم ختم ہو جانے پر انگریزی مدرسہ کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ سر جگدیش چندر بوس کی سوانح حیات ابھی نہیں لکھی گئی۔ اس لئے بچپن اور زمانہ طالب علمی کے حالات کا پتہ نہیں۔ لیکن ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات اُس زمانہ ہی سے انہوں نے غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا ہوگا ۱۸۸۰ء یعنی ۲۲ سال کی عمر میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ وہاں کیمبرج اور لندن یونیورسٹی سے علم طبعیات میں بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی کی ڈگریاں حاصل کر کے ۱۸۸۴ء میں ہندوستان واپس آئے۔

سر جگدیش نے طبعیات میں جو ریسرچ کا کام کیا اور نباتاتی زندگی کے متعلق دنیا کے سامنے جو نیا نظریہ پیش کیا یہ اُن کی غیر معمولی ذہانت، فطری اختراعی قابلیت اور ان تھک کوشش کا نتیجہ ہے۔ ۱۸۸۵ء میں انگلستان سے واپس آکر جب پریسیڈنسی کالج

میں علم طبعیات کے پروفیسر مقرر ہوئے اُس وقت کالج میں نصابی تعلیم کے لئے بھی ضروری آلات سائنس موجود نہ تھے۔ ریسرچ کا تو کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ آج پچاس سال بعد بھی ہندوستان میں سائنس کی ریسرچ کا انتظام بنگلور، کلکتہ، اور ایک دو یونیورسٹیوں کے سوائے کہیں نہیں ہے۔ اور ہے بھی تو برائے نام اور برائے نمود۔ حالانکہ آج تقریباً ہر کالج میں سائنس کی تعلیم کے لئے اچھے دار التجارب موجود ہیں۔ اور آج قوم اور گورنمنٹ سائنس کی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتی ہے۔ اور اُس پر دل کھول کر روپیہ صرف کرتی ہے۔ سر جگدیش کو مقررہ نصاب کی تعلیم کے لئے بھی وقتی طور پر سادہ آلات خود تیار کرنے پڑتے۔ سائنس میں ریسرچ کا کام یوں بھی بہت مشکل ہے۔ ضروری سہولتوں کے میسر نہ ہونے کی وجہ سے اُس زمانہ میں سر جگدیش کو ریسرچ کے کام میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ سر جگدیش مغربی دنیا سے ریسرچ کی پیاس لے کر آئے تھے جس کا بجھانا ضروری تھا۔ اِن کا اپنا ذاتی تجربہ خانہ تھا جس میں اپنی کمائی کا بہت بڑا حصّہ خرچ کر کے ریسرچ کے لئے ضروری آلات مہیا کرتے۔ سر جگدیش نے اپنی زندگی اور اپنی ساری دولت سائنس کی ترقی اور ریسرچ کی بھینٹ چڑھا دی۔ سر جگدیش نے اِس میدان میں رہبری کا کام کیا ہے۔ اب راستہ بن گیا ہے ضروری سہولتیں بھی میسر ہیں اس راستہ پر نوجوان چل پڑیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آج سر جگدیش اور سر پی۔ سی۔ رائے (بنگال کے مشہور ماہر کیمیا) کے ملک میں کئی شاگرد ہیں جن میں چند نے ریسرچ کا کافی کام کیا ہے اور مغربی ممالک میں شہرت بھی حاصل کی ہے۔ لیکن ریسرچ کا ماحول اور ریسرچ کی سہولتیں ہوتے ہوئے بھی اس پچاس سالہ دور میں سر جگدیش کے بعد دنیائے سائنس میں صرف سر سی۔ وی۔ رامن (جو سر جگدیش سے ۲۲ سال چھوٹے ہیں) ہی کو بین الاقوامی شہرت اور رتبہ نصیب ہوا ہے۔ اس سے سر جگدیش کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

انیسویں صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں امواج برقی پر یورپ میں

نہایت دلچسپ، اہم اور انقلاب انگیز تجربات ہو رہے تھے۔ یہی تجربات بعد میں برقی شعاعوں
بے تار کی تار برقی، ریڈیو وغیرہ جیسے اہم انکشافات وایجادات کا سبب ہوئے۔ سر جگدیش
ان تجربوں سے باخبر ہی نہیں رہتے بلکہ اس قسم کے آلات خود تیار کر کے ان تجربوں کو
اپنے ذاتی تجربہ خانہ میں دُہراتے۔ خود بھی امواج برق کے اثرات پر نئے نئے تجربات کرتے۔
برقی تموّج سے متاثر ہونیوالا پہلا آلہ ۱۸۹۵ء میں سر جگدیش چندر بوس ہی نے بنایا اور اس
طرح بے تار کی تار برقی کی ایجاد کی اور اس کا عملی کامیاب مظاہرہ بھی دیا۔ انگلستان میں سر آسیور
لاج اور اٹلی میں مارکونی بھی اس قسم کے تجربے کر رہے تھے۔ مارکونی نے اس ایجاد کو
مادی ترقی کے لئے کارآمد بنایا اور اس کا موجد کہلایا۔ اس کا پیٹنٹ لے کر اپنے ملک
کو مالا مال کر دیا۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان سر جگدیش چندر بوس نے تموج برقی
پر نہایت دلچسپ تجربے کئے اور ان پر کئی مقالے لکھے۔ یہ مقالے انگلستان کی رائل
سوسائٹی کی روئدادوں میں شائع کئے گئے۔ سر جگدیش چندر بوس پہلے ہندوستانی تھے
جن کو یہ شرف حاصل ہوا۔ یورپ کو ان مقالوں نے حیرت میں ڈال دیا۔ مغربی دنیا کو
یقین نہ آیا کہ ایک ہندوستانی اس اعلیٰ معیار کا اچھوتا ریسرچ کا کام کر سکتا ہے۔
سر جگدیش نے انگلستان جاکر اپنے مقالوں پر لکچر دیئے اور اپنے تجربات کا مظاہرہ
کیا۔ ۱۹۰۰ء میں پیرس کی انٹرنیشنل سائینٹفک کانگریس میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے
شریک ہوئے اس وقت یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں اور سائنٹیفک اداروں نے
سر جگدیش کو اپنے وہاں لکچر دینے کی دعوت دی۔ اب سر جگدیش چندر بوس کی دھاک
بندھ گئی۔ اس "ساحر مشرقی" نے ہندوستان کی ہزار ہا سال قبل کی علم وہنر کی روایت
کو پھر سے زندہ کر کے اپنی قوم کا سر دنیا کے سامنے اونچا کر دیا۔ سر جگدیش کی ریسرچ
نے دنیا کے علم طبیعات کی معلومات میں قابل قدر اضافہ کیا۔
اب یونیورسٹیاں اپنی اعزازی ڈگریاں لے کر دوڑ پڑیں۔ کیمبرج نے ایم۔ اے کی

ڈگری دی۔ کلکتہ۔ لندن۔ بنارس۔ الہ آباد نے ڈی۔ ایس سی کی ڈگری پیش کی۔ وایناکی سائنس اکاڈمی نے اپنا ممبر بنایا۔ ایل۔ ایل۔ ڈی اور ایف۔ آر۔ ایس کی ڈگریاں دی گئیں برٹش سرکار نے بھی ۱۹۰۳ء میں سی۔ آئی۔ ای کا خطاب دیا۔ اُس کے بعد ۱۹۱۱ء میں سی۔ ایس۔ آئی اور ۱۹۱۷ء میں "سر" کا خطاب ملا۔ اب بنگال گورنمنٹ اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی نے ریسرچ کا کام جاری رکھنے کے لئے گرانٹ منظور کیں۔ دارالتجربہ کے لئے ضروری سامان مہیا کیا۔ ریسرچ کا کام جاری رکھنے کے لئے سر جگدیش کو ضروری سہولتیں مل گئیں۔ دنیا اُن لوگوں کی امداد کرتی ہے جو اپنے قدموں پر آپ کھڑا ہونا جانتے ہیں دنیا دولت کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے۔ دولت ہمیشہ اہل ہنر کی تلاش میں رہتی ہے۔ سر جگدیش مالی مشکلات سے بے فکر ہو گئے۔

سر جگدیش کا کارنامہ یہیں نہیں ختم ہو جاتا۔ سر جگدیش اب کوئی نیا کام نہ بھی کرتے تو بھی اُن کی شہرت کو بقا حاصل ہوتی۔ لیکن ایسے لوگ نچلے نہیں بیٹھتے۔ ان کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ابھی کرنا باقی تھا۔ ۱۹۰۰ء میں سر جگدیش اُن دھاتی آلات کی ایصالیت پر تجربہ کر رہے تھے جو تموج برقی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان آلات میں مختلف قسم کا ہیجان اور خلل کی کیفیت پیدا کر کے ان کی قوت ایصال پر جو تجربات اور مشاہدات سر جگدیش نے کئے اُس سے انہوں نے یہ دلچسپ نتیجہ اخذ کیا کہ ہیجان کی تحریک جانداروں میں اور بے جان اشیا میں ایک جیسے اثرات اور رد عمل پیدا کرتی ہے۔ جانداروں میں اور بے جان غیر نامیاتی مادہ میں کوئی خاص حد فاصل نہیں۔ اِس انکشاف کے بعد سر جگدیش نے علم نباتات میں ایک اچھوتی ریسرچ کا کام جاری کر دیا۔ ان ریسرچ پر سر جگدیش نے کئی تصانیف شائع کیں۔ سر جگدیش کی اس ریسرچ نے ایک بار پھر دنیائے سائنس کو متحیر کر دیا اور ماہرین علم نباتات و علم عضویات کی صفوں میں تہلکہ ڈال دیا۔ ایک ماہر طبعیات کا اُن کی اقلیم میں یوں کود پڑنا اُنہیں منظور نہ تھا۔ پودوں میں احساس زندگی کا نظریہ ایک

انقلاب انگیز کھوج تھی۔ سر جگدیش نے ایک نئی سائنس کی بنیاد رکھی جو علم طبعیات، علم نباتات اور علم عضویات کے سنگم سے بنتی ہے۔ سائنس کی دنیا میں یہ ایک انوکھی بات تھی۔ یہاں بھی ذات پات کی تفریق تھی۔ کیمیا کی ذات الگ تھی، طبعیات کی ذات الگ تھی نباتات وغیرہ کی ذاتیں الگ الگ تھیں اور یہ اپنے اپنے قلعوں میں بند تھیں ایک دوسرے سے ملنا نہیں جانتی تھیں۔ سر جگدیش کی کھوج اور ریسرچ نے سائنس والوں کے تخیل میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ سائنس کی مختلف شاخوں میں جو ذات پات کا بعد تھا وہ مٹ گیا کیمیا، طبعیات، نباتات، حیاتیات وغیرہ کی اپنی اپنی دنیا الگ الگ سہی لیکن ان کا آپس میں جگہ جگہ سنگم ہونا قدرتی امر ہے۔ ان میں کوئی خاص حد فاصل نہیں۔ یہ سب آخر قدرت کے سربستہ بھیدوں کی عقدہ کشائی کی مختلف کوششیں ہی تو ہیں۔ دنیا نے اس زاویہ نگاہ کو کب اور کس طرح تسلیم کیا اور سر جگدیش کی کھوج کو کتنی مدت اور جد وجہد کے بعد شرف قبولیت بخشا گیا۔ ان سب کے بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں نہ ہی اُن کی ریسرچ کی تفصیلات اور باریکیوں کا اِس مضمون میں بتانا ممکن ہے۔ سر جگدیش نے پودوں میں جانداروں کے سے احساسات کا صرف پتہ ہی نہیں لگایا بلکہ اُن کے شادی و غم، بھوک، پیاس، سردی گرمی کا احساس، نشہ اور زہر کے اثرات، سانس کی رفتار، اور دل کی دھڑکن وغیرہ ناپنے کے ایسے نازک آلات تیار کئے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ سر جگدیش نے ریسرچ کی دنیا میں نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ ساری کائنات میں زندگی کی ایک جیسی لہریں موجزن ہیں یہ اب صرف شاعرانہ تخیل ہی نہیں ہے بلکہ اس کو عملی مظاہرات سے سر جگدیس نے ثابت کر دکھایا ہے۔ سر جگدیش حقیقت میں "یورپ کا جادوگر" ہے۔

سر جگدیش کی دیرینہ تمنا تھی کہ ریسرچ کا کام جاری رکھنے کے لئے ایک اپنا ادارہ قائم کریں یہ خواہش ۱۹۱۷ء میں ان کی ۵۹ ویں سالگرہ کے وقت پوری ہوئی۔ اس سال بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا انہوں نے افتتاح کیا۔ سر جگدیش نے اس انسٹی ٹیوٹ کے قیام پر

کوئی پانچ لاکھ روپیہ صرف کیا اس کے بعد اپنی کمائی کا بہت سا حصّہ اس پر لگاتے رہے۔ کوئی پندرہ لاکھ روپیہ اس پر اور صرف کیا ہوگا۔ یہ اب ایک قومی ادارہ ہے جہاں ملک کے نوجوان ریسرچ کا کام کرتے ہیں۔ سر جگدیش مرتے وقت چار لاکھ روپیہ تعلیمی اداروں کے لئے چھوڑ گئے۔

سر جگدیش چندر بوس نے نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ اپنی ساری دولت اور زندگی سائنس کی ترقی، اور تحقیقات کے لئے وقف کردی۔ سر جگدیش جیسے لوگ کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی نوجوانوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ ہمارے نوجوان اس سے سبق حاصل کریں۔

چاندنی رات

از

اختر الزّماں صاحب ناصرؔ متعلم سال اوّل

اس طرف بھی چاندنی ہے اُس طرف بھی چاندنی
جس طرف ڈالو نظر ہے چاندنی ہی چاندنی
ہیں زمیں پر ہر طرف بکھرے ہوئے شمس و قمر
آسماں پاؤں کے نیچے آسماں بالائے سر
بن گیا ہے پتّہ پتّہ ہر شجر کا نور نور
قدرت حق دیکھیے ہے ذرہ ذرہ کوہِ طور
بہہ رہا ہے کیا زمیں پر ایک دریا نور کا
سارا عالم بن گیا ہے آج چہرہ حور کا
چاندنی کی بچھ گئی فرشِ زمیں پر چاندنی
چاندنی پیروں کے نیچے سر کے اوپر چاندنی
خاک کے ذرّے ہیں یا تارے گرے ہیں ٹوٹ کر
پڑ رہا ہے عکسِ گردوں یا زمیں کے فرش پر
چاندنی ہی چاندنی ہے یہ زمیں تا آسماں
یا پسینہ حور کے رخسار کا ہے بہہ رواں
آج رات آئی ہے چادر نور کی اوڑھے ہوئے

اپنی وہ کالی ردا کونے میں ایک چھوڑے ہوئے
ہاتھ ہیں دریا کے یا موجیں ہیں اُٹھتی جوش میں
بڑھ کے لینا چاہتا ہے چاند کو آغوش میں
بن گیا ہے آبِ دریا آج اک رنگیں شراب
ماہتاب آیا ہے پینے کے لئے خود زیرِ آب
بکھر رہے ہیں دوڑتے ذرّے فضا میں نور کے
ہو گئے ہیں منتشر گویا شرارے طور کے
نور کا ہے موج زن یہ بحرِ ناپیدا کنار
یا کہ جھٹکا ہے کسی مہوش نے دامن کا غبار
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی
طفلِ قدرت نے الٹ دی یا صراحی نور کی
ہیں زمین و آسماں بارانِ نورانی سے تر
یا کہ مرغِ نور کے شہ پر گرے ہیں ٹوٹ کر
آسماں پر ہیں کواکب کچھ اِدھر اور کچھ اُدھر
یا کسی گلرو کا آئینہ ہے بکھرا ٹوٹ کر
حسن کے دامن سے یا کچھ پھول تا صر گر گئے
یا کہ نکلے ہیں قبائے حور کے بکھرے ہوئے
ہیں یہ بادل بحر ہیں یا آسمانِ پیر کے
نور کی کشتی کے ٹکڑے پھر رہے ہیں تیرتے
لے رہا ہے آج مست انگڑائیاں شاید شباب
حسن نے چہرے سے اپنے یا ہٹالی ہے نقاب

کس غضب کا کس ستم کا کس بلا کا ہے سماں
آسمانِ پیر بھی معلوم ہوتا ہے جواں
ہو رہی ہے بارشِ انوار تا صحرا ہر طرف
مل گئے نوری و خاکی سب تکلّف بر طرف

پیغامِ عمل

سید ایوب احمد کرمانی متعلم سال دوم صدر انجمن اتحاد طلباء

میرے ہاں ایک طوطا پلا تھا۔ میں ایک عرصہ سے اسے چھوٹے سے پنجرے میں مقید دیکھتا چلا آرہا تھا۔ ذرا سی تیلیوں سے گھری ہوئی جگہ اس کی کل کائنات تھی۔ وہ آزاد نہ تھا۔ لہٰذا اُس خداداد نعمت کے لئے جو ہر ذی روح کا فطری حق ہے۔ بے قرار تھا۔ اور اس کا اظہار اپنے قیدخانہ میں پروانہ وار چکر کاٹ کر کرتا۔ میں اکثر اس کو اسی حالت میں دیکھتا۔ مجھے ترس بھی آتا مگر وقتی انہماک کے باعث کبھی توجہ نہ دی۔ اس کا یہ شغل جاری رہا۔ برسات کا موسم آن پہنچا۔ کائنات کے ہر ذرے نے کروٹ لی اور اس میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ درختوں اور پودوں سے لے کر حضرتِ انسان تک نے گویا کینچلی بدلی۔ اتفاق سے ایک روز میری نظر اس طوطے پر پڑی۔ دراصل اس وقت مجھے اس پر بے انتہا رحم آیا جب میں نے اس کو معمول سے زیادہ بے قرار پایا۔ وہ بے بسی کے عالم میں ہواؤں میں اٹھکیلیاں کرنے والے آزاد ہمصفیروں کو بھیگی اور خوشگوار فضاؤں سے محظوظ ہوتے دیکھتا اور بھری چیخ سے بے چینی کا اظہار کرتا اور دل مسوس کر بیٹھ رہتا۔ اس کی رفتارِ گردش تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

دفعتاً میں نے ارادہ کر لیا کہ اس شمع آزادی کے لئے پروانہ وار جدوجہد کرنے والے کو اس کا فطری حق دے دوں ....

تھوڑی دیر کے بعد عجیب منظر تھا... پنجرے کا دروازہ آغوش آزادی وا کئے ہوئے تھا اور وہ اسے ٹھکرا رہا تھا۔ دروازے کا رُخ کرنے کے بجائے وہ حسبِ عادت تیلیوں سے ٹکرایا۔ مجھے حیرت تھی۔ انتہائی استعجاب۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ

غصہ بھی آیا اس کی بدبختی پر۔

مگر میری حیرت، میرا استعجاب، میرا غصہ تھوڑی فکر کے بعد جاتا رہا۔ غلامی ذلت کی دوزخ کا وہ شعلہ ہے جس کی ایک ہی لپٹ خصائص بشریت تک کے دامن کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ بادِ خزاں کا وہ مہیب جھونکا ہے جو صدیوں کے عظمت و عزت کے نخلِ سرسبز کو بے برگ و بار بنا دیتا ہے۔ ایک ایسی مہیب، ایسی ناپاک، ایسی خبیث بیماری ہے جو کسی پر مسلط ہو کر اس کے قوئ عمل کو مردہ، روح کو پژمردہ اور دل کو افسردہ بنا دیتی ہے۔ ایک ایسا خوفناک طوفان ہے جو ایک ہی ریلے میں حیا و غیرت، عزت و حرمت سب کچھ بہا لیجاتا ہے۔

یہ طوطا حصولِ آزادی کا صحیح راستہ بھول چکا تھا۔ اور دنگل ریس میں جد وجہد کرنے کا خیال اس کو ضرور پیدا ہوا مگر اس کے گشت لگانے کا مقصد بڑی حد تک فوت ہو چکا تھا۔ غلامی نے غیروں کے دستِ نگر رہنے کا خوگر بنا دیا تھا۔ بے عزتی اور بے غیرتی کی روٹی مرغوب سے مرغوب تر ہو چکی تھی جو مالک کا رٹایا ہوا سبق پڑھ کر بڑی آسانی سے میسر ہو جاتی...... اب اس کو شاق تھا ایک بازو بھی ہلائے جس سے وہ ان ساری کلفتوں کا خاتمہ کر کے حقیقی مسرت سے ہمکنار ہو سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں بجائے غصہ کے شرم سے پانی پانی تھا۔ یہ ایک ناسمجھ پرندہ تھا مگر ہم انسان ہیں، اشرف المخلوقات" خدا کے خلیفہ مگر کیا اس کے باوجود ہم میں سے کوئی اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ غیروں کا دستِ نگر نہیں؟ اوروں کا پڑھایا ہوا سبق نہیں رٹتا؟ فخریہ انداز سے بھونڈی نقلیں نہیں اتارتا۔ اس کے علاوہ تعصب اور اوہام جیسے ہزاروں پنجروں میں اپنے آپ کو مقید نہیں کر رکھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے اپنی رکیک حرکتوں کی وجہ سے جو اب فطرتِ ثانیہ بن چکی ہیں انسانیت کو بہت بڑی ٹھیس لگائی ہے۔ اور اس کے درجہ کو حیوانوں سے گرا دیا ہے۔

ہمارے سامنے بڑے بڑے رہنماؤں نے سیدھے سے سیدھا راستہ تلاش کر کے

پیش کیا۔ مگر ہماری آنکھوں پر تعصب، درندگی، خوشامد، جاہ پسندی کی پٹیاں کسی ہوئی تھیں۔ جو خود ہمنے اپنے ہاتھوں سے کس لیں۔

ہمارے سیلاب کو بڑے بڑے دیو ہیکر فلک بوس پہاڑ نہ روک سکے۔ ہمارے جوش کو امڈتے ہوئے دریا اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر نہ سرد کر سکے۔ ہم سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا جاتے اور پاش پاش کر دیتے ہم اپنی عزت، اپنی آبرو، اپنی آن بان پر نازک اندام نازنینوں اور گلفام بچوں کو نذرِ آتش کرنے میں دریغ نہ کرتے۔ لیکن آج ہم اتنے بدل گئے کہ چند روٹی کے ٹکڑوں کے لئے خوشامدی کتے بنے ہوئے ہیں۔ اپنی دوزخ بھرنے کے لئے ہزاروں بندگانِ خدا کے مفاد کو بالائے طاق رکھنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اپنے نام ونمود کی خاطر وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جس کے کرنے میں شاید شیطان کو بھی شرم آئے۔ درندگی اور خونخواری ہماری سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ عقل ہم سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ ذرا سی بات خود اپنے ہی بھائیوں کا بیدریغ خون بہانے کے لئے کافی ہے۔

مگر اب انتہا ہو چکی قریب ہے کہ کف افسوس ملنے کا بھی موقع نہ ملے۔ اب یکایک چونک جانے کا وقت ہے۔ تاخیر مہلک ثابت ہوگی۔ ہم سب نے ایک ہی ماتا کی کوکھ میں جنم لیا ہے۔ ایک ہی ہوا میں سانس لی ہے۔ ایک ہی فضا میں پروان چڑھے ہیں۔ ایک خون ہم سب کی رگوں میں موجزن ہے اتفاق قوت ہے اور قوت ہی سب کچھ کر سکتی ہے۔ خود غرض، جاہ پسند خوشامدی کتے سنگ راہ کی طرح ٹھکرائے جا سکتے ہیں۔ ان کی مزاحمت تازیانہ بن کر ہمارے سمندِ عمل کو تیز گام کر سکتی ہے۔ زمانہ جوالامکھی بنا ہوا ہے اس کے پھٹنے سے پہلے سنبھل جانا ضروری ہے۔ وطن کو قعرِ مذلت سے نکالنا ہر سپوت کا فرضِ مقدس ہے۔ ہماری رگوں میں بہادر مغلوں۔ بانکے راجپوتوں بے جگر عربوں اور مستعد مرہٹوں کا خون ہے۔ للکار واس سے حمیتِ قومی ورثے میں ملی ہے۔ میر جعفر کی زندگی سے ٹیپو سلطان

کی موت بدرجہا بہتر ہے۔ منہ پھیلائے تماشا دیکھنے سے بہتر ہتھیلی پر جان رکھ کر جنگِ آزادی کے گھمسان میں بھارت کے جیکارے بھرتے ہوئے پھاند پڑو۔ غفلت کا نتیجہ موت ہے۔ بے غیرتی اور بے عزتی کی موت۔ آنے والی نسلیں بے حیائی کے گڑھے میں سسک سسک کر دم توڑیں گی جس کے ذمہ دار ہم سب ہوں گے۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

غزل

از

(محمد ہاشم صاحب محشر)

مری بیتابیوں سے کچھ خفا معلوم ہوتی ہے
لگ ماہ آشنا نا آشنا معلوم ہوتی ہے

چلی آئی مزار بیکسی پر پھول کچھ لے کر
نسیم صبح بھی درد آشنا معلوم ہوتی ہے

وہ شمع بزم کا جل کر قریب صبح بجھ جانا
اسی سے زندگی کی ابتدا معلوم ہوتی ہے

نہ چھیڑ اب ساز لے مطرب کہ ہر آواز نغمے کی
مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا معلوم ہوتی ہے

تڑپنا لوٹنا فریاد کرنا جان دے دینا
یہی درد محبت کی دوا معلوم ہوتی ہے

نہیں معلوم کیوں مجھ سے خیال یار برہم ہے
مخالف جو زمانے کی ہوا معلوم ہوتی ہے

مزا آنے لگا ہے مجھکو آزار محبت میں
جفا بھی اس کی اب مجھ کو وفا معلوم ہوتی ہے

فضائے حسن جب سے بس گئی نظروں میں اے محشر
تجلی ہی تجلی جا بجا معلوم ہوتی ہے

آہ! اقبال

از

محمد باقر امام صاحب متعلم ایف۔ اے سال اول

اے اجل یہ تو نے کیسا حشر برپا کر دیا
اف دل سوزاں میں میرے سوز پیدا کر دیا

ہم میں تھیں موجود کتنی چیدہ چیدہ ہستیاں
پر نہ چھوڑے تیرے دست ظلم نے اک نشاں

آج تو نے وہ غضب ڈھایا کہ ہے سارا جہاں
سینہ کوب و چشم تر۔ محو غم و آہ و فغاں

آہ! تو نے توڑ ڈالا اس کا تار زندگی
اب کوئی باقی نہ تھا شاید کہ کار زندگی

جس کے دم سے آہ قائم تھی بہار زندگی
آج مسلم کے لئے ہے سوگوار زندگی

یہ وہ صدمہ ہے کہ دنیا جس کو سہ سکتی نہیں
کانپتا چرخ بریں ہے اور لرزتی ہے زمیں

آہ! وہ اقبال یعنی ہند کا عالی دماغ
رونق بزم ادب۔ حکمت کا وہ روشن چراغ

آہ! آں ہمدرد ما از عالم فانی گذشت
حسرتا واحسرتا!! آں مرد لاثانی گذشت

آہ! وہ دنیائے شعر و شاعری کا آفتاب
لحن داؤدی کا دلکش نغمہ و چنگ و رباب

امت مرحوم کا اے ملے وہ افسانہ خواں
ڈالنے والا تن بیجاں میں وہ روح رواں

کون اب وہ نغمۂ شیریں سنائے گا ہمیں
کون سیدھے راستہ پر اب چلائے گا ہمیں

کون ہوگا اب ہمارے کارواں کا راہبر
کون دے گا شرقیوں کو اہل مغرب کی خبر؟

جو پلائے گا مے عرفان حکمت ہے کہاں
جو کہ دل سے دھوئے گا ساری کدورت ہے کہاں؟

کردیا ظاہر بیاں کرکے نکات اسلام کے
ہیں مسلمان ہند میں لیکن فقط ہیں نام کے

ڈھونڈتے ہیں آج ہم یا قہا جسے شام و سحر
سب اسی کی یاد میں برسوں رہیں گے چشم تر

ایک نوجوان درکار ہے

از

محبوب الٰہی خاں سحر متعلم سال اول

صفحۂ عالم پہ آتا ہے نظر اک اشتہار — جس کی جانب دل کی آنکھیں اٹھ رہی ہیں بار بار
"ان خصوصیات کا اک نوجوان درکار ہے — وہ جو مل جائے تو بس ملت کا بیڑا پار ہے
پائے استقلال میں جس کے نہ لغزش ہو کبھی — بل نہ آئے جس کی پیشانی پہ جھیلے ہر کڑی
مشکلوں کے کوہ کو ٹھکرائے پامردی کے ساتھ — ہر رکاوٹ کے مقابل ہو جواں مردی کے ساتھ
جو پلا ہو مادرِ ہندوستاں کی گود میں — اور پھلا پھولا ہو اس جانِ جہاں کی گود میں
رچ گیا ہو جس کی ہر ہر رگ میں جوشِ حریت — ہر گھڑی جس کی زباں پر ہو خروشِ حریت
اپنی ہستی کی بلندی کا جسے احساس ہو — نام و ننگِ قوم کا جس کو نہایت پاس ہو
ریس کرنا چھوڑ دے اپنی نکالے راہ آپ — قوم کو گمراہ ہونے دے۔ نہ ہو گمراہ آپ
برملا اظہارِ حق میں دل کا جو بے باک ہو — مشعلِ راہِ وفا جس کا ضمیرِ پاک ہو
ہو خلوصِ دائمی جس کا دلیل و راہبر — علت و اغراض کا جس میں نہ ہو کوئی اثر
ظاہری آرائشوں کی اس کو کچھ پروا نہ ہو — خدمتِ ملت کی دھن ہو اور کوئی سودا نہ ہو
مقصدِ واحد ہو جس کا ٹھوس خدمت ملک کی — اپنی عظمت ہی سمجھتا ہو جو عظمت ملک کی
موم کے مانند پگھلا دے جو سنگِ راہ کو — ایک سمجھے راہِ آزادی میں کوہ و کاہ کو
سامنے گر آئے طوفانی سمندر پاٹ دے — ہاتھ سے ہمت نہ دے گو کیسی ہی مشکل پڑے
جذبۂ ذوقِ عمل جس کا ہو گمنامی پسند — سامنے جس کے ہوں ابوابِ ریا و رزق بند
بڑھ کے بادل کی گرج سے جس کی ہر للکار ہو — جس سے ہر سویا ہوا افسردہ دل بیدار ہو

اُس کے نعرے کی صدا سے کانپ اُٹھیں شیروں کے دل
قوتِ بازو سے اُسکی چوٹیاں ٹو جائیں ہل

حال میں گرمِ عمل ہو قال کا شیدا نہ ہو
عظمتِ ماضی پہ ناز اک آنکھ اُسے بھاتا نہ ہو

یوں بڑھے میدانِ جدوجہد میں وہ باہنر
ناز اپنے عزم پر، تکیہ خدا کی ذات

شرق و غرب اُس کے سمندِ عزم کی ایک جست ہو
کامیابی پاؤں چومے نامرادی پست ہو

ہاں! جوانو قوم کی جانوں سُنا یہ اشتہار
گوشِ دل میں آپ کے پہنچی زمانہ کی پکار

کون ہے اس کا مخاطب یہ بھی سنئے۔ آپ ہیں
آپ اگر سُننا نہ چاہیں کہئے پھر کس سے کہیں

آپ ہی پر منحصر ہے بزمِ ملت کا نظام
آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہے دنیا کا کام

جان بن کر آپ ہی ہیں جسمِ ملت میں رواں
آپ ہی ہیں رونقِ ہنگامۂ بزمِ جہاں

ہاں ذرا اب آؤ پھر خم ٹھوک کر میدان میں
غُلغلہ پھر ڈال دو اک بار ہندوستان میں

ملتِ خوابیدہ پھر دم سے تمہارے چونک اٹھے
پھر تمہارے ہی عمل کا ہر طرف ڈنکا بجے

سحر

بلندی چاہتے ہو تو بلند خیال بنو

از
محمد قادر فاروقی متعلم دہم عثمانیہ کالج اورنگ آباد

ہمارا ماحول اور ہم جو کچھ ہیں۔ اپنے ہی خیالات کا نتیجہ ہیں۔ دنیا میں میدانِ کارزار گرم ہوتا ہے جمیعۃ الاقوام میں ''امنِ عالم'' پر تقاریر ہوتی ہیں۔

استبدادیت کا بھوت غلام اقوام وملل پر ظلم وستم روا رکھتا ہے یا کوئی غلام قوم آزادی کے لئے فرزندانِ وطن کو نثار کرتی ہے۔ یہ سب کرشمہ ہمارے خیالات ہی کے ہیں اور ہماری ناامیدی، یاس، حزن وملال دراصل ہمارے خیالات ہی کا نتیجہ ہیں۔

دنیا کے کامیاب لوگوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اُن کی کامیابی صرف ان کی بلند خیالی کا نتیجہ ہے انہوں نے اپنے مستقبل کا ایک معیار مقرر کرلیا۔ وہ دنیا میں عزت حاصل کرنا چاہتے تھے وہ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے تھے۔ کیونکہ اِن کے خیالات انہیں اِس کے لئے مستعد کرتے تھے۔ غربت ومفلسی اُن کی راہ میں سدِ راہ نہ ہوئیں۔ فقدانِ تعلیم اُن کو ترقی کی راہ پر پہنچنے سے باز نہ رکھ سکی کیونکہ ان کی قوتِ ارادی اور خیالات بلند تھے۔ احباب جانتے ہیں کہ آجکل اخبارات کے کالم کے کالم فورڈ، راک فیلر، کائینگی وغیرہ کی سخاوت کے کارموں کے بیان سے بھرے جاتے ہیں لیکن کون نہیں جانتا کہ امریکہ کے یہ قارون کی سی دولت رکھنے والے امرا پہلے پہل معمولی مزدور تھے۔ جیسے تم کارخانوں میں کام کرتے دیکھتے ہو۔ وہ بھی عام طور پر مشقت کرکے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ مگر بلند خیالی نے آج ان کے لئے دولت کے خزانے کھول

دیئے جب کہ ان کے اکثر دوست آج بھی ویسے ہی مزدور ہیں لیکن ان دو قسم کے مزدوروں میں فرق صرف اس قدر ہے کہ فورڈ، آرک فیلر وغیرہ اپنے مستقبل سے اچھے اچھے خیالات رکھتے تھے۔ انہیں اپنی ترقی کی دھن سمائی تھی اسی تفاوت نے آج دونوں قسم کے مزدوروں کی دولت اور معاشرت میں نمایاں فرق دکھایا۔ لیکن جس طرح اعلیٰ خیالات ہم کو اعلیٰ مراتب پر پہنچا سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح پست خیالی اور غلط خیالات قعرِ مذلت میں گرا سکتے ہیں اور ترقی حاصل کرنے سے محروم رکھ سکتے ہیں۔

میں ایک ایسے تاجر کو جانتا ہوں جس نے کافی سرمایہ سے کام شروع کیا تھا وہ تعلیم یافتہ اور سمجھدار تھا۔ مگر جب کبھی مجھے اس سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تو اس نے یہی کہا کہ میں کامیاب تاجر نہیں ہو سکتا۔ میں اُصول تجارت سے نابلد ہوں۔ یقیناً مجھے اس سال بھی خسارہ ہی رہے گا۔ اور واقعی اُس کو اس سال بھی نقصان ہی اُٹھانا پڑا۔ کیونکہ ناکامی کا بھوت اُس کے دل ودماغ پر مسلط ہو چکا تھا۔ ان خیالات نے اُس کو کہیں کا نہ رکھا۔ آج بازار میں وہ سب سے ناکام تاجر ہے۔ جبکہ اس کے ساتھیوں میں سے اکثر نے بہت معمولی سرمایہ سے کام شروع کر کے آج اتنی ترقی کر لی ہے کہ بازار میں ان کا سکہ چلتا ہے۔

پس اے دوستو! اگر تم آسودگی اور آسائش سے کام کرنا چاہتے ہو۔ تم صحت و دولت اور سکون کے متمنی ہو۔ تو اپنے دل کو بُرے خیالات سے پاک رکھو۔ نااُمیدی اور یاس کے خیالات کو پاس نہ پھٹکنے دو۔ تم نہیں جانتے بُرے خیالات تمھاری زندگی کی خوشیوں کو ملیامیٹ کر دیں گے۔ امریکہ کا مشہور مصنف ڈاکٹر مارڈن لکھتا ہے "تم ایک بچہ کو دیکھتے ہو جو پنسل سے تمھارے ڈرائینگ روم کی دیواروں پر لکھ رہا ہے۔ اور خوبصورت چیزوں کو بگاڑ رہا ہے۔ یقیناً تم اُس کے ہاتھ سے پنسل چھین لو گے اور اُس کو ایسا کرنے سے منع کرو گے۔

مگر عزیزو! تم بُرے خیالات کی پنسل سے جسم کی دیوار پر بُرے نقش ڈال رہے ہو

اور اپنی روح کی شادمانی کا قیمتی سامان بگاڑ رہے ہو۔
کبھی تم نے اس کے متعلق بھی سوچا ؟

فی الحقیقت بُرے خیالات اشرف خلائق انسان کو جامۂ انسانیت سے خارج کر دیتے ہیں اور ہمیں ان بلندیوں پر نہیں پہنچنے دیتے۔ جہاں بلند خیالی ہمیں لے جاسکتی ہے۔

عزیز دوستو! اگر تم دنیا میں ترقی کے طالب ہو تو اپنے دل کو پاک اور بلند خیالات سے معمور رکھو اور کارزار حیات میں مصروف ہو جاؤ۔ دیکھو کہ کس طرح کامیابی تمہارے قدم چومے گی اور یقین جانو کہ صرف پاک اور بلند خیالات کی بنا پر تم دنیا کے بہترین انسان بن سکو گے۔

غزل

از

مرزا امتین احمد بیگ سروش نائب مدیر

ہوش کس کو ہے کہ کیا عکسِ رخِ جانانہ تھا
ہاں شرابِ نور کا رقصاں کوئی پیمانہ تھا

سنتے سنتے ماہ نو بھی ہو گیا جھک کر کماں
کس قدر پرغم ترے بیمار کا افسانہ تھا!

خاک میں ہم مل چکے برپا قیامت ہو چکی
تم نہ آنا تھا نہ آئے۔ یہ تمھیں زیبا نہ تھا

صدمہائے غم نہ ہوں تو زندگی میں لطف کیا
نغمہ آسا ساز کو مضراب سے یارا نہ تھا

کون ساقی کس کا میخانہ۔ اجازت کون لے
میکدہ اس کا تھا جس کے ہاتھ میں پیمانہ تھا

کل چمن میں کوئی مست ناز آیا تھا ضرور
ورنہ پھر کیوں زرد رنگِ نرگسِ دیوانہ تھا

دل کی یہ وارفتگی وجہِ ندامت کیوں بنے
آپ کا اصرار تو موسیٰ خردمندانہ تھا

قدسیانِ عرش آئیں اپنے استقبال کو
عشق کا یہ مرتبہ ہے۔ میں مگر ایسا نہ تھا

کیفِ دردِ دل سے میں بیخود نہ تھا جبتک سروش
آبرو شیشہ میں تھی۔ رنگ رخِ پیمانہ تھا

ڈورا

از

مرزا متین احمد بیگ سرخوش

ولیم ۔ ڈورا اور ایلین تینوں ایک ہی ساتھ زندگی بسر کرتے تھے ۔ ولیم ۔ ایلین کا اکلوتا بیٹا تھا اور ڈورا، ایلین کے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی ۔ ڈورا کے والدین ایام طفولیت ہی میں اسے داغ مفارقت دے گئے ۔ اور شفیق چچا نے اسے اپنے سایہ شفقت و محبت میں پناہ دی ۔ ولیم اور ڈورا دونوں کو وہ ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا اور کوئی امتیاز دونوں میں روا نہ رکھتا تھا اب دونوں بہارِ شباب کے پرجوش میدان میں پہونچ چکے تھے بوڑھا ایلین دونوں پر محبت بھری نظریں ڈالتا تھا اور مسرت و ابتہاج سے سرشار ہوکر دل ہی دل میں کہتا "میں ان دونوں کو ایک دوسرے کا شریک زندگی بناؤں گا ۔ یہ میرا قرۃ العین ہے اور وہ میرے بھائی کی نورِ نظر ۔"

رفتہ رفتہ ڈورا پر بھی اپنے چچا کی خواہش ظاہر ہوگئی ۔ اس کی خوشی کا اندازہ اب کون کرسکتا تھا ۔ اس کی دلی مراد بر آنے کو تھی وہ ولیم پر سو جان سے فدا تھی اور اس کی پوجا ہر دم اپنے من میں کرتی رہتی تھی ۔ مگر افسوس اسے کیا خبر تھی یہ سب فریب تمنا ہے اور طلسم آرزو ۔ ولیم کا دل کہیں اور تھا جبین و جمیل ڈورا اسے مسحور نہ کرسکی ۔

ایک دن ایلین نے ولیم کو بلایا اور کہا ۔ بیٹا تم جانتے ہو کہ میں بوڑھا اور ضعیف ہوچکا ہوں ۔ خدا جانے طائر روح کب قفس عنصری سے پرواز کر جائے ۔ اب میرے دل میں صرف ایک ارمان ہے کہ میں تمھیں اور ڈورا کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ حیات دیکھوں ۔ تم میرے لخت جگر ہو اور وہ میرے مرحوم بھائی کے دل کا سرور ۔ دیکھو

وہ کتنی دلفریب ہے۔ نہیں بلکہ حسن وجمال کا پیکر بھولی بھالی سلیقہ شعار اور اطاعت گذار ہے عبارت مختصر حسن سیرت اور جمال صورت دونوں سے مزین ہے۔ کیا تم اپنے لب گور باپ کی اس آخری تمنا کو پوری نہ کروگے"

ولیم، جوانی کے نشہ میں چور تھا۔ بادۂ الفت سے مخمور تھا۔ ہاں نہ کرنی تھی نہ کی اور نہایت بے باکی سے کہدیا کہ "میں ہرگز ہرگز ڈورا سے شادی نہیں کرسکتا"

آہ بڈھے باپ کی حالت کو پھر کیا پوچھتے ہو۔ ایک بجلی تھی کہ گری اور اس کے ضعیف دل کو خاکستر بنا گئی۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ وہ غم وغصہ سے دیوانہ ہوگیا۔ مگر ضبط سے کام لیا اور یوں گویا ہوا۔ "ولیم تمہیں نہیں معلوم کہ میں نے تمہاری والدہ کے بعد کن مصیبتوں سے تمہاری پرورش کی ہے۔ مجھے تم سے ہرگز اس جواب کی اُمید نہ تھی تم نے اپنے ضعیف وخستہ دل باپ کا کچھ تو خیال کیا ہوتا۔ اچھا میں تمہیں ایک ماہ کی مہلت دیتا ہوں، تم اچھی طرح غور وفکر کرلو۔ پھر مجھے جواب دینا۔ یاد رکھو میں نے جو کہدیا ہو اس میں سر مو فرق نہیں ہوسکتا۔ میرے الفاظ آئین ہیں اور میری خواہش قانون۔ جواب اثبات میں ہے تو فبہا ورنہ پھر میرے گھر میں قدم نہ رکھنا"

بھلا جنون عشق کو آداب محفل سے کیا نسبت۔ ولیم جتنا ہی ڈورا کو دیکھتا تھا اور بھی اس سے متنفر ہوتا جاتا تھا۔ اس کا سلوک ڈورا کے ساتھ ناروا سے ناروا تر ہوگیا مگر واہ ری ڈورا اس نے سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور کبھی پیشانی پر بل نہ آنے دیا۔ اور ایسا کیوں نہ ہو۔

جہان غم میں جو وقف جفائے یار ہو جائے
اسے ہر گام پہ راہ وفا معلوم ہوتی ہو

ابھی ایک ماہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ محبت کے دیوانے ولیم نے باپ کے گھر کو خیرباد کہدیا اور دوسرے کسانوں کے کھیتوں میں مزدوری کرکے گذر اوقات کرنے لگا۔ تھوڑی

ہی مدت میں اپنی محبوبہ میری سے شادی رچالی۔

ایک روز جب کہ شاہ خاور دن بھر کی ضیا پاشی کے بعد گوشۂ مغرب میں آرام کرنے کے لئے جا چکا تھا۔ گرجے کی گھنٹیوں کی آواز گونج کر فضا میں ترنم پیدا کر رہی تھی ایلن نے ڈورا کو بلایا اور کہنے لگا:- بیٹی ڈورا تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ اس دنیا میں میرا سوائے تمھارے کوئی نہیں۔ مگر یاد رکھنا کہ اگر کبھی بھولو بھی ولیم یا اس کی بیوی سے بات کی تو میں تمھاری صورت تک سے بیزار ہو جاؤں گا۔ میرا حکم اٹل ہے۔

ڈورا دیوی تھی شرم وحیا کی عصمت وعفت کی۔ پیکر تھی انکسار وحلم ووفا کی اور مجسمہ تھی انقیاد واطاعت کی۔ اس نے فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا۔ تاہم دل میں چچا کے غلط فیصلہ پر تاسف کرتی رہی۔ اسے اذعان کامل تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جبکہ چچا کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور وہ اپنے زاویہ نگاہ کو بدلنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اور مجھے ولیم سے ملنے جلنے کے لئے مکمل آزادی نصیب ہو گی۔

ابھی ولیم کی شادی کو کچھ ایسا زیادہ عرصہ بھی نہ گذرا تھا کہ خدا کی دین ہے وہ ایک من موہن بچے کا باپ ہو گیا۔ لیکن قسمت نے پلٹا کھایا۔ کوکب اقبال گردش میں آ گیا۔ ایام نحوست آ پہونچے۔ آلام اور مصائب اس پر سمٹ آئیں۔ وہ اپنے باپ کے دروازہ کے سامنے سے مغموم ومہموم۔ اداس اور نڈھال نکلتا۔ باپ اسے دیکھتا۔ گو اس کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے واقف بھی تھا۔ مگر دست گیری نہ کرتا۔ اس کے دل میں ولیم کے لئے رحم وکرم کی کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ غیظ وغضب کے سیلاب نے پدرانہ محبت کے تمام ولولوں اور جوشوں کو سرد کر دیا تھا۔ مگر ڈورا سے یہ کب دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ ادہر اُدہر سے کتر بیونت کر کچھ نہ کچھ رقم پس انداز کر لیتی اور خفیہ ولیم کے گھر پہنچا دیتی اور وہ کبھی نہ جان سکا کہ یہ گمنام محسن وہی ڈورا ہے جسے اس نے راندہ درگاہ

کر دیا تھا۔
فصل پک چکی تھی اور کٹنے ہی کو تھی کہ ایک روز دفعتہً ولیم کو شدید بخار آ گیا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ میری یک وتنہا اپنے سہاگ کو رونے کیلئے رہ گئی۔ اس کی امید کا صرف ایک سہارا رہ گیا تھا۔ اس کا معصوم بچہ۔ اب تو ڈورا کے ہاتھ سے عنانِ ضبط چھوٹ گئی۔ دلِ بیقرار نے چچا ایلین کے تمام فرمودات طاقِ نسیاں میں رکھدیئے۔ اور ایک روز میری کے پاس چلی گئی۔ وہ بیٹھی یاس آسا نظروں سے اپنے یتیم کی اکلوتی نشانی کو "بچشم نرگس دیکھ رہی تھی۔ صدفِ چشم میں درہائے اشک اپنے شفاف اور آبدار آئینہ میں اس کے جذبات رنج والم کی مصوری کر رہے تھے۔ ڈورا نے میری سے کہا "میں نے تاحدِ امکان چچا جان کی اطاعت گذاری اور فرمانبری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ مگر اب تو پیمانۂ صبر چھلک اُٹھا۔ مجھ میں ضبط کا یارا نہیں رہا۔ بے شک میں گنہ گار ہوں۔ میں کمبخت نہ ہوتی تو کاہے کو ولیم پر یہ مصیبتیں آتیں اور اسے ان آلام اور تکالیف سے کیوں دوچار ہونا پڑتا..... میں ولیم کے لئے...... اس کی محبوبہ کے لئے...... اس کے لختِ جگر کے لئے۔ تمام عیش وآرام کو ٹھکرا کر آئی ہوں۔ اب کی پانچ سال کے بعد فصل اچھی ہوئی ہے۔ لاؤ بچے کو مجھے دیدو۔ میں اسے چچا کے پاس لے جاؤں گی۔ وہ گیہوں کے کھیتوں میں ہے۔ فصل کو دیکھ کر باغ باغ ہوا جا رہا ہے۔ اس ننھی اور معصوم مورت کو دیکھ کر اسے یقیناً پیار آ ہی جائے گا۔ ولیم قیدِ حیات سے آزاد ہو چکا ہے۔ ہوئی مٹی کی اس نشانی کو دیکھ کر پدری محبت جوش میں آئے گی اور وہ بیتاب ہو جائے گا۔

ڈورا بچے کو لے کر روانہ ہو گئی اور کھیتوں کے درمیان ایک بن جتی جگہ بیٹھ گئی یہاں پر خشخاش کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اسے امید تھی کہ ایلین اس جگہ سے گذرے گا اور بچے کو دیکھے گا۔ مزدوروں میں بھلا کس کی مجال تھی کہ وہ ایلین سے ڈورا کی بابت کچھ کہتا۔ سورج ڈھل گیا غروب ہو گیا اور اندھیرا چھا گیا مگر ڈورا بے نیل ومرام ہی رہی۔ دوسرے

دن پھر وہ اسی جگہ بچے کو لے کر بیٹھ گئی۔ اور خشخاش کے پھولوں کا ایک ہار بنا کر بچے کی ٹوپی میں لپیٹ دیا تاکہ اس کی دل کشی میں اضافہ ہو جائے۔ اور ایلین کی نظروں میں حسین تر معلوم ہو۔ آخر ڈورا کی خواہش پوری ہوئی۔ ایلین نے اسے دور سے بیٹھے ہوئے دیکھا اور اُس کے پاس آیا۔ اور پوچھا "ڈورا تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ یہ کس کا بچہ ہے۔ تم اسے کیوں کھلا رہی ہو" ڈورا کی نظریں جھک گئیں اور اُس نے نہایت آہستہ سے جواب دیا "چچا جان! یہ ولیم کی نشانی ہے"۔

ایلین۔ میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔ بولو کیا میں غلط کہتا ہوں۔

ڈورا۔ چچا جان! بے شک میں مجرم ہوں۔ خطاوار ہوں۔ مجھے آپ جو سزا چاہیں دیں مگر آپ خدا کے لئے اس بچے کو لے لیں۔ ولیم اب اس دار رنج و محن میں نہیں ہے۔ وہ سکھ کی نیند قبر میں سو رہا ہے۔ اِس کا کوئی نگہبان نہیں ہے۔ یہ معصوم ہے بے خطا ہے۔ اس پر رحم کیجئے۔

ایلین۔ مجھ سے مکاری کرنے آئی ہے۔ دور ہو جا۔ نظر کے سامنے سے ہٹ جا۔ صورت مت دکھا۔ تجھے نہیں معلوم کہ میں جو کچھ کہتا ہوں کر دکھاتا ہوں" یہ کہتے ہی بچہ کو ڈورا کی گود سے چھین لیا اور چلا گیا۔

ڈورا حسین و جمیل ڈورا کے شجر حیات میں پہلے ہی گھن لگ چکا تھا۔ اب تو بالکل ہی مرجھا گیا۔ محزون و رنجور۔ سراپا الم و تصویر حیرت بنی بیٹھی رہی۔ آخر اندھیرا چھا جانے کے بعد میری کے پاس پہونچی۔ میری نے بچے کو اس کی گود میں نہ دیکھا تو اسے رنج ضرور ہوا۔ مگر خدا کا شکر بجا لائی۔ ڈورا نے اسے پورے واقعہ سے آگاہ کیا اور کہا اب میں تمہیں چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔ محنت مزدوری سے جو کچھ حاصل ہو گا اس پر گذر اوقات کروں گی۔ میری بھلا کب گوارا کر سکتی تھی کہ ایک اس کی خاطر ڈورا جیتے جی جہنم میں جھونک دی جائے۔ اس نے کہا بہن ڈورا! میری حمیت تو اس کو گوارا نہیں

کرتی کہ تم محض میرے لئے بحر حوادث کی نذر ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سفینہ جو کل تک سیر ساحل کے مزے لوٹ رہا تھا۔ آج طوفانی موجوں کے تھپیڑے میں دیدیا جائے۔ چلو ایلین کے پاس چلیں۔ میں اس کی منت کروں گی کہ وہ میرے لال کو مجھے دیدے میں اس کی سماجت کروں گی کہ وہ تمھاری خطا معاف کر دے۔ اگر وہ میری الحاح وزاری پر ترس کھائے تو فہو المراد۔ ورنہ پھر تو ہم دونوں کا زندگی کا ساتھ ہے۔ دونوں محنت و مشقت کریں گے اور ولیم کے بچے کی پرورش کریں گے۔ خدا کے فضل سے امید ہے کہ وہ دن دور نہیں جب وہ جوان ہوگا اور ہماری مدد کرے گا"

جب وہ دونوں ایلین کے دروازہ پر پہنچیں تو اسے کھلا پایا۔ اندر جھانکا تو دیکھا کہ ایلین بچے کو کھلا رہا ہے اور پیار کر رہا ہے۔ دونوں یہ امید افزا رنگ دیکھ کر فوراً اندر داخل ہوگئیں۔ مگر ڈورا میری کی اوٹ میں ہی رہی۔ میری نے کہا "بزرگوار محترم۔ مجھے معاف فرمائیں میں نے مدت العمر نہ تو اپنے لئے آپ سے کوئی سوال کیا اور نہ ولیم ہی کے لئے۔ مگر آج معصوم ڈورا کے لئے آپ کے سامنے دست سوال دراز کرتی ہوں۔ اس کی خطا معاف فرمائیں وہ آپ سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔ اس پر رحم کیجئے۔ نہیں تو وہ مر جائے گی۔ آج دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو ولیم کی خوش مزاجی۔ نیک نفسی اور پاک طینتی کا مداح نہ ہو۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے مجبور تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ محبت کی گرفت کتنی سخت ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ایک صابر و شاکر رفیقہ زندگی رہی ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ولیم کو جیتے جی اپنے باپ سے بچھڑ جانے کا انتہائی قلق تھا وہ اکثر بحسرت لہجہ میں کہا کرتا کہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے عظیم ترین جرم کا ارتکاب کیا ہے ـــ میں اپنے باپ کی مرضی نہ پوری کر سکا۔ خدا اس پر رحم کرے اور تا زیست اسے میری مصیبتوں کا علم نہ ہو۔ اسیطرح وہ اپنی غلطی پر کف افسوس ملتے ہوئے دنیا سے چل بسا۔ خدا کے لئے غصہ حرام کیجئے" میری زندگی کا صرف ایک ہی سہارا میرا ننھا سا رول رہ گیا ہے اسے مجھے دیدیجئے

ایک ننھے بچے کے لئے ماں کا آغوش ہی فردوس ہے۔ اسے آپ کے پاس حقیقی راحت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔"

سب خاموش تھے ایک سحر سکوت در و دیوار پر چھا گیا تھا۔ سناٹے کا یہ عالم کہ صحرا میں دوپہر کے وقت کھڑے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ایلن کا دل بھر آیا۔ واقعات گذشتہ کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی۔۔۔ اکلوتے بیٹے کی جواں مرگی کس سنگدل سے سنگدل انسان کے دل کو موم نہ کردے گی۔ وہ سسکیاں لینے لگا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور کہا "نہیں! نہیں! میرے ولیم۔ تمام خرابیوں کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ میں نے دیدہ و دانستہ تجھے اپنے ہاتھ سے کھویا۔ مجھے معاف کردو۔ خدا گواہ ہے میں تمہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ (ڈورا اور میری طرف دیکھ کر) پیارے بچے آؤ۔ مجھے پیار کرو۔ دونوں ایلن سے لپٹ گئیں اور خوب روئیں ڈورا کا وہ پرانا خیال صحیح نکلا مگر کب۔ ع

ہوش کب آیا ہمیں جب ہو چکا ناکام دل
رحم کب آیا انھیں جب ہو چکے برباد ہم

کچھ دنوں کے بعد میری نے دوسری شادی کرلی۔ مگر مصدر وفا ڈورا نے اپنی تمام عمر دوشیزگی میں بسر کردی پیارے ولیم کی یاد میں۔ سچی محبت اسے کہتے ہیں۔

(ترجمہ از ٹینسن)

آل انڈیا جوتا کانفرنس

از

توفیق سال دوم

ایک شب عالم رویا نے مجھے جوتوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔ وہاں ہر قسم کے جوتے تھے۔ اونچی ایڑی کے نیچی کے، سیاہ، بادامی۔ دیسی۔ ولایتی۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تھے از کار رفتہ۔ یہ کوئی دنیا سے اوپر بات نہ تھی۔ خوابوں میں کیا کچھ نظر نہیں آجاتا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی نہایت نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ آپ کی ہماری طرح باتیں بھی کر رہے ہیں۔ میرے دل میں اس معمے کے حل کرنے کی خلش پیدا ہوئی۔ مگر جلد ہی اور معمولی کاوش کے بعد میں معاملہ کی تہہ کو پہنچ گیا۔

ایک قدیم اور باران دیدہ فوجی ہاف بوٹ کے زیر صدارت جوتا کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ حاضرین میں جوتے بھی تھے اور جوتیاں بھی، تجاویز معرکۃ الآرا مباحث کے بعد منظور یا مسترد کی جا رہی تھیں۔

"حضرات خاموش رہئے۔ اور ایک ایک کرکے بولئے"۔ صاحب صدر نے بلند آواز اور تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"مسٹر براؤن آپ کیا کہنا چاہتے ہیں"

"جناب صدر، خواتین اور حاضرین جلسہ" مسٹر براؤن نے کہنا شروع کیا۔

"آدمی ہمیں اپنے نازک اور کمزور قدموں کی محافظت کے لئے استعمال کرتا ہے بلکہ ہم میں سے کسی کو فنخانی کے بھاری اور بے ڈول قدم کا بار اٹھانے کا بھی تجربہ ہوگا دورانِ استعمال میں یہ ہمیں کچھ خوراک بھی بہم پہنچاتا رہتا ہے جس کا نام اس نے اپنی

زبان میں "روغن" رکھ چھوڑا ہے۔ ہم میں سے چند ہی ایسے خوش قسمت ہوں گے جنہیں روزانہ غذا ملتی رہتی ہو گی ورنہ اکثریت کو ایک ہی خوراک سے مہینہ پورا کرنا پڑتا ہے،
اس قلت غذا سے ہماری نسلیں کمزور ہوتی چلی جا رہی ہیں اور ہم جلد بوڑھے ہو کر قبل از وقت بیکار ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا آقا دوسرا جوتا خرید لیتا ہے اور ہمیں بارش میں استعمال کے لئے یا تو اپنے گودام کے کسی تاریک گوشے میں پٹک دیتا ہے۔ یا کوڑے پر پھنکوا دیتا ہے۔ جہاں فاقہ کشیوں اور موسم کی شدت کے باعث ہم بے کسی کی مرگ کا شکار ہو جاتے ہیں،
آج متمدن اور زندہ اقوام کے روبرو سب سے اہم سوال اپنے بیکاروں کے لئے کام بہم پہنچانے کا ہے۔ یہ موقعہ ہے کہ ہم بھی بیدار ہوں اور مسئلہ کا کوئی خاطر خواہ حل دریافت کریں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔
"نہایت اہم مسئلہ ہے، اس کے حل کی جانب فوری توجہ ہونی چاہیئے۔" ہر سمت سے آوازیں آنے لگیں۔
"جناب صدر" وسط میں سے ایک باریک شیریں آواز آئی۔
"مستورات کو بھی اظہارِ خیال کا موقع عطا کیا جاوے۔"
"اور خاکسار تائید مزید" ایک ہندوستانی گھیتلے نے سر اٹھا کر کہا۔
"آپ کیا فرمانا چاہتی ہیں۔ محترمہ زینت قدم تشریف لائیے۔ صدر نے کہا۔
"تالیوں کی سامعہ شکن آوازیں مس زینت قدم اسٹیج پر چٹکتی مٹکتی آ کھڑی ہوئیں۔
"محترم صدر، خواتین اور معزز حضرات"
میرا ریزولیشن گو برسوں کا پامال مگر نہایت اہم ہے۔ میں اس وقت پردے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کو کھڑی ہوئی ہوں۔

میں نے اپنی زندگی کی بہاریں ایک حسین۔ شریف اور نیک دل خاتون کے قدموں میں گذاری ہیں۔ جو ہمیشہ میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ اور ہر طرح کی خاطر کرتی تھی لیکن میں اقرار کرتی ہوں کہ حقیقی مسرت نہ کبھی مجھے میسر ہوئی اور نہ میری مالکہ کو۔ اور اس تلخ کامی کا باعث یہی گھر کی چہار دیواری تھی جس نے دنیا سے ہمیں اور ہم سے دنیا کو پوشیدہ رکھا۔ گمنامی میں پیدا ہوئے۔ گمنامی میں بسر کی اور گمنامی میں چل بسے۔

اگر موقع دیا جائے تو عورت زندگی کے کسی میدان میں مرد سے پیچھے نہیں۔ جہاں وہ بزم میں کامیاب ہے وہاں وہ چین کی جنگ میں جاپان کے چھکے بھی چھڑا سکتی ہے۔

غرض دنیا آج اپنے بہتر صنف کی قسمت سے بہتر طور پر آگاہ ہو چکی ہے اس لئے حضرات! میں آپ سے اپیل کروں گی کہ آپ ہماری مدد کو اٹھیں اور ٹرکی اور ایران کی طرح اس حبس بیجا کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں۔"

تقریر کے بعد مس صاحبہ دوبارہ اپنی جگہ پر تشریف لے گئیں۔

"پردے میں آپ کی سرگرمیاں کسی قیامت سے کب کم رہی ہیں جواب باہر تشریف لانے کا بھی قصد ہے"۔ ایک سمت سے آواز آئی۔

"چپ ہو جاؤ۔ بڑے میاں۔ اولڈ فیشن" دوسرے جانب سے شور بلند ہوا۔

غرض ایک ہنگامہ برپا تھا۔ بیک وقت ہزاروں موافق و مخالف آوازوں کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

"آرڈر پلیز .... حضرات خاموش رہیے"۔ صدر نے کسی قدر ناگواری کے ساتھ کہا۔

"اس مسئلے پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اسے میرے فیصلہ پر چھوڑ دیجئے۔ اچھا مسٹر بلیک آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں۔؟ تشریف لائیے"۔

جناب صدر و حاضرین۔ مسٹر بلیک نے کہنا شروع کیا۔

"بدیشی جوتوں کی غیر معمولی درآمد نے دیسی جوتوں کے لئے بازار میں کوئی گنجائش

نہیں چھوڑی ہے۔ اور ہماری مانگ دن بدن کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور اس صورت حال کا فوری انسداد ہونا چاہیئے۔

بیرونی جوتوں کی ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ ہو کر لوگ انہیں خریدتے ہیں۔ اور ہم جو اس ملک کی پیداوار ہیں دوکانوں میں پڑے پڑے سوکھا کرتے ہیں۔ ہمیں ان بدیشیوں کو اپنے ابا ؤ اجداد کے ملک سے نکال کر ان کی جگہ خود نمائشی الماریوں کی زینت بن جانا چاہیئے۔

یہ بیرونی حضرات آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ محض دکھاوے کی چیز ہیں۔ مضبوطی اور پائیداری سے انہیں دور کی بھی نسبت نہیں ہے یقین کیجئے کہ اگر آج فرقہ وارانہ اختلاف مٹا کر ہم کالے، بادامی، سرخ، سفید سب ایک ہو جاتے ہیں۔ تو کل ان بدیشیوں سے اپنا اقتدار منوا سکتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ انہیں ہمارے ملک میں آ کر دخل در معقولات کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ کیا ہم اپنے معاملات کو سلجھانے کی اہلیت نہیں رکھتے"؟

"غیر ملکی جوتے استعمال نہ کرو۔ ملکی جوتوں کا جھنڈا بلند کرو وغیرہ وغیرہ"۔

جلسے سے ہزاروں انقلابی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اور تھوڑی دیر کو سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ سنجیدہ و متین صدر جو اس وقت تک بیٹھا ہوا تمام تجاویز پر غور کر رہا تھا۔ اٹھا مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔

"معزز حضرات" صدر نے کہنا شروع کیا۔

وقت زیادہ گذر چکا ہے اور آپ لوگوں کو آرام کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں آج کی کارروائی کو یہیں پر ختم کر کے بقیہ کو دوسری نشست کے لئے چھوڑتا ہوں۔ لیکن جانشست کرنے سے قبل میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جملہ تجاویز کے متعلق اپنی رائے کا بھی اظہار کر دوں مسٹر براؤن کی تحریک کے متعلق میرا خیال ہے کہ اگر ہم ہندوستانی جوتے اپنی شکل و صورت کو جلد نہ بگاڑا کریں۔ اور ایڑی اور تلووں کو زیادہ دیر تک قائم رکھ سکیں تو کوئی

وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے مالک پھر بھی قدر نہ کریں۔ اپنی کمزوریوں کو نظرانداز کر لینا اور دوسروں پر اعتراض کرنا۔ دیانت داری کے خلاف ہے۔

مس زینت قدم کی تحریک سے مجھے کامل اتفاق ہے۔ اس زمانے میں کامیابی کا راز یہی ہے کہ ہمیں پردہ کو فوراً ترک کر دینا چاہیئے اور اس کی آسان صورت یہ ہو سکتی ہے۔ کہ ہماری بہنیں اپنی مالکاؤں سے عدم تعاون کی ٹھان لیں۔ کبھی بڑی اور کبھی چھوٹی ہو جایا کریں۔ غرض پوری نہ اتریں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ گھر کی بیٹھنے والی اپنے خاوندوں کو حکم دینے کے بجائے آپ دوکانوں پر جا کر اپنی مرضی کے مطابق جوتیاں خریدنے لگیں گی۔ اور اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

"ہیر ہیر، خوب مشورہ ہے بمعقول رائے"؛ جوتیوں کی گیلری سے شور بلند ہوا۔

"اب رہ گیا مسٹر بلیک کا سوال"؛ صاحب صدر نے کہنا شروع کیا۔

"اس میں شک نہیں کہ غیر ملکیوں کی درآمد ہماری ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی مزاحمت ہے۔ کیونکہ ظاہر اعتبار سے وہ ہم سے زیادہ دلکش ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنی روایتی پائیداری کو برقرار رکھ سکے اور مقابلے پر جمے رہے تو یہی ہماری زیادہ عرصہ تک کارآمد رہنے والی خصوصیت ایک دن ہمیں کامیابی سے بغلگیر کرا دے گی۔

شوز باید کہ ہراساں نہ شود

ان الفاظ کے ساتھ اس عزت افزائی کے لئے ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں جلسہ کو برخاست کرتا ہوں"۔

"زندہ باد سودیشی جوتا و پائندہ باد ملکی صدر"

کے فلک شگاف نعروں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے گھبرا کر اپنے جوتے کو دیکھا۔ اور اس کو موجود پا کر خدا کا شکر ادا کیا۔

رباعیات

محمد یوسف صاحب ناظم متعلم سال اول عثمانیہ کالج اورنگ آباد

جذبات ہیں ناظم ہے قیامت کا تلاطم
تسنیم کی موجوں سے جو کرتا ہے تصادم
اشکوں کے سمندر کے تموج کو نہ پوچھو
یہ بحر ہے وہ جس میں ہے ہستی کا پا گم

چشم کم ظرف کو منظور یہ جدت کب ہے
دلِ نازک کو پسند شمس کی حدت کب ہے
نغمۂ بلبلِ شیدا کو بھلا اے ناظم
گوشِ دل سے جو سنے گل کی یہ فطرت کب ہے

نوحۂ غم

از

جناب مولوی مظہر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے

دنیا میں زندگی اور موت کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے تعمیر و تخریب فطرت کا ایک ابدی تماشا ہے جو ازل سے اس وقت تک جاری ہے اور ہمیشہ رہے گا جس طرح دنیا میں ہر لمحہ۔ ہر گھڑی زندگی نئی نئی شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور نئے نئے قالب اختیار کرتی ہے۔ اسی طرح فطرت پرانی شکلوں کو مٹاتی ہے اور ان کے آثار کو بھی محو کر دیتی ہے۔

سبھی جانتے ہیں کہ موت ایک یقینی اور ناگزیر شے ہے جس سے بچنا محال ہے لیکن اس علم کے باوجود شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو موت سے متاثر نہ ہوتا ہو۔

موت کسی کی بھی اور کسی حالت میں کیوں نہ واقع ہو اپنے اندر صدہا سامان رنج و الم۔ اور موعظمت و عبرت رکھتی ہے۔ کون ہے جو دوستوں اور عزیزوں کی موت پر آنسو نہ بہاتا ہو۔ اور تھوڑی دیر کے لئے عنانِ ضبط اپنے ہاتھ سے نہ کھو دیتا ہو۔ جب کوئی بزرگ اُٹھ جاتا ہے تو ہر فرد بےچین و بے قرار نظر آتا ہے۔ ہر سینہ فگار۔ ہر آنکھ اشکبار ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی عظمت و رفعت بھی مرنے والے کے ساتھ پیوند خاک ہو جائے گی۔ یہی حال قوموں کا بھی ہے دنیا میں بہت کم لوگ ایسے پیدا ہوتے ہیں جو حقیقی عظمت کے مالک ہوں جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے قومی زندگی کی آبیاری کی ہو۔ جن کی ذات ملک و قوم کے لئے نازش و افتخار کا باعث ہو۔ مگر جب کسی ایسے شخص کی موت واقع ہوتی ہے تو قومی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جس کو پُر کرنا مشکل ہوتا ہے ایسے افراد کی موت ایک زبردست قومی نقصان ہے جس کی تلافی

صدیوں تک نہیں ہوتی ہو پھر قوم ان کو کیوں نہ روئے اور ان کے ماتم میں سیہ پوشی کیوں نہ اختیار کرے۔

اقبال کی موت ہمارے لئے قیامت صغریٰ سے کسی طرح کم نہیں صدیوں کے بعد ایک ہستی پیدا ہوئی تھی جسے پنجۂ موت نے ہم سے چھین لیا۔ اور ہمارے دلوں کو فگار اور سینوں کو داغدار کر دیا۔ آہ! وہ الفاظ کہاں سے آئیں جن سے ہم اپنے جذبات غم کا اظہار کر سکیں۔ شدتِ غم سے آنسوؤں کا دریا خشک ہے اور ماتم و فغاں کی زبان بند۔ کیونکہ چمنستان ادب کا حسین ترین پھول کملا گیا۔ شاعری کے باغ سے شادابی رخصت ہو گئی، عروسِ سخن سوگوار ہے۔ کہ اس کا سہاگ لٹ گیا۔ اور اس کی زینت و آرائش کا سامان چھن گیا۔ شعر و سخن کی محفل سونی ہے کہ اس کا طائر خوشنوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اب کون ہے جس کی زمزمہ سنجی سے دردمند قلوب اپنے زخموں کے لئے تازگی اور اپنی روح کے لئے سوز و گداز کی غذا حاصل کریں گے۔ کس کی آنکھیں زوال ملت پر خوں بہ فشانی کریں گی کس کا قلب مسلمانوں کے مصائب پر رنج و الم سے بیقرار ہوگا۔ کس کی زبان یاس و ناامیدی کی فضائے تاریک میں امید کا پیغام سنائے گی اور دلوں کو دردِ ملت سے آشنا کرے گی۔ آہ! موت نے ہمارے سرمایہ ملی کا راس المال ہم سے لے لیا۔ اور ہماری متاع ذہنی کا سب سے زیادہ خوش آب موتی ہم سے چھین لیا۔

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں بہ فشاں اور

اقبال کا پیغام

اقبال کی قدر و منزلت ہمارے دلوں میں اسی لئے نہیں ہے کہ اس نے ہماری زبان و ادب کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا اور ہماری شاعری کے لئے جس کے خیالات و افکار کا دائرہ اب تک تنگ تھا ایک نئی شاہراہ کھول دی۔ اقبال کا مایہ ناز کارنامہ تو وہ پیغام زندگی ہے جس کے لئے اسلام مدت سے

گوش بر آواز تھا جس نے مسلمانوں کو غفلت کی نیند سے چونکایا اور انھیں اخوت اسلامی کا درس دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت جمال الدین افغانی رح کے بعد عالم گیر اسلامی اخوت کا اگر کوئی علمبردار تھا تو وہ اقبال ہی تھا۔ اقبال کی شاعری میں جو چیز بمنزلہ روح کے ہے وہ یہی پیغام اخوت اور درس اتحاد ہے۔ وطنیت اور قومیت کے جدید تخیل کے خلاف اقبال نے جس بے باکی سے اپنی صدائے مخالفت بلند کی وہ اس کی اخلاقی جرأت کی دلیل اور اس پر شاہد عادل ہے۔ اقبال نے محسوس کیا کہ وہ وطنیت اور قومیت، موجودہ دنیا جس کی دلدادہ ہے اور جو تہذیب جدید کی اساس و بنیاد ہے ان اوہام باطلہ میں سے ہے جنھوں نے وحدت انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس کی نگاہوں نے اس راز کو پا لیا کہ قومیت کا یہی محدود تصور امن عالم کا غارت گر اور اخوت انسانی کے لئے سم قاتل ہے۔ اس کے بجائے اپنے اسلام کا وہ تصور حیات پیش کیا جو قوموں اور جماعتوں کو شیرازۂ اخوت میں جوڑتا ہے۔ اور انسانی قلوب میں محبت کی تخم ریزی کرتا ہے اور بغض و عداوت کے جذبات کو مٹاتا ہے۔ یہ تھا اقبال کا پیغام جس کے لئے وہ دنیا میں آیا تھا جس کے لئے اس نے اپنی عمر عزیز صرف کی اور جس کی آرزو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ اقبال کی شاعری کی یہ خصوصیت جو اس کا وصف امتیازی ہے جس کا فقدان شاعری کا ایک تاریک پہلو ہے اس کی رجائیت ہے جو ہماری کشت امید کو شاداب رکھتی ہے اور دلوں سے حزن و الم دور کرتی ہے۔ اردو شاعری پر اب تک یاس و حسرت اور رنج و الم کے جذبات کا غلبہ رہا ہے جس کی وجہ سے وہ قومی زندگی کے ضعف اور حیات اجتماعی کے اضمحلال کا سبب بنی رہی۔ خواہ وہ اپنے رنگ میں کیسی ہی کامیاب ہو۔ ہمارے شعرا کا بیشتر حصہ زندگی کے بجائے موت اور نشاط و مسرت کے بجائے حزن و یاس کا پیغامبر ہے۔ ہماری شاعری نغمۂ نشاط نہیں بلکہ نوحۂ غم ہے جس سے درد و الم کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور رنج و الم کا سرمایہ لئے ہوئے جس دل تک پہونچتی ہیں

اسے امید وولولہ۔ خواہش حیات اور جوشِ عمل سے خالی کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس اقبال کی شاعری بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کا رخ روشن پیش کرتی ہے۔ دلوں کو گرماتی ہے اور امید کو تازہ کرتی ہے اور دنیا کو مژدہ عبرت اور نوید کامرانی سناتی ہے یہ وہ چشمہ رواں ہے جس کا پانی انسان کو زندگی بخشتا ہے اور اس کی روح کو بالیدہ اور اس کے جسم کو تازہ کرتا ہے یہی ہے جس سے قومی زندگی کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اور اس کا درخت برگ وبار لاتا ہے۔

پھر اب کون ہے جو اس سوکھی ہوئی کھیتی کو پانی دے گا اور اس میں عمل پیہم اور یقین محکم کے وہ بیج بوئے گا جن سے قومیں پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی ہیں!!!

کیمیا کی تاریخ

از

محمد عبدالحمید متعلم ایف ۔ ایس ۔ سی ۔ سال اوّل عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد

لفظ کیمیا کے متعلق لاانتہا قیاسات قائم کئے گئے ۔ اس کی حرفی، معنوی، اور اصولی بندشوں پر متعدد و مختلف رائیں ہوئیں ۔ بعض اسے الکیمیا (عربی الکیمی) سے مشتق ثابت کرتے ہیں، اور قرونِ وسطیٰ کے عرب اس کی تعریف یوں کرتے ہیں :-

"ال کیمیا قرونِ وسطیٰ کا ایک کیمیائی علم یا قیاسی فلسفہ ہے، جس کے اہم عملیات اور مقاصد عناصر اصلی کو سونا بنانے، تمام بیماریوں کا ایک واحد علاج تجویز کرنے، اور عمر کو طول دینے پر مبنی ہیں"

اس کا ماخذ کائمیس (Chimus) ہے، جس کے معنی رس یا ست کے ہیں۔ جس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ علم پہلے پہل علوم ادویات کی صرف اس شاخ تک محدود تھا جس میں معالجات کے لئے پودوں کا عرق نکالنا پڑتا ہے۔

الکیمیا نے اپنے وسیع مشاهدات و تجارب کے باعث علمی سائنس کے اندر حیرت ناک انکشافات کئے ۔ اور جدید کیمیا کی بنا ڈالی۔

صدیوں پہلے اس کے اصول و طریق عمل عوام میں کچھ آج کل کی طرح عام نہ تھے۔ اور اس کے متعلق یہ عقیدہ مشہور تھا کہ اس علم میں یا اس علم کے جاننے والے عالموں میں یہ طاقت ہے کہ وہ معمولی چیزوں کو غیر معمولی اور قیمتی چیزوں میں متبدل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ شیکسپیر کہتا ہے :-

"زرو نہروں کو فردوسی علم الکیمیا نے مُطلا کر دیا"۔
چنانچہ جب یہ اعتقادات عام ہو گئے تو الکیمیا "سونا بنانے کے علم کے مترادف ہو گیا۔
چنانچہ یہ دور علم کیمیا کا اولین اور ابتدائی دور ہے جو الکیمیائی عہد کہلاتا ہے۔ اور یہ قدیم کیمسٹری کی اساس ہے۔

آج کل کیمیا کی تعریف یوں کی جاتی ہے :۔

"یہ وہ علم ہے جن میں اشیا کے مرکبات اور اُن کی متاثرہ تقلیب ماہیت سے بحث ہوتی ہے"۔

طبعیات سے اُسے یوں تمیز کرتے ہیں کہ "طبعیات قوانین طبعی کا مجموعہ ہے ۔ جو تمام کائنات پر حاوی ہے ۔ اور اس علم میں ان مذکورہ بالا قوانین کے باعث اشیائے عالم پہ پڑنے والے اثرات کا بالتوجیہہ مطالعہ کیا جاتا ہے لیکن کیمیا میں خود اشیاء سے بحث ہوتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ قدیم زمانے میں کیمیا کا دوسرا نام الکیمیا تھا۔ جو عربی الکیمی (Alchemy) سے مترادف ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ طبی عروج کے اثرات نے کیمیا میں جائے امتیاز حاصل کی اور یہ قدیم الکیمی بعد میں چل کرا دویاتی الکیمیا (Iatrochemistry) کے نام سے موسوم ہونے لگی۔ اور کیمیا نے اس رنگ میں اپنی اساس نباتی جڑی بوٹی کے خواص واثرات، اور تیاری نسخہ جات امراض پہ قائم کر رکھی تھی ۔ یہاں تک کہ رابرٹ بائل (۹۱-۱۶۲۷) تک یہ علم دیگر علوم کا محض ایک محدود شعبہ سمجھا جاتا تھا اور اُس کی عروج پسند رفتار ماحول کی دردناک نامساعدت کے باعث بالکلیتہً مدھم یا تقریباً مفقود ہو چکی تھی۔

ایک لحاظ سے بہترین اور سہل تخیل جو لفظ "کیمیا" کے منبع و ماخذ کے متعلق سمجھا جا سکتا ہے ۔ وہ دراصل مصر کے قدیم نام کھیم یا کیم سے مشتق ہے جس کے معنی "سیاہ" ہیں۔ وجہ تسمیہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ مصر کی سیاہ سرزمین پہ اطراف نیل کی جنت سواد وادیوں میں زمانہ دراز سے لیلائے علم کے جلوے شباب کی لہروں میں مچل رہے تھے۔ تحقیق

لفظی میں ہمارا یہ استخراج صحیح ہو یا غلط۔ البتہ یہ وثوق کامل کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قدمائے مصر اپنے ہمعصروں و دیگر اقوام کی بہ نسبت کیمیائی تجربات سے گہری واقفیت رکھتے تھے اس لئے کیمیا کو "مصری سائنس" کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔

لیکن مصری ہی کیمیا کے واحد اجارہ دار نہ تھے۔ بلکہ کلدانی چینی اور ہندو بھی بپیہم تجربات کے بعد علم کیمیا کے آزمودہ کار مسائل اور تحقیق طلب تعاملات سے اگر کلیتہً نہیں تو جزاً ضرور واقف ہو چکے تھے۔ اور معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ ہر قوم کے بزرگان سلف نے تجربات کی توانائی سے دماغ بازی کے کرشمے دنیا کو دکھلا دکھلا کر حقیقت کی شرمسار معشوقہ کو پا لیا اور صحت الفاظ کی خراد پہ اسے ڈھال کر کلیہ کی صورت میں پیش کر کے اس علم کی توسیع و ترقی میں معتدبہ اضافہ کر گئے۔

حکمائے قدیم کے ذخیرۂ کیمیائی کو ان کے استعمار تمدن کے اندر، عوام کے خیالی اور اعتقادی روزنوں سے، بہت کچھ جھانکا اور آنکا جا سکتا ہے۔ دھات گری دفلزاتی، شیشہ سازی، رنگریزی، مختلف النوع زہر و روغن کی صنعت، صابن سازی و مومیائی، نیز لووایاتی نسخہ جات ہی وہ مضامین مخصوصہ تھے جن پر علمائے ماسلف کی اجتماعی توجہات کا ماسکہ بہت آب و تاب سے پڑ رہا تھا۔ پس کیمیا یا تو علمی تھی یا آزمودہ کار تجربات اور تعاملات کا ست۔ لیکن نقص یہ تھا کہ کسی شے کے متعلق نظریات اور قیاسات تھے بھی تو وہ تخیل کی رام کہانی بنے رہے، اور ماحول کی تساہل آفرینی، زمانے کی نامساعدت اور وسائل کی دردناک قلت کے باعث انہیں کوئی ٹھوس اور منظم العمل اساس مل نہ سکی اور ان کی خود ساختہ تعمیر تخیل ان ہی خرابیوں کے باعث زمانے کے محک آزمائی کی تاب نہ لا کر خود ان ہی کے سر گر پڑی۔ اور پتہ نہ چلا کہ معمار کدھر گئے اور ان کی داستان پارینہ کے اوراق کہاں اور کدھر بکھرے۔

تاریخ سائنس کے نکتہ شناس، ماخذات قدیم کے تہذیب نواز دفینوں، کے زبانی یہ کہانی

سننے میں آئی ہے کہ پہلی اُصولی کیمیا دانشمندان یونان نے تعمیم کی تھی۔ فیثا غورث۔ ہرکلیٹس ہاسپوکریٹس۔ ڈیموکریٹس۔ پلوٹو۔ ارسطاطالیس۔ ڈیوسکورڈس۔ ڈسمس وغیرہ دیگر کئی کیمیا دانوں نے ... ا تا .. ۲ ق۔م۔ کے طویل زمانے میں کیمیائی قیاسات کے صدق وصحت کی مساحت فرمائی کے لئے عملی آزمائشات ومشاہدات کی اکائیاں مدون کیں۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے کیمیائی تعاملات کا علم ان یونانیوں کو بھی اُن غیر معروف الاسم پیشروؤں کے ذریعے ہوا جن کی نسبت تاریخی زبان تا ہنوز گُنگ ہے۔

ان یونانیوں کے متعلق یہ امر بھی بدیہی طور پر ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ یہ لوگ اہل صنعت تھے۔ وغیرہ یہ بھی کہ تعلیم یافتہ یونانی فطرتاً خیالستانی ضوابط بندیوں کے مسطح میدانوں کی فرس آزمائی کو چھوڑ کر کیمیا کے تجرباتی اور عملی حصے کی ناہمواریوں میں سر ٹکرانا زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔

ترکیب مادہ کے متعلق یونانی نظریات یہ تھے کہ "دھاتوں کی تقلیب ماہیت ممکن ہے" یہ غلط فہمی یوں پیدا ہوئی کہ جب نیلے توتیئے کے محلول میں لوہے کا پھل ڈالا گیا تو اُس پر تانبا جم گیا۔ ایسے ہی کئی مشابہ اثرات میں ان کو اپنے زرین مستقبل کے خواب دکھائی دیئے اور کرۂ ارض پر طلائی تار کھنچتے محسوس ہوئے اور اسی بنا پر اُنہوں نے تمام زمینی عناصر کو مسئلہ خدا کی حسین گتھیوں میں گننے کی سعی بے حاصل فرمائی چنانچہ عناصر تو شاطر چور کی طرح کھیل پڑے اور قیاسات ومفروضات کی ناپیش بینیوں کے باعث انھوں نے جس قدر سلجھانے کی کوششیں کیں، معشوق فطرت کا نقاب اور اُلجھتا گیا۔ وہ قیاس کے پیش پا افتادہ سائے کو حقیقت کے جسم اصلی سے ممیز نہ کرسکے اور قیاس کے ذریعہ حقیقت کو گرفتار کرنا چاہا حالانکہ سائے کو جسم اصلی سے بغاوت کرنے کی اور بذات خود جسم پر متصرف ہوکر محض اپنے وجود کو باقی رکھنے کی تا ہنوز جرأت نہیں ہوئی لیکن ان کا خیال تھا کہ اگر مسئلہ تبدل ماہیت (Transmutation Theory) میں اگر فی الواقع کوئی حقیقت ہے تو ادنیٰ دھاتوں کو سونے میں کیوں نہ تبدیل کیا جائے۔

وہ سونا جو زمانۂ جنگ کا قوت بازو، اور عیش و آرام کا مستقل دستاویز ہے۔ یہ ایک طفلانہ حماقت تھی جو دل کے ابتدائی دلچسپیوں کی گدگداہٹ کا آغاز لے کر مدہوش کن اختلاج کی انتہا پر آکر رُک گئی۔

چنانچہ اسی نقطہ نظر سے اس عالم انگیز مگر گمراہ کن، چوٹی سا مگر پاتال انداز، دلچسپ مگر غلط، مسئلے پر حکمائے یونان مدت بے پایاں سے ہر آن سے عقلمندی کے بان چلا چلا کر اس طرح عناصر عالم کو چھان رہے تھے گویا اب پہاڑ نہیں رہیں گے مگر مخروطات طلائی، البیلی ندیاں نہ ہوں گی مگر نقرئی رسیاں اور موجیں نہ ہوں گی مگر ان رسیوں کے قدرتی بل پیچ۔ مگر نتیجہ کیا نکلا: "وہی ڈھاک کے تین پات"، "کوہ کندن کا اختتام کہاں ہوا" "کاہ برآوردن پر"۔ نہ ادنیٰ دھات سونا بنی نہ وہ پہلی کی سی دہات رہی۔

جب فلسطین اور ایران کی سلطنتیں اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ کر رہ گئیں (ساتویں صدی عیسوی) تو مسلم فاتحین نے قیام و دوام حاصل کرنے کے بعد تعلیم کو تقویت دینا شروع کیا، اور یونانیوں کی وہ سہل الحصول کتابیں جو زمانۂ جنگ کے ہنگاموں، اور آب و آتش کے دیوؤں سے نسبتاً محفوظ رہیں ترجمے کئے جانے لگیں۔ یہ تراجم بالراست یونانی سے عربی میں منتقل نہیں کئے گئے بلکہ سریانی کے توسط سے یہ کام عظیم پایہ تکمیل کو پہونچا۔ اس طرح یونانی کیمسٹری سے عرب واقف ہوتے گئے اور اُنھوں نے بہت جلد سائنس سے گہری دلچسپی لینا شروع کی اور چونکہ وہ مالک مصر بھی تھے اس لئے اُنھوں نے یونانی کیمسٹری کے خیالات و قیاسات کو مصر کے عملیات و تجربات سے وصل کر کے تصورات کی لجالو محبوبہ کو ٹھوس حقائق کی عملی پوشاک پہنائی اور فلسفہ عشق کی یہ اُلجھی ہوئی گتھی یوں سلجھ گئی۔

کیمیا پر عربی محسنوں کے احسانات اصطلاحات کی صورت میں اب بھی نظر آجاتے ہیں جیسے الکیمیا (Alchemy) کیمیائے محض ہے "ال" بمعنی مسب' "الانبیق" (Alembic) عربی قرنبیق یا بھبکے کی ایک قسم ہے (Alude l)

ایک عجیب قاعدہ ہے۔ الکوحل، عربی غول ہے۔ جو ایک قسم کا سیاہ پوڈر ہے جو غالباً سیسے اور انٹی مونی سلفائیڈ کا کوئی مرکب ہوگا جس کو زمانہ قبل کی شریف خاتونیں اپنے بھنووں اور پلکوں پر ملتی تھیں۔ اس مرکب کا روح شراب میں متبدل ہوجانا ایک معجزہ ہے۔ جس کا پیراسیلزس ذمہ دار ہے۔

ازمنہ قدیم کے حکماء عرب میں جابر ابن حیان بہت ممتاز ہے جو آٹھویں صدی کا حکیم ہے۔ ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی (متوفی ۹۲۵ ع) ابوالحسن علی الاندلسی جو ابن عروز اسی کے نام سے بھی مشہور ہے (متوفی ۱۱۹۷ع) ابوالقاسم محمد ابن احمد العراقی (تیرھویں صدی) اور عزالدین اور امیر علی الجلد کی (متوفی ۱۳۶۱ع) ۔ ان میں جابر کی شہرت بہت ہے۔ لیکن الرازی اپنے کیمیائی تعاملات کی مخصوص تشخیص کے باعث نسبتاً بہترین کیمیا داں سمجھا جاتا ہے۔ جابر کی نسبت مشہور ہے کہ اس نے کیمیا پر پانچسو کتابیں تصنیف کیں جن میں سے صرف چند باقی ہیں۔ ابن عرفہ۔ اس نے علم الکیمیا پر ایک مسلسل نظم موسومہ طلائی ریزے (Particles of Gold) لکھی جس کی بہت سی نقول نمائش گاہوں میں تاحال موجود ہیں۔ نیز ابوالقاسم سے ایک اہم کتاب الکتب منسوب کی جاتی ہے جس میں کیمیا کے اہم نظریات و تعاملات کا ایک مکمل اور مبسوط بیان ہے۔

اسلامی سلطنتوں کے مغرب بعید میں اندلس (اسپین) کا صوبہ واقع تھا جہاں پر کیمسٹری نے یورپ میں بطور سائنس کے اپنی جڑیں مضبوط کی ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی علم دوستی اور مہربانیوں سے یورپ میں عموماً اور اسپین میں خصوصاً سائنس کو خوب ترقی ہوئی اور اگر مغرب میں مسلمانوں کو شکستوں پر شکستیں نصیب نہ ہوتیں تو دور حاضرہ کی کیمیا ہم کو ترقی و عروج کے سمت الراس پر چمکتی اور دمکتی نظر آتی۔ فتح و شکست کی ان ہی کشاکشوں میں سائنس کو کلاً اور کیمسٹری کو جزواً ایسی چوٹیں آئیں جن کا تریاق نہ تھا۔

اسپین سے کیمیا کی تعلیم رفتہ رفتہ باقی تمام یورپ میں پھیلتی گئی اور قرون

وسطیٰ کے یورپین کیمیا داں بلا تعصب اس معاملے میں مسلموں کو اپنا محسن سمجھتے تھے
اُن کو اس حقیقت کا شاید علم نہ تھا کہ مسلمان اپنے نشأۃ الثانیہ میں خود یونانیوں کے خوشہ
چین تھے۔

جب کیمیا کے پیر یورپ میں کافی مضبوطی سے جم گئے تو یورپین اقوام نے ایشیائیوں
کی بہ نسبت زیادہ منظم طور پر اُسے ترقی دینا شروع کیا۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک رشحات
دلیل کے پیہم تقاطر سے حقیقت کی سرزمین قطعاً نرم نہ ہو جائے نتائج کی تخم پروری کا
قیاسی ادّعا فضول ہے۔ تقلید باہمی کی صفت سے وہ متصف ہو کر نکلے اور کئی تصانیف
کو مغربی زبانوں میں ترجمہ کر لیا اور جن کی اصل اگر آج کل ہم کو مل سکتی ہے تو اکثر و بیشتر مغربی
زبانوں میں۔ ذوق پسندی کی ان مذکورہ بالا مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا طریق
نظام ہر لحاظ سے کس قدر مکمل اور سہولت آفریں تھا اور جس نے اسلامی سائنس کی
بنیادوں پر وہ ترقی کی جس کو ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

یوروپ میں قرونِ وسطیٰ کے کیمیا دان روجر بیکن (۱۲۱۴-۱۲۹۲ء) اور
پارسلزس (۱۴۱۵-۱۵۹۳ء) تھے۔ موخر الذکر کے عہد میں مادہ کی تقلیب ماہیت
کا مسئلہ کمزور شمار کیا جانے لگا تھا لیکن اس کی بجائے کوئی اچھی تبدیلی کیمیا میں وقوع پذیر
نہ ہوئی تھی کیونکہ اُس زمانے میں کیمیا ادویات کی بے عذر خادمہ ہو چکی تھی اور کیمیا دانوں کی
تمام تحقیقات تیاریٔ نسخہ جات میں صرف ہونے لگی تھی اور ادویاتی کیمیا کا یہ دور تقریباً
۱۵۰۰-۱۷۰۰ء تک رہا۔

(باقی آئندہ)

انتظامِ قدرت

از

محبوب الٰہی خاں تسحر متعلم سال اوّل

بختیار ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا باپ محنت مزدوری کرکے اپنی تاریک زندگی کے دن کاٹتا تھا۔ اُس کی آمدنی بہ مشکل اتنی تھی کہ اُس کے خاندان کی ضروریات کو پورا کرسکتی۔ روزی کمانے کی فکر اُسے مارے ڈالتی تھی۔ ہر شام جب وہ اُس دن کی مزدوری ختم کرچکتا تو دوسرے دن کا خیال اُس کے لئے سوہانِ روح بن جاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ایک دو دو دن کا فاقہ گذر جاتا۔

آہ مفلسی دُنیا میں کتنے گھر ایسے ہوں گے جو تیری بے پناہ مصائب کا شکار بنے ہوئے ہیں؟ مصیبت آتی ہے تو تنہا نہیں آتی۔ بختیار کا باپ ان مفلسی کی تکالیف کو جھیل ہی رہا تھا کہ اس پر دوسری مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یعنی ابھی بختیار پانچ ہی سال کا تھا کہ موت کے آہنی پنجہ نے اُس کی ماں کو اُس سے جدا کردیا۔

(۲)

ماں کے انتقال کے بعد بختیار اپنی بہن کے زیرِ پرورش رہنے لگا۔ زمانہ ہر گھڑی کروٹ بدلتا رہتا ہے۔ اِس فلکِ جفا شعار کو ابھی اور کچھ گل کھلانے مقصود تھے۔ بختیار ابھی دسویں سال ہی میں تھا کہ گاؤں میں ہیضہ پھوٹ پڑا۔ خاندان کے خاندان تباہ ہوگئے۔ عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ بچے یتیم و یسیر ہوگئے۔ خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔ اسی زمانے میں ایک صبح بختیار کے باپ کو بھی دو دست اور دو قے ہوئیں۔ اور دیکھتے دیکھتے شیر جیسا احمد بے حس و حرکت ہوگیا۔ اور موت کے آغوش میں گہری نیند سوگیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ

ایسے موقع پر معصوم بختیار کے دل پر کیا گذری ہوگی؟ مگر یہ تو اُس کی مصیبتوں کی تمہید تھی بچپن ہی میں جبکہ ہر نفس خوشی کا پیغام لاتا ہے وہ بچپن کی مسرتوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ابھی گھر کے لوگ احمد کو سپردِ خاک کر کے واپس ہی ہوئے تھے کہ بختیار کے بہنوئی نے متلی محسوس کی۔ ساتھ ہی اُسے ایک اُلٹی ہوگئی۔ آدمی پر آدمی دوڑے۔ گاؤں کے حکیم و نیم حکیم سب ہی جمع ہو گئے۔ دوائیں دی گئیں۔ مگر موت کے آگے کسی کی پیش نہ گئی۔ دوسرے روز صبح ہوتے ہوتے مریض نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ کاش موت ہر شخص کے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے آتی۔

(۳)

معصوم بختیار اب اس دُنیا میں بے بس و بے سہارا تھا۔ اُس کے لئے صرف اپنے آپ کو ہی پالنا نہیں تھا بلکہ اُس کے ذمّہ اُس کی بیوہ بہن اور دو کمسن بھانجوں کی پرورش بھی تھی۔ وہ تمام دن محنت کرتا اور جو کچھ لاتا خود کھاتا اور اپنی بہن بھانجوں کو کھلاتا۔ افلاس اور موت دو بڑی مصیبتیں ہیں مگر ان دونوں میں موت آسان اور بہتر ہے۔ بختیار کو دو دن تک کہیں کام نہ ملا۔ تمام گھر میں مسلسل تین وقتوں کا فاقہ تھا۔ بختیار سے اپنے چھوٹے چھوٹے بھانجوں اور آفت زدہ بہن کی بھوک کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ اُس کا دماغ مختلف اور متعدد خیالات کا آماجگاہ بن گیا۔ وہ بڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ آخر کار وہ متبسّم اُٹھا۔ مگر اِس تبسّم میں غم اور خوف ملا ہوا تھا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ سیدھا بازار پہنچا۔ بازار بند ہو رہا تھا۔ اُس کی نظریں آوارہ تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر دوکان کا جائزہ لے رہا ہے۔ بالآخر وہ ایک نانبائی کی دوکان کے آگے رُکا۔ وہ کان اُس کے سامنے بند ہو گئی تھی۔ بھوک نے اُس کے حواس معطل کر دئے تھے۔ بھانجوں اور بہن کی بھوک کی تکلیف اور اُن کا پیچ و تاب کھانا اور تڑپنا اُسے جرم پر آمادہ کر رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر بہن اور بھانجوں کی محبت نے

ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔ وہ دوکان پر چڑھا اور تھوڑی سی محنت کے بعد قُفل توڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور لرزتے ہوئے دوکان میں داخل ہوا۔ وہ پیشہ ور مجرم نہ تھا۔ یہ اُس کی مفلسی کا نتیجہ تھا جو ہزاروں معصوموں سے گناہ کا ارتکاب کراتی ہے۔ اُس کی مطلوبہ اشیاء الماری میں بند تھیں۔ ہر گزرنے والا لمحہ اُس کے لئے ایک ایک سال تھا۔ وہ زیادہ دیر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ الماری مقفّل تھی۔ اُسے کچھ سجھائی نہ دیا۔ اُس نے سراسیمگی کے عالم میں گھونسہ تان کر الماری کے شیشہ پر جمایا۔ اور ہاتھ بڑھا کر چند روٹیاں اُٹھا لیں۔ مگر بُرا ہو بدقسمتی کا کہ دوکان سے نیچے بھی اُترنے نہ پایا تھا کہ پکڑا گیا۔

(۴)

اب دُنیا بختیار کی آنکھوں تلے تاریک تھی۔ وہ غیرت کے مارے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ مگر اُس وقت وہ ایک مجرم تھا۔ کس کو خبر تھی کہ اُس کے جُرم کی تہہ میں کون کون سے وجوہ کام کر رہے تھے۔ اور قدرت کیا انتظام کرنا چاہتی تھی؟ دوسرے روز بختیار کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ بختیار نے اپنے جُرم کا اقبال کیا۔ اور عدالت سے اُسے چھ مہینے کی سزا سنائی گئی۔ قدرت جب کسی کو سنوارنا چاہتی ہے تو مصیبتوں میں سے بھلائی کے راستے پیدا کر دیتی ہے۔

بختیار کے جیل میں ابھی دو مہینے ہی پورے ہوئے تھے کہ وہ ایک روز اپنے ساتھیوں کے اشتعال اور مدد سے نکل بھاگا۔ مگر پھر پکڑا گیا۔ اور اب کی اُسے پانچ سال کی قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔

(۵)

عموماً جس طرح جیلوں میں قیدیوں کو پڑھایا جاتا ہے اسی طرح بختیار کو بھی جیل کے مدرسے میں بٹھایا گیا۔ چونکہ دماغ میں صلاحیت تھی کچھ چل نکلا۔ جب بھی اُسے جیل کے کاموں سے فرصت ملتی کتاب لے بیٹھتا۔ رفتہ رفتہ اُس نے لکھنے پڑھنے میں کافی

مہارت حاصل کرلی اور جیل میں قیدی کی حیثیت سے دفتری کا کام انجام دینے لگا. پانچ سال کے عرصہ میں علاوہ تشویق و ترغیب کے ذاتی محنت و قابلیت سے اُس نے کافی مہارت حاصل کرلی. جب جیل سے رہا کیا گیا تو اُس کی خدمات کا معاوضہ جیل سپرنٹنڈنٹ نے خوش ہو کر ایک زرِ کثیر کی صورت میں دیا. اب بختیار اعلیٰ خیال کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا اُس کی عمر اس وقت بائیس سال کی تھی جیل سے چھوٹنے کے بعد وہ ایک رسالے کے دفتر میں ملازم ہوگیا اور ایک دو سال کے بعد اتنی معلومات اور دولت جمع کرلی کہ جس سے وہ خود ایک رسالہ جاری کرسکے. اُس نے فوراً ملازمت ترک کردی اور ایک قلیل عرصہ میں اپنے تجربہ، محنت، قابلیت اور حُسنِ تدبیر سے ایک کامیاب ایڈیٹر ثابت ہوا.

کسے خبر تھی کہ قدرت اُس بختیار کو جس کا مستقبل اِس قدر بھیانک اور تاریک نظر آتا تھا. اپنے انتظام سے بامِ رفعت و ترقی پر پہنچا دے گی.

اب اس کی مصیبتوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور وہ خوش حال زندگی بسر کر رہا تھا.

نصرتی

اُردو کا پہلا ملک الشعرا

از

محمد اکرام الدین متعلم سال دوم عثمانیہ کالج اورنگ آباد، دکن

یہ تاریخ کا ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ شاہان عادل شاہی بیجاپور، سلاطین بہمنی اور ہمعصر تاجدارانِ گولکنڈہ کی طرح علمار، وشعرا کے بہت بڑے مربّی اور سرپرست تھے۔ یوسف عادل شاہ، بانی سلطنت سے لے کر آخری بادشاہ سکندر شاہ تک اس خاندان کے ہر حکمراں نے اپنے عہد کے ملکی ادیبوں اور علمار کی نہایت قدر ومنزلت کی۔ ان تمام میں اردو اور فارسی شعرار اور ادبار کا بہت بڑا قدردان اور مربّی علی عادل شاہ ثانی تھا جس کا عہد سلطنت ۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ مطابق ۱۶۵۶ء سے ۱۶۷۲ء تک وسیع تھا۔ اس کے دَور میں فارسی کے جیّد علمار پیدا ہوئے اور مشہور ہوئے۔ مشہور ومعروف حکیم آتشی جس نے نظامی (گنجوی) کے خمسہ کے جواب میں ایک خمسہ لکھا، اس کا درباری شاعر تھا۔ اس (علی عادل شاہ ثانی) کی نسبت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خود ادب سے گہری دلچسپی رکھتا تھا اور اُسے اُردو یا دکھنی (جس نام سے وہ اُن دنوں موسوم تھی) سے خاص شغف تھا۔ نصرتیؔ جس نے بعد میں ملک الشعرار کا خطاب پایا اور جس کا بہت اعزاز کیا گیا، اس کا ایک درباری شاعر تھا۔

دکن کے قدیم شعرا میں نصرتیؔ کو اپنے دور میں سب سے زیادہ عزت، شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن اس کی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات بہم پہونچی ہیں۔ سوانح نگاروں

اور موزخوں میں اس کی نسبت بیحد اختلاف ہے۔ اگر ہم کچھ یقینی طور پر جانتے ہیں تو صرف اس قدر کہ وہ ایک بیجاپوری شاعر تھا۔ دکھنی ادب میں حالیہ ذاتی تحقیق (Research Work) نہ صرف نصرتی (فخر بیجاپور) کو منصۂ شہود پر لایا بلکہ دکن کی قدیم قابل ہستیوں کو بھی قعر گمنامی سے بام قدر و منزلت یا شہرت پر کھینچ لایا ہے۔ شفیق ایک قدیم بڑے مصنف نے "تذکرہ چمنستان شعرا" (۱۱۷۵ھ) میں لکھا ہے کہ "نصرتی" کرناٹک کے صوبہ دار کا ایک رشتہ دار تھا۔ گارساں دتاسی اور دیگر سوانح نگار اہل قلم نے ایک دوسرے کی نقل کرتے ہوئے اس کو ہندو بتایا ہے لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ وہ ایک پاک باطن مسلمان تھا جس طرح کہ اس کی تصانیف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا نام شیخ نصرت یا "محبوب الزماں" کے مصنف کے خیال کے مطابق محمد نصرتی تھا۔ وہ بیجاپور کا باشندہ تھا اور اس کا باپ سلطنت عادل شاہی کے محکمۂ فوج میں ملازم تھا، جیسا کہ اس نے (نصرتی نے) کہا ہے؛

کہ تھا مجھ پدر سو شجاعت تاب   قدیم ایک سلحدار جمع رکاب

نصرتی کا ایک بھائی شیخ منصور نام تھا جو بڑا صالح اور دیندار مرد تھا اور جسے سید شاہ عبدالرزاق رح سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ بزرگ مذکور ہی کے مقبرہ (واقع نگینہ باغ بیجاپور) میں دفن ہوا۔ نصرتی بھی وہیں عدم کی نیند سو رہا ہے۔

نصرتی پہلے پہل کرناٹک میں اپنے قرابت دار کے ہاں رہا۔ پھر محمد عادل شاہ کے دور کے آخری دس سال میں بیجاپور لوٹا مگر علی عادل شاہ ثانی کی تخت نشینی ۱۰۶۷ھ تک اس کا ستارۂ شاعری چمکنے نہیں پایا۔ وہ اسی بیدار مغز، دریا دل اور علم پرور تاجدار کا دور تھا جس کی دوربین نگاہوں نے اس کے (نصرتی کے) جوہر کو معلوم کر لیا اور اس کی اتنی جلا کی کہ ملک نو ملک، اطراف ملک بھی اس کی آب و تاب سے جگمگا اٹھے۔ اس عہد میں نصرتی کو انتہائی شہرت حاصل ہوئی۔

دربار میں شاعر ہونے کے باوجود وہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا

وہ خدا پرست تھا۔ اور ورڈسورتھ (Wordsworth) کے مقولہ (Simple Living and High Thinking) کی سچی تصویر تھا۔ وہ اپنی نصف کمائی محتاجوں اور غربا میں تقسیم کردیتا، خصوصاً طلبا اور علما کی امداد میں صرف کیا کرتا تھا۔ وہ حضرت خواجہ بندہ نواز رح (گلبرگہ شریف) کا یکتا معتقد تھا۔ ان کی تعریف و توصیف میں اس نے بہت کچھ لکھا ہے یہاں ایک شعر لکھدینا کافی ہے۔ ؎

"جسے ناؤں عالم میں بندہ نواز　　محمد حسینی رح ہے گیسو دراز"

اس کی حاضر دماغی، خوش بیانی اور زندہ دلی کی کئی مثالیں پائی جاتی ہے۔ وہ برجستہ شعر کہتا تھا، جس پر بادشاہ اور عمائدین و رؤسا کے وقت نہایت فیاضی اور فراخ دلی سے اس کو انعام دیتے تھے۔ ایک روز بادشاہ فوارہ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ فوارہ سے پانی کے قطرے کیا نکلتے تھے گویا موتی ابل رہے تھے۔ اس نے (بادشاہ نے) اس منظر سے متاثر ہوکر تحیر کے عالم میں یہ کہا۔ ع "ابرا مو یو فوارہ پانی پہ کیا پھل ہے"

تب نصرتی جو اس وقت وہاں موجود تھا فوراً دوسرا مصرع بول اٹھا کہ

"تجھ شاہ اپر اوڑانے کا ایک مورچھل ہے"

وہ ایک طویل عمر پاکر ۱۰۸۵ھ میں فوت ہوا اور اپنے بھائی شیخ منصور کے بازو نگینہ باغ (بیجاپور) میں مدفون ہوا۔ نصرتی ایک کامل شاعر تھا۔ وہ تقریباً دو تین ہزار اشعار چھوڑ گیا۔ اس کی تصانیف میں سے مندرجہ ذیل کتب کا ہم کو علم ہے۔

(۱) معراج نامہ (۲) گلشن عشق (۳) علی نامہ (۴) گلدستہ عشق (۵) دیوان جو غزلوں اور قصائد پر مشتمل ہے۔ ان کتب میں سے دو موجود ہیں۔ سنا گیا ہے کہ حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ سکرٹری انجمن ترقی اردو کو دیوان حاصل ہوا ہے مگر اس کا علم نہیں کہ کہاں تک یہ امر حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم کو انتظار کرنا چاہیئے یہ دیکھنے کے لئے کہ اس محصلہ دستاویز پر غور کرنے کے بعد شاعر کی حیات پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

معراج نامہ شاید اس کی طویل نظموں میں سب سے زیادہ قدیم مجموعہ ہے۔ جسے مولوی عبدالحی صاحب "مصنف گل رعنا" نے "محرم کی بائیسویں تاریخ ۱۰۳۱ء کی لکھی ہوئی اکبر آباد (آگرہ) میں دیکھا۔ یہ اس سے قبل لکھی گئی تھی۔ اس وقت نصرتی کی شہرت کوہستان بندھیاچل کی بلندیوں کو عبور کرکے شمالی ہند تک پہونچ چکی تھی۔

اس میں شاعر، محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ء تا ۱۰۶۳ء) کی تعریف کے راگ گاتا ہے اور یہی اس کے قدیم تصنیف ہونے کا ثبوت ہے اور ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ یہ تصنیف محمد عادل شاہ کے سال وفات (۱۰۶۳ء) سے پہلے وجود میں آچکی تھی۔ یہ تقریباً (۶۵۰) اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں وہ بحر استعمال کی گئی جو ہندی اور اردو دونوں میں عام ہے۔ اس کی زبان قدیم ہے ایک جگہ شاعر اپنا نام یوں بیان کرتا ہے۔

"شہ کی ثنا نصرتی نغز دنول یوں لکھی دور کے دفتر او پر پرا اچھے ہر ایک بچن"

نصرتی کی دوسری تصنیف جو اس قابل ہے کہ طبع اور شائع کی جائے، گلشن عشق ہے" یہ رومانی نظم دکھنی تصانیف میں افضلیت کا درجہ رکھتی ہے، یہ علی عادل شاہ کی تخت نشینی کے ایک سال بعد ۱۰۶۸ء میں لکھی گئی۔ اس کے متعلق یہ تاریخ بیان کی گئی ہے۔

"کیا اس کی تاریخ یو ہجرتی مبارک یو ہے مدیٔہ نصرتی"

یہ شہزادہ منوہر اور مالتی کی داستان عشق ہے۔ اس کی تمہید میں شاعر حمد باری تعالیٰ کے گیت گاتا ہے۔ ازاں بعد نعت مصطفویؐ کے بیان میں عقیدت کا اظہار کرتا ہو اس کے بعد چاروں خلفائے راشدین کے مناقب بیان کرتا ہے۔ پھر حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے۔ ان تمام کے بعد وہ اپنے مربی علی عادل شاہ ثانی کی شان میں قصیدہ کہتا ہے۔ بعدہٗ وہ لکھتا ہے کہ ایک روز وہ اور اس کے چند احباب فارسی قصوں کے ترجمے کے عنوان پر بحث رہے تھے جن میں سے وہ صرف "بدیع الجمال" (غواصی کی ایک تصنیف ۱۰۳۵ء کے قصہ کی بابت ہی جانتے تھے۔ اس کے (نصرتی کے) ایک

دوست ابن عبدالصمد نے اس سے کہا کہ غوّاصی کی اس تصنیف کی طرح وہ بھی منوہر اور مدھو مالتی کے عشق کے واردات کو نظم میں قلمبند کرے۔ تب اس نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور جس طرح کہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے ۱۰۶۷ھ میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔ گو نصرتی اس تصنیف کے ماخذ کو جو کہ تمام کتاب کی بنیاد ہے، نہیں بیان کرتا، تاہم اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنے عہد کی جدید فارسی داستان سے معلومات حاصل کیں ہوں گی۔ یقیناً اس کا پلاٹ کسی سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے فارسی "مہر و مہ" سے قصہ اخذ کیا ہو۔ یہ دونوں قصّے واقعات کی حد تک تو ایک ہی ہیں لیکن ان کے افراد کے نام جداگانہ ہیں۔ نصرتی کی یہ کتاب اردو میں واقعہ نگاری کی حد تک اور مثنوی کی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اردو نظم میں بہت سے عشق کے افسانے ہیں اور شعرائے متاخرین نے تو خاص طور پر اپنی توجہ اسی صنف کی جانب مبذول کی۔ اور غزلوں اور محبت کے نغموں سے اس صنف کو بہت عام کر دیا ہے، لیکن دکھنی شعرا کا نقطۂ نظر اسی حد تک محدود نہیں تھا بلکہ اُنھوں نے رزمیہ اور بزمیہ مثنویاں لکھیں جن میں خطرناک مہمات اور دلیری کے بیان میں بڑا کمال دکھایا ہے۔ اور اپنے قصّوں کے روپ بھی بھرے ہیں۔ اُن کو اسٹیج کیا ہے۔ قدیم، اردو مثنوی گو شعرا میں نصرتی کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس کی یہ مثنوی داخلی و خارجی خوبیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اگر ایک طرف اس کے انسانی فطرت کے وسیع مطالعے نے اس کے افرادِ قصّہ کو زندہ لوگوں کی طرح پیش کیا تو دوسری طرف اس کی زیرکی اور گہرے مشاہدے نے فطری مناظر میں ایسی دلکشی پیدا کر دی کہ بڑے بڑے عشّاقِ فطرت بھی اس نظم میں دلچسپی کے مقامات پا سکتے ہیں۔

مدت مدید تک یہ مثنوی لوگوں کی نظروں سے غائب رہی اس لئے ان کو اس کی بابت بہت کم علم ہے۔ حال ہی میں کئی قلمی نسخوں کا انکشاف عمل میں آیا ہے۔ جناب آغا حیدر حسین صاحب دنظام کالج ان کی ترمیم، طباعت و اشاعت کا قصد رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے

قلمی نسخہ کی بڑی محنت سے اصلاح کی ہے۔ ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی ہے۔ انڈین آفس میں چار نسخے ہیں جن میں سے دو پر یہ سنین درج ہیں ۱۰۹۹ھ و ۱۲۱۱ء ایک اور نسخہ برٹش میوزیم (British Museum) میں محفوظ ہے۔

نصرتی کا تیسرا بڑا مجموعۂ نظم "علی نامہ" ہے۔ یہی وہ نظم ہے جس نے اس کی (نصرتی کی) ایک بہت بڑے دکھنی شاعر کی حیثیت سے شہرت کو قائم کیا اور جس کی وجہ سے نصرتی نے بڑے اعزاز پائے۔

اس میں علی عادل شاہ ثانی کے دربار کی عیش سامانیاں، اس کی جنگی مہمات، اس کی سیرت کی خوبیاں، قابلیتیں اور کمال بیان کیا گیا ہے۔ یہ دکن کا شاہنامہ ہے جیسا کہ خود شاعر کہتا ہے۔

"ہوس کتیاں سخن مختصر بے گماں — کہ یو شاہنامہ دکن کا ہے جاں"

گو یہ نظم مثنوی کی بحر میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں بادشاہ کی تعریف میں کئی قصیدے اور مطلعے ہیں۔ اس کی ابتدا بھی ایک طویل قصیدہ سے ہوئی ہے جس میں اس تصنیف کا نام ظاہر کیا گیا ہے۔

"حمد اوّل ہے خدا کا جن نے روز اوّل — دیا ہے ہمت مرداں کو جو توفیق سو بل"

"لکھیا اس فتح کے نامے کا علی نامہ ناؤں — جس کا ہر رزمیہ رستم کے کل کا ہوے ہیکل"

اس کی تاریخ تصنیف ۱۰۷۶ھ ہے اور خود شاعر نے یہی تاریخ اس کتاب کے خاتمہ میں ظاہر کی ہے۔ لیکن چند قلمی نسخوں کو دیکھنے سے اس کے بارہ میں شک پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود بآسانی اس کے متعلق یقین حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شاعر نے "پنالا کی تسخیر" میں بیان کیا ہے کہ یہ ۱۰۷۶ھ میں لکھی گئی۔ نصرتی کی یہ تصنیف بہت اہم ہے۔ اردو میں اس قسم کی تاریخی نظمیں بہت کم ہیں۔ ہماری شاعری کے مشہور و معروف اساتذہ نے اس صنف کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن تک نے اس کی جانب توجہ نہیں کی۔ اس

تبیل میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ صرف کسی مصنوعی اور مفروضہ بادشاہ کی عظمت و جلال اور شان و شوکت تک محدود ہے۔ صرف دکھنی شعرا نے ہی اس طرف اپنی نظر التفات منعطف کی اور اس پر کئی نظمیں لکھیں، جن میں "علی نامہ" ایک بہترین تصنیف ہے۔ علی عادل شاہ بہادر نے نصرتی کو اسی تصنیف کی تکمیل پر ملک الشعرا کا خطاب دے کر ایک بہت بڑا اعزاز عطا فرمایا۔

نصرتی کا چوتھا مجموعۂ نظم "گلدستۂ عشق" کے نام سے موسوم ہے یہ کتاب نایاب ہے، اس لئے لوگوں کی اس کے متعلق واقفیت بھی محدود ہے۔ "اردوئے قدیم" کا مصنف لکھتا ہے کہ اس کا ایک نسخہ سلطان ٹیپو (میسور) کے عظیم الشان کتب خانہ میں شامل تھا۔ شاید اس میں عشق و محبت کا قصہ ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔

ناقدین اور مورخین کا اس امر پر بالکل اتفاق ہے کہ نصرتی اپنے دور کا بہت بڑا شاعر تھا۔ "بساطین السلاطین" (علی عادل شاہ کے دور حکومت کی بے نظیر تاریخی تصنیف) کا مصنف اس کا (نصرتی کا) بہت بڑا مداح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ (نصرتی) خاقانی (ایران کا مشہور قصیدہ گو شاعر) کے برابر تھا۔

فضائل حضرت پیر دستگیرؒ

جناب مولوی محمد ابرار صاحب مہتمم تعلیمات ضلع بیڑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

(خبردار رہو کہ اولیاء اللہ کو نہ کچھ خوف ہے اور نہ ان کے لئے کچھ غم ہے)

ہر کس کہ کمال اولیا را نشناخت — ایں نعمت خاص بے بہا را نہ شناخت

پس شکر نہ گفت و حب ایشاں نگزید — میداں بہ یقیں کہ او خدا را نہ شناخت

تمہید سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے کہ

صحبت نیکاں بہ از کار نیک و صحبت بداں بدتر از کار بد

محدثین و اولیاء متقدمین و متاخرین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے اس بات پر اتفاق فرمایا ہے کہ صحبت سے مراد صرف مجالست جسدی ہی نہیں ہے بلکہ ذکر اولیاء بھی صحبت اولیاؑ کے ہم معنی ہے لہذا جو لوگ صحبت و مشاہدہ جمال اولیاء اصفیا سے محروم ہیں وہ اولیاء کے حالات پڑھنے، سننے، لکھنے سے اپنے حرمان کی تلافی کر سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سلف صالحین تذکرہ و خصائل اولیا لکھنے اور بیان کرنے میں ہمیشہ غلو فرماتے ہوئے اس سے مجالست کے مانند پورا پورا فیض حاصل فرمایا کرتے تھے۔ اولیاء اللہ کا وجود جسمانی ہو یا روحانی، اللہ کی ایک رحمت ہے۔ ہر رحمت نعمت ہے اور بمنشاء بعثت فرمان الٰہی "فاما بنعمۃ ربک فحدث"[1]۔ ہر نعمت کی شکر گزاری لازم ہے۔ لہذا اس نعمت کی شکر گزاری کا واحد اور بہترین طریقہ یہی ہے کہ "رحمتوں" کے فضائل اور مناقب بیان کرکے اظہار تشکر و محبت

---

[1] اپنے پروردگار کی نعمت کا ذکر کرو۔

کیا جائے۔ تاکہ اس کے صلہ میں حسب وعدہ الہٰی " لئن شکرتم لازیدنکم"[1] مزید رحمتوں کے نزول سے ہم مالا مال ہوں۔

اولیاء کرام و اتقیاء عظام رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے حالات و سوانح بیان کرنے کے متعلق جس کو محدثین و فقہا با کمال نے "عبادت" سے تعبیر کیا ہے۔ جملہ علما محدثین کا اتفاق ہے کہ اُن کا ذکر باعث نزول رحمت و سبب حصول قربت الہٰی ہے۔ یہ کوئی ایسا کلیہ یا اصول نہیں ہے جو کسی انسان کی سمجھ سے باہر ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ " اولیاء اللہ" میں جو اضافت ہے وہ عشق ہی کی نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی مضاف (اولیاء) عاشق یا محب اور مضاف الیہ (اللہ) عشق یا محبوب۔ لہٰذا اگر ایک طرف محب یا عاشق کو ذکر محبوب بے خود کر دینے والا ہوتا ہے تو دوسری طرف محبوب کو بھی ذکر محب پسندیدہ اور محبوب ہوتا ہے۔ بلکہ فی الحقیقت ایک مرتبہ پر پہنچنے کے بعد عاشق و معشوق یا محبوب و محب کا جھگڑا ہی جاتا رہتا ہے یہ وہ مرتبہ ہے جہاں پر محبوب پہنچنے کے بعد باآواز بلند پہلے تو اپنی حیرانی کو یہ کہہ کر ظاہر کرتا ہے۔

بے جہت گشتم نہ گشتم بے جہت عارفم اما ندارم معرفت

اس کے بعد جب حیرانی کے پردہ سے۔ جو منزل مقصود کا آخری پردہ ہے۔ نکلتا ہے تو نور ہی نور اور جمال ہی جمال اپنے گرد و پیش پاتا ہے۔ اس وقت یہ کہہ کر محبوبیت کے اصل معنے سے دنیا کو روشناس کرتا ہے:۔

من ندانم تو منی یا من توئی محو گشتم در تو و گم شد دوئی

اور کوئی یہہ کہہ کر " دوئی " کے مسئلہ کو حل کر دیتا ہے۔

از شراب شوق گشتم مست او ہست من گم گشت اندر ہست او
بود ما در بود او نابود شد ہرچہ جز غیرش بداں مردود شد

چونکہ ذکر اولیاء اللہ۔ خداوند تبارک و تعالیٰ کو پسند ہے اور وہ عمل جو اللہ کو پسند ہے وہی

---

[1] تمہاری شکر گذار ہیں پر ہم تم کو اور زیادہ دیں گے۔

عبادت ہے لہذا ذکر اولیاء جو بوجہ محبوبیت پسندیدہ تر ہے بطریق اولیٰ منجملہ اور عبادات کے ایک عبادت ہے۔ عبدیت۔ جو محض عبادت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ مآلِ زندگی ہو اور حسنِ عمل اور اچھے کردار کی وہ کُنجی ہے۔ جس کو اولیاء و محدثین نے "حیاتِ ابدی اور سعادتِ ازلی" بتایا ہے نیکیوں کا ذکر نہ صرف نیکی کی طرف لے جاتا ہے بلکہ ذکر کرنے والے کو نیک بنا کر دوسروں کو اپنے ذکرِ خیر کے لئے تیار کرتا ہے۔ وھلم جرا۔ اس لئے کہ۔

چو من بخیر کنم یاد رفتگاں وارم — امید آنکہ مرا ہم بخیر یاد کنند

جو شادی کنم ارواح دیگراں شاید — کساں رسند و مرا نیز روح شاد کنند

بہر حال ذکر اولیاء مجسم خیر ہے "فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة"[1] جب یہ مسلم ہو چکا کہ ذکر اولیاء "عبادت" ہے تو پھر ذکر سرتاج اولیا العرب و العجم شیخ العالم۔ غوث الاعظم۔ فرد الاحباب۔ قطب الاقطاب۔ غوث الثقلین۔ امام الطائفتین۔ رئیس الطالبین۔ شیخ الاسلام والمسلمین۔ حضرت محی الدین ابو محمد عبد القادر الحسنی والحسینی الجیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعن جمیع اولیا المتقین۔ کیوں نہ عبادت بدرجہ اتم ہو۔

القاب وخاندان۔ مولد مسکن اور مدفن

ہندوستانیوں کے "بڑے پیر"۔ عجمیوں کے "پیر دستگیر" عربوں کے "غوث اعظم" رضی اللہ تعالیٰ عنہ، امام المسلمین سیدنا حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن امیر المومنین سیدنا حضرت علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ کے احفاد میں سے تھے اس لئے آپ فخرِ سادات حسنیہ تھے۔ "جیل" میں جس کو "جیلان" یا "گیلان" بھی کہتے ہیں بقول علامہ ابو الفدا ۴۷۱ھ اور بقول بعض ۴۷۰ھ ہجری میں ولادت شریف ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل فرمانے کے بعد بعمر ۱۸ سال ۴۸۸ھ میں بمقام بغداد قدم رنجہ فرمایا۔ جہاں ائمہ زماں و علماء دوراں سے جملہ علوم متداولہ کی تکمیل فرما کر درس و تدریس میں وہ کمال پیدا کیا کہ بڑے بڑے علماء وقت انگشت بدنداں تھے۔ حتیٰ کہ "فاق الکل فی الکل"[2] کے مرتبہ پر فائز ہوئے بغداد مسکن ہو گیا اور وہی مدفن بنا جہاں

---

[1] دنیا میں بھی بہتری اور آخرت میں بھی بہتری۔ [2] سب باتوں میں سب پر فوقیت حاصل کی۔

نوے سال کی عمر میں بتاریخ ۱۱- اور بقول بعض ۷ ربیع الثانی ۵۶۱ھ آپ نے داعی اجل کو لبیک فرمایا۔ ابن الاثیر کے حوالے سے علامہ ابو الفداء نے لکھا ہے کہ آپ زبردست صاحب حال تھے اور آپ کا مدرسہ اور رباط بغداد میں مشہور تھے۔

حلیہ شریف

قد متوسط، جسم دبلا، سینہ چوڑا۔ اور رنگ سانولا تھا۔ ڈاڑھی لمبی اور چوڑی تھی، دونوں ابرو ملی ہوئی تھیں۔ آواز بلند تھی۔ اتنی بلند کہ سننے والے پر ہیبت چھا جاتی تھی اور رعب سے دل ہل جاتا تھا۔ آپ کی آواز کی یہ خصوصیت تھی جس کو کرامت کہنا چاہیئے۔ کہ وہ ہر شخص کے لئے مساوی ہوتی تھی خواہ وہ دور بیٹھا ہو یا نزدیک حتیٰ کہ آپ کی مجالس وعظ میں ستر ستر ہزار آدمی ہوتے تھے لیکن ہر شخص با آسانی آپ کی آواز سن لیتا تھا۔ آواز کا یہ توازن کہ نہ پاس بیٹھنے والے کو گراں ہو اور نہ دور بیٹھنے والے کو کوفت ہو۔ اگر کرامت نہیں تو پھر کیا تھا؟

ایامِ طفولیت

آپ کا بچپن بھی ولایت اور قطبیت ہی کا بچپن رہا۔ یہ روایت مشہور ہے کہ رمضان المبارک میں آپ دن کو ماں کا دودھ نوش نہیں فرمایا کرتے تھے۔

"آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنے کا ارادہ کرتا تھا تو میں یہ آواز سن کر کہ:

"اے متبرک، میری طرف آ"

ڈر جاتا تھا اور بھاگ کر ماں کی گود میں چھپ جاتا تھا" غرضکہ اس قسم کے بہت سے واقعات آپ کے بچپن کے ہیں جو اس بات کے شاہد ہیں کہ قطبیت عظمیٰ آپ کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ +

تعلیم وتربیت اصطلاحی اور حضرت غوث اعظم

حضرت شیخ ابو العباس حضرمی رضی اللہ عنہ نے تصوف کی تعلیم وتربیت پر بحث فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

ارتفعت التربیۃ بالاصطلاح ولم یبق الا الافادۃ بالھمۃ والحال الخ۔

یعنی "اصطلاحی تربیت اُٹھ چکی ہے۔ البتہ ذریعہ "ہمت اور حال" افادہ کا طریقہ باقی رہ گیا ہے"۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں اس مسئلہ پر بہت ہی تفصیل سے بحث فرمائی ہے۔ اور "تربیت اصطلاحی" اور "ہمت وحال" کی شرح فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ اول الذکر اس دشوار ترین ریاض اور مشکل ترین مجاہدہ کا نام ہے جس پر مرشدین کامل اپنے مریدین کو پابند کیا کرتے تھے۔ اور اس پر مریدین پورے طور پر کاربند ہوتے تھے۔ ان کا نماز وروزہ۔ ذکر وشغل۔ کھانا پینا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ سونا جاگنا۔ اور چلنا پھرنا۔ اسی نظام الاوقات کے مطابق ہوتا تھا جو مرشد کامل کی طرف سے مرتب کیا جاتا تھا۔ اور مرید اس میں چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی یا ترمیم نہیں کر سکتا تھا۔ مرشد کامل کی نگرانی کا یہ طریقہ تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً حسب اقتضاء حالات وکیفیات وواردات مریدین کھانے پینے عبادات وذکر میں تغیر کرتا رہتا تھا۔ یہ نظام الاوقات ایک معین زمانہ تک جاری رہتا تھا۔ زمانہ کا تعین مرشد کامل ہی کر سکتا تھا اور کر سکتا ہے۔ کیونکہ مرشد کامل ہی میں یہ صلاحیت ہوسکتی ہے کہ وہ انفرادی طور پر ہر طالب کے استعداد کا پورا پورا مطالعہ کرکے زمانہ نصاب کو مقرر کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی طالب "امتحان" میں ناکام نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کمال کو حاصل کرتا تھا جس کے لئے وہ میدان عمل میں قدم رکھتا تھا۔ لیکن بقول حضرت حضرمی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ "تربیت اصطلاحی" کا زمانہ ختم ہوچکا۔ کیونکہ وہ محنت شاقہ اب لوگوں سے نہیں ہوسکتی ہے جو سلف صالحین کا کارنامہ تھا۔ لہٰذا متاخرین اہل کمال ومرشدین صاحب حال نے موخر الذکر طریق سے طالبین کی رہنمائی فرمائی اور اس کا نام "ہمت وحال" رکھا جس کا طریقہ یہ تھا کہ مرشد

کامل مرید کو احکام شریعت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ طریقت کے آداب بتاتا تھا۔ اور توجہ باطنی سے اس کے قلب کا تصفیہ کرتا تھا۔ اور پھر اپنی قوت روحانی سے طالب میں روحانیت کی تخم ریزی کرکے اس کو ظاہر سے باطن کی طرف لاتا تھا۔ گویا جو محنت کہ زمانہ سلف میں طالبین کے ذمہ تھی وہ اب مرشد نے اپنے ہی ذمہ لے کر طالب کو کامل بنایا۔ سبحان اللہ۔ خدمت خلق اور اس کی رہبری جن لوگوں کا مقصد زندگی ہے اور جس کا دوسرا نام عشق و محبت ہے صحیح خدمت وہی ہے جو مخدومی اور درویشی کا شقہ عطا کرتی ہے لیکن یہ جذبہ صادق اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ دین کارفرما ہو۔ ایمان کے نور سے دل منور ہو۔ محنت اور ریاض کی عادت ہو۔ عبادت اور مجاہدہ نے نفس کو آلائش سے پاک کر دیا ہو۔

بنگر ایں حالت درویشاں را   کوشش و سوزش عشق ایشاں را
کہ دریں رہ چہ طلب ہا دارند   در طلب ہا چہ تعب ہا دارند
زیں طلب گرنہ خدا یافتہ اند   ایں ہمہ بہر چہ بشتافتہ اند

اس طریق تعلیم میں بھی مشائخ نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ یعنی بعض ابتداً طالب کی سابقہ عادتوں کو ترک کرلتے ہیں اور اس کے بعد راستہ دکھاتے ہیں جس کو طریقت کہتے ہیں لیکن بعض کا اس کے خلاف عمل رہا ہے۔ وہ سابقہ عادتوں کو ذرا اہمیت نہیں دیتے تھے اس لئے کہ وہ ثانوی مرتبہ کی چیزیں ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ انسانی عادت تربیت کے تابع ہوتی ہے نہ کہ تربیت عادت کے۔ اس لئے ابتدا ہی سے تربیت شروع کردی جاتی ہے اور تربیت کے اثر و نفوذ کے ساتھ ساتھ طالب کے خصائل و عادات میں تبدیلی ہوتی جاتی اور اصل چیز جڑ پکڑتی جاتی ہے۔ حضرت شیخ ابوالعباس الحضرمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طریق کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ

"ایں طریق اقرب و اسہل و ارفق است و طریقہ شیخ ما در تربیت مریداں ہمیں طریق بود۔"

حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کی قطبیت کبریٰ و ولایتِ عظمیٰ اسی "تربیت اصطلاحی" کا نتیجہ تھی جس نے جملہ اولیاءِ وقت کا آپ کو سرتاج کیا۔ اور اسی محنت شاقہ اور کمال محنت نے منجانب اللہ یہ اعلان کرایا کہ "قدمی ھذہٖ علی رقبۃ کل ولی اللہ"۔ محدثین نے لکھا ہے کہ آپ نے ۳۳ سال درس وتدریس اور افتاء میں اور ۴۰ سال وعظ وارشاد میں صرف فرمائے۔ دور دراز سے خوش نصیب ہستیاں حاضر ہوکر فیوض ظاہری و باطنی سے مالامال ہوتی تھیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ

چالیس سال تک عشا کے وضو سے میں نماز فجر ادا کرتا رہا ہوں"

اللہ اللہ یہ شب بیداری اور یہ ریاض یہ محبت الٰہی اور یہ عشق کہ جس نے نیند سے قطعی بے نیاز کر دیا تھا۔ صحرا نوردی اس وقت تک نہ ترک فرمائی جب تک کہ ذریعہ حضرت خضر علیہ السلام ایک جنگل میں تنہا ایک جگہ تین سال تک بٹھا کر امتحان نہ لیلیا گیا۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ۔

"میں سیاحت کر رہا تھا کہ ایک شخص نے سامنے آکر مجھ سے میرے ساتھ رہنے کی اس شرط پر خواہش کی کہ میں صابر رہوں اور مخالفت نہ کروں۔ میں راضی ہوگیا اور وہ مجھکو ایک جگہ بٹھا کر اور یہ وعدہ لے کر چلا گیا کہ تا واپسی اس جگہ سے نہ اُٹھنا۔ چنانچہ ایک سال کے بعد وہ واپس آیا تو اس نے مجھے اُسی جگہ بیٹھا ہوا پایا۔ دوبارہ پھر وہ یہی کہہ کر چلا گیا۔ غرضکہ اس طرح سے اس نے تین بار یہ عمل کیا۔ آخر میں وہ اپنے ساتھ روٹی اور دودھ لایا اور کہنے لگا کہ۔

"میں خضر ہوں (علیہ السلام) اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کے ہمراہ کھانا کھاؤں"

چنانچہ ہم دونوں نے وہ کھانا کھایا اس کے بعد حضرت خضر نے فرمایا کہ

لہ میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے ۱۲

"اٹھو اور بغداد جاکر بیٹھو اور سیاحت ترک کرو۔"

مقربین بارگاہ قطبیت نے عرض کیا کہ "اس تین سال میں غذا کہاں سے آئی"۔ آپ نے فرمایا: "جو چیز کہ اس جگہ پیدا ہوتی تھی اور جو زمین پر ہوتی تھی وہی غذا تھی"۔ اسی اطاعت اور عبادت کا یہ ادنی کرشمہ تھا کہ شیطان کی شیطنت بارگاہ قطبیت میں آکر پامال ہوئی چنانچہ آپ نے ایک بار فرمایا کہ۔

"ایک سیاحت کے سلسلہ میں میں ایسے دشت میں پہنچ گیا جہاں پانی نہیں تھا کئی روز وہاں رہا لیکن پانی نہ ملا جب پیاس کا غلبہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ابر کا سایہ فرمایا اور چند قطرات برساکر مجھے تسکین عطا فرمائی۔ اس عرصہ میں ایک روشنی ہوئی اور اس میں سے ایک عجیب صورت نمودار ہوئی جس نے آواز دی۔

"میں تیرا پروردگار ہوں۔ میں نے تیرے اوپر وہ تمام چیزیں حلال کردی ہیں
جو دوسروں پر حرام کر رکھی ہیں، جو چاہے وہ لے اور جو چاہے وہ کر۔"

"میں نے کہا اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ دور ہو اے مردود یہ کیا بکتا ہے" اس جواب پر وہ روشنی تاریکی میں بدل گئی اور وہ صورت دھواں بن گئی اور اس نے کہا "اے عبدالقادر آپ صرف اس وجہ سے مجھ سے نجات حاصل کر سکے کہ آپ کو پروردگار کے احکام کا اور اپنے مراتب کے حالات کا علم ہے ورنہ میں نے اس طرح سے ستر باکمال لوگوں کو بہکایا ہے۔ جو اپنی جگہ پر نہ ٹھہر سکے۔ یہ عجیب علم و ہدایت آپ کو منجانب اللہ عطا ہوا ہے۔

تبحر علمی اور محبوبیت علم کے آپ دریائے بے کراں تھے۔ علوم ظاہری اور علوم باطنی نے مل کر نور علی نور کر دیا تھا۔ جن مسائل میں ائمہ وقت سرگرداں رہتے تھے ان کا بآسانی حل اگر کہیں ملتا تھا تو اسی بارگاہ قطبیت میں ملتا تھا۔ بوقت تدریس تفسیر قرآن پاک ایک ایک آیت کی تفسیر میں بعض وقت چالیس چالیس دلائل معہ اسناد متصلہ بیان فرمایا کرتے تھے جس سے حاضران مجلس ششدر و حیران رہ جاتے تھے۔ تمام عالم اسلامی سے

بڑے بڑے علماء وقت فتاوے بھیجتے تھے اور جواب باصواب سے مستفید ہوتے تھے۔
ایک بار مملکت ایران سے علماء عراق کے پاس ایک استفتا بایں عبارت آیا:۔

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس شخص کے متعلق جس نے یہ قسم کھائی ہے کہ اس کی بیوی پر تین طلاقیں ہیں اگر وہ حق تعالیٰ کی ایسی عبادت نہ کرے کہ اس قسم کی عبادت میں دنیا کا کوئی انسان کسی مقام پر اس وقت اس کی عبادت میں شریک نہ ہوسکے۔ اس شخص کو کونسی ایسی عبادت کرنی چاہئے جس سے وہ "حانث" نہ ہو (یعنی قسم پوری ہو جائے اور طلاق نہ عاید ہو)۔

جملہ علماء عراق اس کے جواب سے عاجز آگئے اور اس قسم کی قسم کا حل سمجھ میں نہ آیا آخر کار حضرت غوث الاعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے جواب کے خواستگار ہوئے۔ حضرت نے اس پر نظر ڈالتے ہوئے فرمایا:۔

"یخلی لہ المطاف و یطوف اسبوعاً وحدہٗ و یحل یمینہ"

سبحان اللہ کیا مختصر جواب باصواب تھا۔ قَلَّ مَا دَلَّ اسی کا نام ہے۔ اس قدر پیچیدہ مسئلہ کا دو لفظوں میں حل کرنا دستگیری نہیں تو کیا۔ طواف کعبہ عبادت ہے۔ قسم کھانے والے نے کسی عبادت حق تعالیٰ کو مخصوص نہیں کیا تھا۔ البتہ یہ قید لگائی تھی کہ اس وقت دنیا کا کوئی انسان اس قسم کی عبادت میں مشغول نہ ہونا چاہئے۔ نماز اور روزہ سے کسی کو روکا نہیں جاسکتا تھا حتیٰ کہ کسی فرض عبادت سے کسی کو محض ایک شخص کی خاطر منع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا فوراً بارگاہ قطبیت سے یہ جواب ملتا ہے "مطاف کو خالی کر دیا جائے اور اس شخص کو تنہا ایک ہفتہ تک طواف کرنے دیا جائے۔ قسم پوری ہو جاتی ہے" یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی جس کے روکنے سے کوئی گنہگار رہتا یا جس کا روکنا ممکن نہیں تھا بہرحال عبادت بھی ہوگئی اور قسم بھی پوری ہوگئی۔

آپ کی محبوبیت و مقبولیت کی یہ حالت تھی کہ ہر شخص آپ کا والہ و شیدا تھا۔ جب آپ

جامع مسجد تشریف لے جایا کرتے تھے تو جم غفیر ہوتا تھا اور سب اسی وقت اللہ سے دعائیں مانگنے لگتے تھے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ مقبولت کا وقت ہے۔ ایک بار مستنجد باللہ خلیفہ بغداد جمعے کے روز جامع مسجد گئے "مقصورۃ" میں جو خلفاء کے لئے مخصوص ہوتا تھا جماعت کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت غوث اعظم بھی تشریف فرما تھے کہ آپ کو چھینک آئی جملہ نمازیوں نے بیک آواز "یرحمك اللہ ویرحمبابك" کہا خلیفہ یہ آواز سن کر گھبرا گیا اس نے دریافت کیا کہ "کیا بات ہے" جواب دیا گیا کہ "شیخ عبدالقادر (رضی اللہ عنہ) کی چھینک پر لوگوں نے جواب دیا ہے۔"

مجالس وعظ جب آپ نے وعظ شروع فرمایا ہے جس کے متعلق آپ کو خواب اور بیداری میں حکم ہو چکا تھا۔ تو بقول آپ کے مجلس میں دو یا تین افراد سے زیادہ نہیں تھے اس کے بعد اتنا مجمع ہونے لگا کہ جگہ تنگ ہوئی تو آپ فرماتے تھے کہ

"میں عیدگاہ میں جا کر وعظ کہتا تھا"

لیکن اب مجمع اتنا زیادہ ہو گیا کہ عیدگاہ کا وسیع صحن تنگ ہو گیا لہذا آپ بیرون شہر تشریف لے جاتے اور وہاں مجلس وعظ منعقد فرماتے۔ آپ کے وعظ میں انسانی تعداد ستر ہزار نفوس تک ہوتی تھی۔ علاوہ اجنہ وملائکہ وارواح مقدسہ کے جن کی تعداد انسانی تعداد سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ

"ابتدائے وعظ وارشاد کے زمانہ میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا جس میں مجھے وعظ کا حکم ہوا اور اس کے بعد میرے منہ میں لعاب دہن مبارک ڈال کر میرے کلام کے دروازے کھول دئے گئے۔"

سبحان اللہ۔ کیا شان محبوبیت تھی جس نے وہ مدارج حاصل کئے جو کسی ولی کو نصیب نہ ہوئے۔ مال کی وراثت تو تمام اولادوں میں حصہ رسدی تقسیم ہوتی ہے لیکن حال کی وراثت سچے جانشین ہی کو ملتی ہے۔ اولیاء اور بہت سے ہوئے اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہوں گے

لیکن حضرت محبوب سبحانی کو "مالک رقاب اولیا" فرمایا گیا۔ قطب اور بھی ہوئے لیکن آپ کو قطب الاقطاب کے مرتبہ پر پہنچایا گیا۔ اوروں کو بادشاہی ملی لیکن آپ کو شاہنشاہی عطا ہوئی۔

آپ کی مجلس وعظ میں جو حقیقی معنوں میں رشد و ہدایت کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کا اژدحام ہوتا تھا۔ جنات کی بھی کثیر تعداد ہوا کرتی تھی۔ ایک ہمعصر بزرگ نے فرمایا کہ "ایک مرتبہ میں نے جنات کی دعوت ضیافت کی سب نے دعوت قبول کر لی اور وہ سب کے سب آئے لیکن بہت زیادہ تاخیر سے۔ میں نے ان سے سبب پوچھا تو اُنہوں نے کہا کہ شیخ محی الدین جیلانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے وعظ میں ہماری شرکت ضروری اور مقدم تھی اس لئے ہم وہاں تھے۔ آئندہ سے جب آپ کبھی دعوت کریں تو ایسے دن اور وقت پر نہ کریں کہ جس دن اور جس وقت حضرت کا وعظ ہوتا ہو۔ کیونکہ اس میں ہماری شرکت لازمی ہے ورنہ لامحالہ ہم کو دیر ہوا کرے گی" اس کے بعد اُنہوں نے کہا کہ "آدمیوں سے زیادہ تعداد ہم لوگوں کی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم لوگوں کی بہت بڑی تعداد ان کے ہاتھ پر ایمان لائی ہے اور اس نے اسلام قبول کیا ہے"۔ آپ کی مجلس وعظ نہ صرف "قال" تھی بلکہ مجلس "حال" بھی تھی۔ آپ خود جامع القال والحال تھے۔ اس لئے مجلس بھی مجموعہ قال و حال تھی۔ مجلس وعظ میں ہزاروں انسانوں کا مجمع رہتا تھا۔ دوران وعظ میں آپ بسا اوقات فرمادیا کرتے تھے کہ "مضی القال وعطفنا بالحال"[1] صرف اسی ارشاد پر پوری مجلس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہر شنفس سوزش عشق کا مجسمہ بن جاتا تھا۔ آہ و زاری کا وہ عالم ہوتا تھا کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں رہتی تھی جتی کہ بسا اوقات فرط عشق و محبت کا مظاہرہ اموات کی شکل میں ہوتا تھا اور عشق کے دیوانے اسی حالت وجد میں اپنی مراد پا جاتے تھے اور منزل مقصود پر پہنچ جاتے تھے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو عشق کی منزل پر پہنچ کر واپس نہ ہوں۔ اور پھر محنت شاقہ میں گرفتار نہ ہوں۔ ایک بزرگ نے بحالت بیماری صحت کی دعا کرنے والوں سے

---

[1] گفتگو ختم ہو چکی اب ہم حال کی طرف رجوع ہوئے ۱۲

ناراض ہوکر یہ فرمایا کہ" یہ دعا مت کرو بلکہ یہ دعا کرو کہ خدا مجھے بلا لے۔ کیونکہ جس جمال کا میں فدائی تھا وہ میرے سامنے اس وقت جلوہ گر ہے اگر اسی حالت میں وہ اپنے پاس طلب فرمالے تو انتہائی لطف و کرم ہے" مولانا امیر حسن سجزی للدھلوی فرماتے ہیں۔ ؎

چوں شنیدم کہ بہ پرسیدن بیمار آئی　　　　کرد بیمار مرا حسرتِ پرسیدن تو

غرضکہ آپ کی مجالس وعظ آپ کی بیشمار کرامات کا مظہر تھیں جن کا بیان کرنا حقیقتاً بہت دشوار ہے۔ ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی جس شخص سے ملاقات ہوتی تھی اس کو وہ یہ ہدایت فرماتے ہوئے کہ "مجلس شریف میں ضرور حاضر ہو" یہ فرمایا کرتے تھے کہ "من اراد الفلاح فعلیہ بملازمۃ المجلس[ل]۔ کیوں نہ ہو جو سید السادات بھی ہو اور مطیع رسول بھی جو حامل شریعت بھی ہو اور کامل طریقت بھی۔ جو لعاب مبارک مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی چاشنی سے معمور ہو چکا ہو۔ جو لعاب مبارک مرتضوی (کرم اللہ وجہہ) سے فیض بے کراں حاصل کر چکا ہو۔ اس کے کلام میں جو تاثیر ہو کم ہے۔ آپ کا کلام کلام مرتضےٰ (کرم اللہ وجہہ) تھا۔ کلام رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا۔ کلام خدا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "میں ایسی کوئی بات نہ تو کہتا ہوں اور نہ کرتا ہوں جس کا حکم نہ دیا جائے" اس کی صحت میں کلام نہیں ہے۔ آپ نے خدا اور رسول کے احکام مخلوق تک علماً و عملاً پہنچائے۔ بے راہ کو راہ پر لگایا۔ گمراہ کی رہبری کی اور عشق رسول و خدا کی دلوں میں تخم ریزی فرمائی۔ سنگدلوں کو بغیر سزا جسمانی کے اہل دل کے مرتبہ پر پہنچایا اور ان کی برسوں کی قساوت کو آناً فاناً دُور فرمایا حتی کہ جو کام دُرّے اور کوڑے حبس و تلوار سے نہ چل سکا وہ کام محبوب سبحانی کی شیریں کلامی نے کیا۔ ہزاروں اسلام لائے۔ لاکھوں تائب ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت شیخ ابو مسعود بن بکر حزیمی وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ" حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کرامات حقیقتاً جواہرات کی پروئی ہوئی لڑیاں ہیں" امام عبد اللہ یافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ" کرامات[ٹ] بلغت حد التواتر و معلوم بالاتفاق۔ ما بلغہا

ل جس کو بہبودی کی خواہش ہو وہ مجلس میں ضرور حاضر ہو۔ ٹ ان کی کرامات بالاتفاق تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہیں۔ دنیا کے کسی بزرگ ولی کی اس حد تک کرامات نہیں پہنچی ہیں۔

من احد من شیوخ الآفاق "غرضکہ آپ کی مجالس وہ مجالس تھیں جن میں انسانوں کو شریعت اور طریقت دونوں کی تعلیم بدرجہ اتم حاصل ہوتی تھی۔کلام الٰہی اور حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ وجدانی کیفیت پیدا ہوتی تھی کہ تمام مجلس بے خود ہو جاتی تھی نہ غنا تھا اور نہ مزامیر لیکن حاضرین مجلس متوالے نظر آتے تھے احکام شریعت کا غنا اور تزبین طریقت کے مزامیر جو کیفیت پیدا کیا کرتے تھے اس کا لطف وہی بتا سکتے ہیں جو شریعت اور طریقت پر سختی سے عامل ہیں۔شریعت کی اس کامل و مکمل پابندی ہی نے جس نے طریقت میں بھی کامل و مکمل بنایا۔"قدمی ھذہ علی رقبۃ کل ولی اللہ" کے قابل بنایا۔متوسلین کی دعاؤں کے لئے قبولیت کے دروازوں کو کھول دیا۔اور بخشش و نجات اخروی سے ان کو بے نیاز کر دیا۔چنانچہ روایت ہے کہ ایک بزرگ نے رسول کریم صلوٰۃ اللہ علیہ والتسلیم کو خواب میں دیکھ کر عرض کیا کہ "میرے لئے دعا فرمائے کہ میں کتاب خدا اور سنت رسول پر مروں" ارشاد ہوا کہ "ایسا ہی ہو گا کیونکہ تیرا پیر شیخ عبدالقادر ہے" بزرگ موصوف فرماتے ہیں۔کہ میں نے تین بار عرض کیا اور تینوں بار یہی جواب بارگاہ نبوت سے مجھکو ملا۔بزرگان دین کا قول ہے کہ حضرت پیر دستگیر نے اپنے مریدوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ "کوئی مرید بغیر توبہ کے نہیں مرے گا" نجات کے لئے اس سے بڑھ کر اور کونسا پروانہ مل سکتا ہے۔حضرت شیخ عبدالحق محدث دھلوی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب "اخبار الاخیار" میں لکھا ہے کہ بعض مشائخ کے دریافت کرنے پر حضرت غوث اعظم نے ارشاد فرمایا۔کہ

"پروردگار[1] من عزوجل خود وعدہ کردہ است مرا کہ اصحاب مرا و اہل مذہب و تابعان طریق مرا و ہر کہ محب من بود در بہشت در آرد"

حضرت کا خُلق اور برتاؤ

"انک[2] لعلی خُلقٍ عظیم" کے نسخہ کیمیا اثر نے آپ کو مجسم اخلاق بنا دیا تھا۔فقرا کی مدارات۔کمزوروں کی دیکھ بھال۔غریبوں کی امداد اور ان سے میل جول۔بیماروں کی عیادت۔بڑوں کی عظمت۔

---

[1] میرے پروردگار عزوجل نے خود مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میرے دوستوں۔مریدوں۔اور جو کوئی مجھ سے محبت کرے ان کو بہشت میں داخل کرے گا۔[2] اے رسول آپ خلق عظیم کے حامل ہیں۔

چھوٹوں پر رحم۔ مہمانوں کی خاطر۔ طلباء کے ساتھ حسن سلوک آپ کا وہ کارنامہ تھا جس کو لوگ دیکھ کر حیرت کرتے تھے۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو اس کو معاف فرما دیا کرتے تھے ہر شخص سے بہ خنداں پیشانی پیش آتے تھے۔ جو شخص کوئی بات قسم کھا کر کہتا تھا۔ خواہ وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ یقین فرما لیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی تکلیف کو کبھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔ اور دعا فرمایا کرتے تھے کہ خدا کرے کسی مسلمان کو کسی مسلمان کی طرف سے ایذا نہ پہنچے۔ سخاوت کی صفت بدرجہ اتم تھی۔ ایک بار آپ بارادہ حج بیت اللہ بغداد سے روانہ ہو کر بمقام "حلہ" جو بغداد کے قریب ہے پہنچے اور قیام کا آپ نے ارادہ فرمایا اور یہ حکم دیا کہ "ایسے غریب کا مکان برائے قیام دیکھا جائے جو اس بستی میں سب سے زیادہ غریب ہو" ہر چند کہ بستی کے امیروں اور بڑے لوگوں نے درخواستیں کیں لیکن وہ قبول نہ ہوئیں چنانچہ بعد دریافت ایک بڑھیا کے مکان کا پتہ چلا۔ آپ نے اس سے اجازت حاصل فرما کر وہاں قیام فرمایا۔ اس قیام کے دوران میں جتنی نذریں از قسم نقد و جنس وغیرہ آپ کو پیش کی گئیں وہ سب اس بڑھیا کو عطا فرما دی گئیں۔ یہ دیکھ کر ساتھ کے لوگوں نے بھی اپنے اپنے حقوق اسی بڑھیا کے حوالے کر دئیے۔ وہ بڑھیا جو غریب تر تھی امیر ترین گئی جس کے گھر فاقے ہوتے تھے اس کے گھر لنگر جاری ہو گئے۔ دستگیری ہو تو ایسی ہو جس سے دین و دنیا دونوں ہاتھ آئیں۔

کرامات اور مکتوبات حضرت غوث اعظم

"کرامات اولیاء حق" لیکن دنیا دار لوگ کرامات کے مفہوم میں سخت غلطی کرتے ہیں ان کی نظر میں ایسے اعمال کو ڈھونڈھتی ہیں جو طلسم کے مشابہ ہوں۔ اگر مٹی سونا نہ بن سکے تو پھر نہ کرامت ہے اور نہ ولایت۔ یہ نظریہ ایسا عام ہو چکا ہے جس میں اکثر افراد مبتلا ہیں اور پھر یہ شکایت ہے کہ صوفی و ولی نہیں ملتا ہے۔ فی الحقیقت ولایت کا یہ معیار ہی غلط ہے۔ کامل اتباع سنت و کتاب الٰہی ہے جس کا دوسرا نام مجاھدہ ہے۔ ولایت ہے۔ سنت و کتاب ہی محبت الٰہی کا سرچشمہ ہیں۔ "[1]اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کی زنجیر میں جکڑا ہوا انسان صحیح

---

[1] اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔

معنوں میں آزاد ہے۔ اور اسی قسم کی آزادی کا دوسرا نام قطبیت ہے۔

جاهدوا[1] فی الله حق جهاده

کی پوری پوری تعمیل نجات اخروی کے لئے ضمانت ہے۔ غرضکہ کرامت یا کرامات کا معیار صرف مجاھدہ ہے اور چونکہ مجاہدہ بغیر کامل اتباع سنت وکتاب الہٰی ممکن نہیں۔ لہٰذا کرامت کا انحصار کامل اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وکتاب الہٰی پر ہی ہے۔ حضرت شیخ بہاؤالدین ولد رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں مذکور ہے کہ ایک شخص بہ نیت بیعت حاضر ہوا۔ اور آپ کے ساتھ سفر میں ہم رکاب ہوا۔ سفر و حضر میں کامل چھ ماہ ساتھ رہا چھ ماہ کے بعد اس نے بلا حصول فیض بیعت واپسی کی اجازت چاہی اس پر ممدوح نے فرمایا کہ۔

"اجازت تو ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر تم نے اتنے عرصہ تک سفر کی تکالیف کیوں برداشت کیں اور بغیر بیعت کئے ہوئے کیوں واپس جا رہے ہو۔ عرض کیا کہ اگر معاف فرمایا جاؤں تو عرض کروں۔ فرمایا ضرور کہو۔ عرض کیا کہ بیعت کی نیت تو ضرور تھی۔ مگر شرط یہ تھی کہ جب تک کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوگی اس وقت تک مرید نہیں ہوں گا۔ چونکہ اس چھ ماہ کے عرصہ میں کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوئی اس لئے واپس جانا چاہتا ہوں۔ ممدوح نے جواب میں فرمایا کہ تعجب ہے کہ چھ ماہ مسلسل ساتھ رہنے کے باوجود تم نے کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ اغلباً تم کو یاد نہیں رہا۔ عرض کیا کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوئی۔ فرمایا کہ یہ بتا سکتے ہو کہ اس چھ ماہ کے عرصہ میں جب کہ تم ہر وقت میرے ساتھ رہے کبھی میں نے فرائض اور نوافل کا ترک کرنا تو علیحدہ چیز ہے۔ اُن میں تساہل بھی کیا۔ عرض کیا کہ قطعاً نہیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ اے غافل! ایک انسان اس سے بڑھ کر اور کسی کرامت کی توقع کرتا ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی فرماں برداری میں کسی

---

[1] اللہ کی تلاش میں پورا پورا مجاہدہ کرو۔

وقت تساہل اور کاہلی بھی نہیں کرتا ہے۔ یہ سُن کر وہ شخص نادم اور تائب ہوا اور بیعت سے فیضیاب ہوا"۔

ایک بار شیخ صدقہ رحمۃ اللہ علیہ بارگاہ غوثیہ میں حاضر تھے اور دوسرے مشائخ وقت بھی حاضر تھے۔ حضرت حسب معمول برآمد ہوکر ممبر پر تشریف فرما ہوئے لیکن نہ تو قاری نے کوئی آیت تلاوت کی اور نہ آپ نے کچھ کلام کیا۔ باوجود اس کے پوری مجلس حالت وجد میں ہو گئی۔ شیخ صدقہ نے دل میں خیال کیا کہ بات نہ چیت لیکن سب کے سب حالت وجد میں کیسے ہو گئے۔

"آپ نے فرمایا کہ میرا ایک مرید اسی وقت بیت المقدس سے آن کی آن میں یہاں پہونچ گیا ہے اور اس نے میرے ہاتھ پر توبہ کی ہے اس لئے تمام اہل مجلس اس کے مہمان ہیں اور اس کے شریک ہیں"۔

شیخ موصوف نے پھر دل میں خیال کیا کہ بیت المقدس سے یہاں آن واحد میں آنے سے توبہ کیسے لازم آگئی اور اس کو پھر شیخ کی ہی کیا ضرورت رہی۔

آپ نے فوراً موصوف سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا اے شخص توبہ ہی انسان کرتا ہے جو ہوا میں اُڑتا ہے تاکہ پھر وہ ایسا نہ کرے اور وہ اس کا محتاج ہے کہ میں اس کو اللہ کی محبت کا طریقہ بتاؤں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال کے فدائی اس اشارہ کو اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں کہ ہوا میں اڑنا نہ کرامت ہے اور نہ ولایت بلکہ اس کے برعکس چونکہ اتباع سنت و کتاب الٰہی کے خلاف ہے لہذا اس سے تائب ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ عشق الٰہی کا وہ راستہ نہیں ہے بلکہ جو راستہ کہ آج سے ۱۳ سو برس قبل بنا دیا گیا ہے وہ ہی منزل مقصود پر پہنچا سکتا ہے۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

آپ نے اپنے مریدین اور متوسلین کے لئے ایک نسخہ کیمیا ارشاد فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ

جو کوئی اس پر عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی حاجت بر لائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"کہ جو کوئی شخص دو رکعت نماز نفل اس طریقہ سے پڑھے کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اخلاص (یعنی قل ھو اللہ) گیارہ بار پڑھے اور سلام پھیر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لے اس کے بعد میرا نام لے اور پھر اللہ سے اپنی مراد مانگے۔ اللہ اس کی مراد پوری کرے گا۔ انشاء اللہ۔"

سبحان اللہ۔ بیک کرشمہ دو کار اسی کا نام ہے۔ عبادت بھی ہو گئی اور مراد بھی پوری ہو گئی۔

آپ کے مکتوبات عربی میں بھی مشہور ہیں اور فارسی میں بھی۔ بعض بزرگان دین نے ان مکتوبات کو اپنی تصانیف میں نقل فرمایا ہے۔ چونکہ آپ کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم "گیلان" میں ہوئی تھی اس لئے آپ کو فارسی زبان پر پورا پورا عبور تھا۔ اگرچہ بغداد کی مجالس وعظ میں بیشتر آپ عربی ہی میں وعظ فرمایا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی فارسی زبان میں بھی ارشاد فرما دیا کرتے تھے۔ اسی طرح سے مکتوبات بھی فارسی میں ہیں جو آیات قرآنی و احادیث نبوی سے مزین ہیں۔ فارسی اور عربی پر کامل عبور ہونے کی وجہ سے آپ کو لوگ ذوالللسانین و امام الفریقین بھی کہا کرتے تھے حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "اخبار الاخیار" میں (۱۴) فارسی مکتوبات نقل کئے ہیں جو ایک طرف ادبیت کے خزانے ہیں تو دوسری طرف پند و حکم اور محبت و عشق الٰہی کے ترانے ہیں جن سے وہی ہستیاں لطف اندوز اور فیضیاب ہو سکتی ہیں جو اس لطف کی عملاً متلاشی ہیں۔ پہلا مکتوب نور ہدایت۔ محبوب و محب کا تبادلہ محبت۔ رحمت کی مشیت۔ منزل مقصود اور دیدار الٰہی پر ایک مختصر مگر نہایت جامع وعظ ہے۔ دوسرا مکتوب تصفیہ قلب کا مکمل نسخہ ہے جس کو اگر تنبیہ الغافلین کہا جائے تو بجا ہے۔ جو بصارت کے لئے سرمہ اور بصیرت کے لئے صیقل ہے

اور جو معرفت کا دریا ہے۔ تیسرا مکتوب۔ ریاض و مجاہدہ کا ایک مجمل مگر جامع نظام الاوقات ہے۔ چوتھا مکتوب خواہشات انسانی کے لئے تریاق۔ غرور و نخوت کے لئے کوڑا ہے تاکہ انسان سراپا سہو نسیان کو یہ معلوم ہو جائے کہ"۔

"لا تدرکه الابصار وھو یدرک الابصار"

(آنکھیں اس کو نہیں پاتی ہیں مگر وہ آنکھوں کو پا لیتا ہے)

خاتمہ حضرت پیر دستگیر رضی اللہ تعالے عنہ کے مناقب و فضائل کے متعلق بزرگان دین کا قول ہے کہ وہ حد و شمار سے کہیں زیادہ ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ "قلم از تحریر و زبان از تقریر آں قاصر است"

جب ایسی متبرک ہستیاں اپنے عجز کا اظہار کریں جو دریائے معرفت میں غوطہ زن تھیں تو پھر ایک دنیا دار اور گنہگار کی کیا ہستی ہے کہ وہ ان فضائل کے عشر عشیر کے بیان کی جرأت بھی کر سکے۔ لیکن چونکہ ہر گنہگار بخشش کا خواہشمند اور ہر دنیا دار دین کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو وسیلہ کی ضرورت اور واسطہ کی حاجت ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس وسیلہ کے لئے ایسے طریق کی ضرورت ہے جس سے وسیلہ ہاتھ آجائے۔ اس لئے میں نے بزرگان دین کے اقوال کو اپنا طریقہ بنایا اور اس سے بارگاہ قطبیت کے لئے وسیلہ نکال کر دستگیری کی تمنا میں یہ چند سطور اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں لکھ کر حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک میں یہ استدعا بارگاہ قطبیت میں پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔

غوث اعظم دلیل راہ یقین — بہ یقین رہبر اکابر دیں

شیخ دارین ہادی ثقلین — زبدۂ آل سید کونین

اوست در جملہ اولیا ممتاز — چوں پیمبر در انبیا ممتاز

اولیا بندہ اش از دل و جاں — قدم او بگردن ایشاں

وصف تعریف او زمن نہ نکوست — خود کرامات او معرف اوست
من کہ پرور دۂ نوالِ ویم — عاجز از مدحتِ کمالِ ویم
در دو عالم با وست امیدم — ہست باوے امید جاویدم
رب ھب لی حکماً والحقنی بالصالحین — واجعل لی لسان صدق فی الاخرین

خاکپائے بندگان بارگاہ قطبیت عظمیٰ

محمد ابرار حسین عمری نقشبندی قادری

۹۔ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ ہجری یوم چارشنبہ ۔ بہمنی

۳۔ امرداد ۱۳۴۸ف

محمد حبیب الدین ٹائپسٹ

تاریخِ ہند کا ایک ورق

از

بھاسکر راؤ۔ ڈی۔ دیشپانڈے متعلم سال دوم کالج اورنگ آباد

نوٹ: مضمون شروع کرنے سے قبل میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کتابوں کا حوالہ دوں جن سے مضمون کی تیاری میں مدد لی گئی ہے۔

(۱) اخبار شاہان افغان۔

(۲) خزائن الفتوح۔

(۳) فرشتہ مقالہ دوم

(۴) تصانیف ضیاء الدین برنی۔

جب ملک آحمد چپ کو جو ایک ہزار فوج لے کر ہ پہونچ چکا تھا جلال الدین کے قتل اور علاء الدین کے اعلان کی خبر ملی تو اُلٹے پاؤں دہلی واپس لوٹا اور جلال الدین کی بیوی ملکہ جہاں کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ اس نے انتہائی کوتاہ نظری اور ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر بڑے بیٹے اور ولیعہد سلطنت ارکلی خاں کے بجائے جس نے اپنے باپ کے ساتھ زبردست معرکوں میں حصہ لیا تھا اور حکمرانی کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ اپنے کمسن اور ناتجربہ کار بیٹے شہزادہ قادر خاں کو رکن الدین ابراہیم شاہ کے خطاب سے تخت نشین کرادیا۔ اور خود انتظامات شروع کئے۔ کیلوگری سے دہلی آکر کوشک میں قیام کیا۔ یہاں امراء کو جاگیریں دی گئیں۔ اور عہدوں پر سرفراز کیا گیا تاکہ علاء الدین کی مخالفت کرنے میں سلطنت کی حمایت میں ایک طاقت و رجماعت پیدا کردی جائے۔

ارکلی خاں جو اس وقت ملتان میں تھا ملکہ نے مطلق توجہ نہ کی اس قدر عجلت سے

کام کرنے میں شاید ملکہ کا یہ مقصد ہو کہ ارکلی خاں کے ملتان سے آنے تک تخت خالی نہ رہے اور امرا ء علاؤالدین سے نہ مل جائیں۔ غرض جب ارکلی خاں کو سلطان کے قتل کی خبر ملی تو موقع کو غنیمت دیکھ کر اور حالات کی نزاکت کا اندازہ کرکے وہ ملتان ہی میں ٹھیرا رہا۔ مگر جب سلطنت کی حالت نہایت نازک ہوگئی تو ملکہ نے ارکلی خاں کو دہلی آنے کے لئے لکھا اور ساتھ ہی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ جواباً ارکلی خاں نے لکھا کہ "اب جبکہ سب درباری اور امرا دشمن سے مل چکے ہیں میرے آنے سے کیا حاصل"۔

دوسری جانب علاؤالدین ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے بے شمار انعام واکرام دے رہا تھا۔ کڑھ میں بے حساب سونا چاندی تقسیم ہوا اور اس فیاضی کا یہ نتیجہ ہوا کہ امرا اور عوام علاءالدین کے ساتھ ہوگئے۔ علاءالدین نے دہلی کا رخ کرنا چاہا لیکن حالت کو مساعد نہ پاکر (کیونکہ برسات کا موسم تھا اور فوج بھی خاطر خواہ منظم نہ تھی) اپنا ارادہ بدل دیا اور دہلی کے بجائے لکھنوتی کا رُخ کیا تاکہ فوج کو ترتیب دے کر مرکزی حکومت کا اچھی طرح مقابلہ کیا جاسکے۔

اسی عرصہ میں اسے ارکلی خاں اور ملکہ جہاں میں پھوٹ پڑنے کی خبر ملی، اب مخالفین کی غیر معمولی قوت کا خدشہ جاتا رہا۔ بنگال جانے کا ارادہ منسوخ ہوا اور فروری ۱۲۹۵ء میں کڑھ مانک پور سے دہلی پر قبضہ کرنے کی خاطر نکلا۔ مرکزی حکومت ارکلی خاں کی غیر موجودگی کے باعث کمزور تھی۔

خود کو ہر دل عزیز بنانے کے لئے اور جلال الدین کے قتل کی طرف سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے علاءالدین نے راستہ میں زر و جواہر بکھیرنے شروع کئے۔ چوطرف سے سپاہی دولت کے لالچ میں اس طرف آنے لگے۔ راستہ میں مقتول سلطان کے امرا اور درباری علاءالدین سے ملنے لگے پھر بھی ملک امیر علی دیوانہ۔ ملک رجا جی جلالی، ملک عثمان، ملک تاج الدین، اور ملک ہرن مار، جلالی فوج لے کر دہلی سے نکلے۔ لیکن یہ بھی علاءالدین

کے حسن انتظام سے مرعوب ہوکر اسی سے مل گئے۔ بدایوں پہونچنے تک علاءالدین کی فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہونچ گئی۔ علاءالدین ابھی دہلی میں داخل نہ ہونے پایا تھا کہ رکن الدین خود فوج لے کر شہر کے باہر آیا اور مقابل میں خیمہ زن ہوا۔

فوجیں مقابل ہوئیں اور طبل جنگ بجا لیکن جنگ یک طرفہ تھی۔ علاءالدین کو آسانی سے کامیابی ہوگئی اور فتح مند افواج بدایوں دروازہ سے شہر میں داخل ہوئیں۔ رکن الدین دوسرے دروازے سے مال اور حرم ساتھ لے کر ملتان کو فرار ہوگیا۔ ملک جب ملک احمد چپ، قطب الدین علوی، اور امیر جلال نے مع خاندان کے ان کا ساتھ دیا۔ علاءالدین نے کوشک لال میں قیام کیا جہاں شہر کے عمائدین، قضاۃ اور علماء نے حاضر ہوکر سر اطاعت خم کیا۔ دوسرے روز علاءالدین کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور دارالضرب میں اس کے نام کا سکہ ڈھلنے لگا۔

۲۲۔ ذی الحجہ ۶۹۵ھ ہجری مطابق ۱۲۹۶ء کو تخت نشینی کی رسم نہایت دھوم دھام وتزک واحتشام کے ساتھ ادا ہوئی۔ شہر میں خوشی کے شادیانہ بجنے لگے خود سلطان نے وسیع سلطنت کے حصول کی خوشی میں خوب عیش کیا۔ اس فیاضی اور دریا دلی نے لوگوں کے دلوں سے جلال الدین کے قتل کا سانحہ بھلا دیا اور لوگ بادشاہ کا کلمہ پڑھنے لگے۔

اب علاءالدین نے مملکت کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ دربار عام منعقد کرکے عہدہ داروں کے تقررات کئے اور انھیں پرگنات اور خطابات سے سرفراز کیا۔ سلطان نے اپنے بھائی الماس بیگ کو الغ خاں اور ملک کو ظفر خاں کا خطاب دیا۔ یہ دونوں علاءالدین کے مشیروں میں سے تھے۔ سلطان کو ان پر بہت بھروسہ تھا۔

علاءالدین انتہائی مردم شناس اور جوہر پرست آدمی تھا اس نے نئے اور قابل لوگوں کا تقرر کیا اور مملکت کی تنظیم نئے سرے سے کی فوج میں تنخواہ کے علاوہ انعامات تقسیم کئے۔

مملکت کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر علاؤالدین نے پہلے شاہی خاندان کی طرف توجہ کی جو ملتان میں پناہ گزیں تھا اور اس سے کسی طرح نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ ورنہ سلطنت کو آئندہ اس کی طرف سے ڈر لگا ہوا تھا۔ لہٰذا شاہی خاندان کی گرفتاری کے لئے الغ خاں اور ظفر خاں کو چالیس ہزار فوج دے کر ملتان روانہ کیا۔ جب وہاں فوج پہونچی تو کوتوال اور باشندگان شہر فوج سے آملے۔ رکن الدین اور ارکلی خاں شہر میں محصور ہو گئے بیکس شہزادوں نے شیخ الاسلام کے ذریعہ امان چاہی۔ الغ خاں نے شیخ کی تعظیم کی اور انھیں اطمینان دلا کر جلال الدین کے خاندان والوں کو گرفتار کیا اور کامیابی کی اطلاع بادشاہ کو دی۔ اس کامیابی کی خوب خوشیاں منائی گئیں۔ خود بادشاہ کے دل سے کھٹکا دور ہوا۔ اگر یہ دعویدار باقی رہتے تو بغاوت کا ہمیشہ احتمال رہتا۔ جملہ قیدی دہلی لائے جا رہے تھے کہ شاہی فرمان پہونچا جس کے بموجب دونوں شہزادے ہانسی کے قلعہ میں قید کئے گئے۔ ملکہ جہاں کو حرم میں نظر بند کیا گیا۔ اور ملک احمد چپ کو دہلی لا کر شاہی محل میں قید کیا گیا۔ دونوں شہزادوں کی بعد میں آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ دوسرے شہزادے قتل کئے گئے۔ جو لوگ سلطان جلال الدین کے خاندان کے بہی خواہ تھے وہ بھی علاء الدین کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے اگرچہ شاہی خاندان کے ساتھ نہایت سختی کا سلوک کیا گیا لیکن یہ ہر بادشاہ کے لئے ضروری اور لابدی ہے کہ رستہ کی رکاوٹوں کو دور کر دے۔ اگر علاؤالدین نے ایسا کیا تو اس کا یہ فعل کسی طرح قابل سرزنش نہیں۔ اس تمام سختی کے ساتھ جن لوگوں نے شاہی خاندان کے ساتھ حقیقی وفاداری کا ثبوت دیا تھا اور ان کی نیت میں کسی طرح کا میل نہ تھا ان کو اس نے انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ ملک قطب نصیرالدین وغیرہ اپنی وفاداری اور نمک حلالی کے صلہ میں بادشاہ کے منظور نظر بنے۔ بہت سے امرا نے دولت کے لالچ میں علاؤالدین کا ساتھ دیا تھا۔ علاؤالدین نے ان کی بری طرح خبر لی اور نہایت سختی سے پیش آیا۔

علاؤ الدین سے پہلے حکومت عام طور پر ترک شاہی تھی۔ قوت سب امرا کے ہاتھوں میں تھی جلال الدین اپنے رحم و کرم کے باعث پیچیدگیوں پر پوری طرح قابض نہ ہو سکا تھا لیکن علاؤ الدین نے اس پریشانی کو رفع کیا اور ملک میں امن و امان قائم ہوا۔ کاروبار کو فروغ ہوا۔ ملک میں علمی چرچے ہونے لگے۔ دور دراز سے علما دہلی آئے۔ علاؤ الدین خود نہ کوئی عالم تھا اور نہ علم نواز۔ اس کی ساری کوشش سلطنت کا ڈھانچہ تیار کرنے میں صرف ہوئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں لیکن تحفظ نہ نقطہ نگاہ سے۔ وہ دور اندیش اور مستقل مزاج فرمانروا تھا اور ملک اور حکومت کی ضروریات کو خوب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کا زاویہ نگاہ ہمیشہ تحفظ ملک رہا۔ سخت گیر وہ ضرور تھا۔ اور اس کے زمانہ کی بغاوتیں اس کی سخت گیری کا نتیجہ تھیں۔ ضدی اس وجہ سے تھا کہ وہ خود ایک غاصب فرمانروا تھا اور اس لئے اسے اپنے امرا پر مطلق بھروسہ نہ تھا۔ علاؤ الدین نے سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر اصلاحات ملک اور قوانین کی از سر نو اصلاح کی۔

مرکزی حکومت کو ابتدائی حالت سے انتہائی عروج پر پہونچایا جس کی مثال تاریخ ہند میں ملنی مشکل ہے۔

خانصاحب عبد اللطیف نے لطیفی پریس دہلی میں طبع کیا اور مدیر رسالہ نورس نے
عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج، اورنگ آباد سے شائع کیا